مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

— سورة الفاتحة —

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ 25بی گلبرگ 2 لاہور

نام کتاب	....	مطالب القرآن فی دروس الفرقان
دروس	....	از: جناب غلام احمد پرویز ؒ
ناشر	....	بزمِ طلوع اسلام، لاہور
زیر اہتمام	....	ادارہ طلوع اسلام 25بی2 گلبرگ، لاہور
	....	فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول	....	جنوری 2007ء
مطبع	....	باقر پرنٹنگ پریس، لاہور

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفیکیٹ تصحیح

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل وحریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی وعنبر فشانی کی وہ لالہ ویاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی وسماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ وتابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن وزیبائی جن کی حقیقی آب وتاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال وجمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب وتاب سے موزوں ہوگئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینیؐ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق ' دل بند و راہ مصطفےؐ رو

[معراجِ انسانیت ص ۷۴ از۔علامہ پرویز ؒ]

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ♏ کے کسی ارشاد یا حضور ♏ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ♏ کے ارشادات واعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ♏ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست
رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے' وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور جہاں کہیں سہو و خطا دکھائی دے' وہ میرے ذہن کی نارسائی۔ (پرویز۔۔معراجِ انسانیت)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ تمنا

آج نوعِ انسانی کا جمِ غفیر معاشرتی، سیاسی اور تمدنی طور پر اپنے اپنے خودساختہ نظریات وتصورات کے فریبِ نفس میں مکمل طور پر اسیر ہونے کے باعث باہمدگر جس قدر غسلِ خوں میں مصروفِ کار ہے اس کے پیشِ نظر اگر اس دور کو تاریخ کا بدترین دور متصور کیا جائے تو یہ بے جا نہ ہوگا۔ لہٰذا دورِ حاضر کی اِس ناگفتہ بہ اور خون آلود بدنما تصویر کے اِن بدنما داغوں کو مٹانے کی خاطر نوعِ انسانی کے لیے یہ امر اشد ضروری ہی نہیں بلکہ لازم ہے کہ ربِ العٰلمین نے ذکر للعالمین کی شکل میں انسانوں کی اس عالم گیر برادری کے لیے جو لاریب، بین، واضح، مکمل اور محفوظ ضابطۂ حیات عطا کیا ہے وہ اس نسخۂ کیمیا کو ایک بار پھر آزمالے۔ کیونکہ اِس نسخۂ کیمیا کا ہمیشہ سے یہ دعویٰ رہا ہے کہ اس نے انسان کی تمام نفسیاتی بیماریوں کا شافی علاج اپنے اندر محفوظ کر رکھا ہے۔ چنانچہ اسی بناء پر اس کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ یہ وہ نسخہ کیمیا ہے کہ جو انسانی عقل کو کسی شکل میں بھی راہِ اعتدال سے نہیں ہٹنے دیتا بلکہ اس کا ایک ایک لفظ فہم وفراست اور دلیل وبرہان کے چراغ روشن کرتے ہوئے صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور اس طرح زندگی کے الجھے ہوئے گیسوؤں کو سنوارتا چلا جاتا ہے، اور اس گم کردہ راہی کو کبھی مایوس ہونے ہی نہیں دیتا۔ اس سراجِ منیر کا یہی وہ محکم سہارا ہے کہ جس کی بناء پر کہا گیا ہے کہ

رات کے ماتھے پہ افسردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے

برادرانِ عزیز! بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کا یہی وہ جذبِ دروں تھا کہ جس کی بناء پر اُس نے اس فکرِ قرآنی کو عام کرنے کی غرض سے محترم پرویز صاحب علیہ الرحمۃ کے آڈیو ویڈیو پر دیے گئے سات سو کے قریب دروسِ قرآن کو سی ڈیز سے قرطاس پر منتقل کرنے کے بعد اُنہیں کتابی شکل میں پیش کرنے کا پروگرام تشکیل دیا۔ جس کے تحت ربِ کریم کی مہربانی سے زیرِ نظر سورۃ فاتحہ کے علاوہ مذکورہ دروس میں سے اس وقت تک سورۃ نحل، سورۃ بنی اسرائیل، سورۃ کہف ومریم، سورۃ طٰہٰ، سورۃ حج، سورۃ انبیاء، پارہ 29 واں اور پارہ 30 واں مکمل شکل میں قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا چکا ہے۔ جبکہ اس طویل سفر کو مکمل کرنے کی غرض سے بزمِ لاہور آج بھی پوری طرح سرگرمِ عمل ہے اور خیال ہے کہ سورۃ فاتحہ سے والناس تک کا یہ طویل سفر تقریباً چالیس جلدوں میں مکمل ہو سکے گا۔

سورۃ فاتحہ چونکہ قرآنِ حکیم کا دیباچہ ہے شاید اس کی بنیاد پر ہی علامہ اقبال نے کہا تھا کہ انسان کی موجودہ زندگی آنے والی زندگی کا دیباچہ ہے۔

اس سورۃ میں رب العزت نے اپنی بنیادی صفات ربوبیت عالمینی' رحمانیت' رحیمیت' اور مالکیت کو کچھ اس طرح ترتیب اور جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جس سے انسان حدودِ بشریت کے اندر رہتے ہوئے' اس کے کائناتی کنٹرول کی ہیئت اور اس کی افادیت کے سمندر سے کچھ قطروں ہی سے اپنی تشنگی بجھا سکتا ہے۔ جبکہ وقت کے ساتھ ساتھ مختلف اشیائے کائنات کی نشوونما کے پوشیدہ راز بتدریج اُس کے سامنے کھلتے چلے جائیں گے۔ البتہ جہاں تک حیاتِ انسانی کا تعلق ہے تو اس کے متعلق خالقِ کائنات نے حضرت انسان کو اس کی موجودہ زندگی کے مقصدِ عظیم سے بڑی وضاحت اور بلیغ انداز میں آگاہ کر دیا ہے۔ بقول شاعر

تیری جلوہ گاہِ جمال میں میرا ذوقِ دید نکھر گیا
تیری ضوفشانئ حسن نے میری حیرتوں کو سجا دیا

سورۃ فاتحہ کی یہی وہ بنیادی خصوصیت ہے کہ جس کے پیشِ نظر محترم پرویز صاحبؒ نے اس کے ایک ایک لفظ کی تشریح کے لیے ایک ایک درس مختص کیا جس کی افادیت کا اندازہ قارئین کو ان دروس کے مطالعہ سے ہی ہو سکے گا۔

برادرانِ عزیز! اس موقع پر یہ چیز بغیر کسی تامل کے علی وجہ البصیرت کہی جا سکتی ہے کہ محترم پرویز صاحبؒ کی طرف سے قرآنِ حکیم کی یہ تفسیر جو قرآنِ حکیم ہی کے آئینے میں پیش کی گئی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے اور ہمیں یقینِ محکم ہے کہ موصوف کی عمر بھر کی دیدہ ریزی اور جگر کاری کا یہ سرمایۂ حیات نوجوان نسل کے علاوہ ہر صاحبِ علم وفکر کے لیے ایک انمول خزینہ ثابت ہوگا اور اس کے مطالعہ کے بعد آخرکار انسان بے ساختہ پکار اٹھے گا کہ قندیلِ آسمانی کا یہ نسخۂ کیمیا اس قدر واضح' لاریب' آسان اور ہر قسم کے تضادات سے پاک اپنے اندر ایک ایسا ملکہ لیے ہوئے ہے کہ جو دوٹوک الفاظ میں آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کی طرح روشن اور مستقل طور پر نوعِ انسانی کے لیے تاحیات راہنمائی کا سہارا بنا رہے گا۔

ہر قدم پر بھٹکتی رہی زندگی
ہر قدم پر وہ آواز دیتے رہے

یہی وہ حقیقتِ ثابتہ ہے کہ جس کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''کہ اے نوعِ انسانی! تم اس ضابطہ حیات کے بلامزد ومعاوضہ مل جانے پر خوشیاں مناؤ کیونکہ یہ وہ ضابطہ حیات ہے کہ جو کچھ انسان اکٹھا کرتا ہے یہ اُس سے کہیں زیادہ قیمتی متاع ہے''۔

خدا کرے اس کرۂ ارض پر بکھری ہوئی ملتِ اسلامیہ جو اس وقت افسردہ و پژمردہ حالت میں سرگرداں ہے وہ ایک بار پھر امتِ واحدہ کے پرنور نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے قابل ہو جائے۔ عزیزانِ من! آبِ حیات کی یہی وہ شرابِ طہور ہے کہ جس کے ساغر سے مانوس ہو کر انسان اُس حسن وجمال کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا جسے انسانی آنکھ کے لیے قدرت نے اپنے ہاں مستور کر رکھا ہے۔ اور پھر واقعاتی طور پر یہ باور کر لے گا کہ قرآنِ حکیم کا یہ قول یقینی طور پر حتمی ہے کہ تنہا عقلِ انسانی امامت کی سزاوار نہیں

ہوسکتی ۔ یہی وہ حتمی اعتراف ہے کہ جس کی بناء پر یہ عالمگیر برادری مصائب و آلام کی موجودہ چیخ و پکار سے آزادی حاصل کرتے ہوئے فکرِقرآنی کے مضراب سے نکلنے والی دھیمی دھیمی اور دلوں کوموہ لینے والے اُن مسحور کن نغموں کی پرکیف آوازوں سے لطف اندوز ہوسکے گی۔عزیزانِ من! انسانی زندگی کا یہی وہ حسین منظر ہے کہ جس کو دیکھنے کے لیے آسمانِ عالم اس انتظار میں ہے کہ یہ بھٹکا ہوا راہی اس قندیلِ رحمانی کی روشنی میں اپناسفرِ زندگی کب شروع کرتا ہے۔

عزیزانِ من! انسانی زندگی کے سلسلہ میں خواہ یہاں کی زندگی کے لمحات ہوں یا جہانِ فردا کا دورِحیات' ربِ کریم تو ہردور میں انسان کے لیے رب بھی ہے' الرحمٰن بھی' الرحیم بھی' اور مالک یوم الدین بھی۔لہٰذا اس بناء پر خالقِ کائنات' کائنات کا مالک ہونے کے ناطے اس میں ہرآن اضافہ کرتا رہتا ہے۔یہ وہ صفاتِ ربِ کریم ہیں کہ جن کی ترجمانی کرتے ہوئے غالب نے کہا تھا:

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائمِ نقاب میں

برادرانِ عزیز! آخر پر ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

محمد اشرف ظفر
نمائندہ بزم طلوعِ اسلام لاہور
اکتوبر 2003

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اظہارِتشکر

آج ہماری جبین نیاز خالق کائنات کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہے کہ جس کی بے پناہ کرم نوازیوں سے سورۃ نحل' سورۃ بنی اسرائیل' سورۃ کہف ومریم' سورۃ طہٰ' سورۃ حج' سورۃ انبیاء' پارہ 29 واں اور پارہ 30 واں مکمل کے بعد سورۃ فاتحہ کی یہ معرکۃ الآراء تفسیر قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔اس سلسلہ میں مَیں بزم طلوع اسلام کے ایک ایک فرد کے علاوہ ادارہ طلوعِ اسلام کے سابق چیئرمین جناب ایاز حسین انصاری جن کے تعاون سے اس عظیم پروجیکٹ کا آغاز سورۃ نحل سے ہوا اور اس کے بعد جناب چیئرمین محمد شریف لون صاحب کا بھرپور تعاون اور حوصلہ افزائی ہمارے لیے مدومعاون رہی۔نیز تحریک طلوعِ اسلام کی قابل صد احترام اور علمی شخصیت جناب ڈاکٹر منظور الحق صاحب کی خدمات کے ہم تہ دل سے شکرگزار ہیں کہ جنہوں نے اپنی شب وروز انتھک کاوشوں سے ان دروس کی تدوین کے دوران محترم پرویز صاحب کے اندازِ گفتگو کو قائم ودائم رکھتے ہوئے ان دروس کو اشاعت کے آخری مراحل تک لے جانے میں کامران ہوئے۔ہم اس موقعہ پر قرآنِ حکیم کے معروف محقق جناب محمد علی فارق صاحب کے بھی شکرگزار ہیں کہ جو پرویز صاحب کی وفات کے بعد سے ہی طلوع اسلام کے متعلقین کی توجہ قرآنی دروس کو کتابی شکل میں لانے کے لیے مبذول کراتے رہے تاکہ قرآنِ حکیم پر تدبر وتفکر اور تحقیق وتدقیق کرنے والوں کو ایسا جامع اور مربوط تفسیری مواد یکجا میسر آجائے کہ جس کی مثال شاید ہی کہیں کسی دوسری جگہ موجود ہو۔جناب فارق صاحب نے شروع سے اس وقت تک مذکورہ دروس کے سلسلہ میں جو علمی' ادبی' اور تحقیقی خدمات سرانجام دی ہیں وہ ہمارے لیے یقیناً قابل صد تحسین ہیں۔

علاوہ ازیں جناب چوہدری پرویز بشیر صاحب اور جناب حامد میاں صاحب کی ہمہ جہت خدمات کا اعتراف نہ کرنا یقیناً احسان فراموشی ہوگی۔جہاں تک دروسِ ہٰذا کی کمپوزنگ کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں ہم محترم محمد ہارون ریاض صاحب' محترم رشید احمد صدیقی صاحب اور محترم رضاءاللہ ساجد صاحب کی انتھک محنتوں کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جن کی معاونت سے یہ دشوار گزار مراحل طے کیے جارہے ہیں۔ والسلام

محمد اشرف ظفر
نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام لاہور
جنوری 2007ء

ایک ضروری گذارش

(ا) عزیزانِ من! جیسا کہ اس سے پیشتر یہ تحریر کیا جاچکا ہے کہ محترم پرویز صاحبؒ کی طرف سے دیے گئے سات سو کے قریب دروسِ قرآن کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے کا یہ طویل سفر اکتوبر 2003ء میں سورۃ نحل سے شروع کیا گیا تھا اور سورۃ نحل کے تعارف میں علاوہ دیگر امور کے یہ بھی تحریر کیا گیا تھا کہ علامہ اقبالؒ نے محترم پرویز صاحبؒ کو تصریف الآیات کے سلسلہ میں کیا راہنمائی دی اور علامہ اسلم جیراجپوریؒ نے مروجہ تفاسیر میں پائے جانے والے بنیادی نقائص کے متعلق کیا کچھ کہا۔ مزید یہ کہ پرویز صاحبؒ کو اپنے اس طویل سفر کے دوران ان بیان کردہ مشکلات کے تدارک کے سلسلہ میں کن کن مراحل سے گزرنا پڑا۔ نیز قرآن فہمی کے سلسلہ میں بنیادی وجوہات کی نشاندہی اور ان کی الجھنوں کا علاج' دورِ حاضر کے مسائل سے کما حقہ واقفیت کا حصول اور یہ کہ تفسیرِ قرآن کسی ایک فرد کا کام نہیں جیسے قابل فہم موضوعات کو زیر بحث لایا گیا تھا۔

لہٰذا ان حقائق کی اہمیت کے پیش نظر یہ ضروری خیال کیا گیا ہے کہ سورۃ نحل میں کیے جانے والے مذکورہ تعارف کو بھی سورہ فاتحہ کے دروس سے پہلے شامل کردیا جائے۔

(ب) جولائی 1961ء میں محترم پرویز صاحب کی طرف سے پیش کردہ مفہوم القرآن کے تعارفی باب میں جو کچھ تحریر کیا گیا تھا وہ قرآن فہمی کے سلسلہ میں ہماری تاریخ کا ایک اہم ترین حصہ ہے۔ اس تعارف میں آپ نے مختلف عنوانات کے تحت اہم موضوعات کو اس جامعیت کے ساتھ بیان کیا تھا کہ اس کی افادیت سے انکار کرنا مشکل ہے۔ مثلاً ...... قرآن فہمی کی اہمیت' ...... نوجوان نسل کی مشکلات' ...... روایات کی رو سے تفسیر کی نوعیت' ...... امام ابن قتیبہ کی رائے' ...... لغات القرآن کی منفرد اور عالمانہ حیثیت' ...... قرآنی اصطلاحات' ...... زکوٰۃ' ...... صلوٰۃ کا قرآنی مفہوم' ...... مذہب اور دین میں فرق' ...... متشابہات کی حقیقت' ...... انسانیت کے نئے مسائل اور مروجہ مسالک میں اختلافات' ...... حروفِ مقطعات کے متعلق مختلف اربابِ تحقیق کی آراء۔

یہ ہیں وہ موضوعات جن کو محترم پرویز صاحب نے مفہوم القرآن کے تعارف میں بالتفصیل پیش کیا ہے۔ لہٰذا ان تصریحات سے استفادہ کرنے کی خاطر مفہوم القرآن کے تعارفی باب کو بھی سورہ فاتحہ میں شامل کیا جا رہا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ان بیان کردہ تصریحات کو بنظر غور دیکھ لیا جائے تو پھر قرآن حکیم کو سمجھنے کے سلسلہ میں یہ کہنے کی ضرورت شاید پیش نہ آئے کہ

بڑا غبار بڑی دھول سی ہے راہوں میں
کوئی چراغ جلا دے میری نگاہوں میں

قرآن کی فریاد

طاقوں میں سجایا جاتا ہوں ، آنکھوں سے لگایا جاتا ہوں
تعویذ بنایا جاتا ہوں ، دھو دھو کے پلایا جاتا ہوں
جُزدان حریر و ریشم کے ، اور پھول ستارے چاندی کے
پھر عطر کی بارش ہوتی ہے ، خوشبو میں بسایا جاتا ہوں
جیسے کسی طوطے مینا کو ، کچھ بول سکھائے جاتے ہیں
اس طرح پڑھایا جاتا ہوں ، اس طرح سکھایا جاتا ہوں
جب قول و قسم لینے کے لیے ، تکرار کی نوبت آتی ہے
پھر میری ضرورت پڑتی ہے ، ہاتھوں میں اٹھایا جاتا ہوں
دل نور سے خالی رہتے ہیں ، آنکھیں ہیں کہ نم ہوتی ہی نہیں
کہنے کو اک اک مجلس میں ، پڑھ پڑھ کے سنایا جاتا ہوں
یہ مجھ سے محبت کے دعوے ، قانون پہ راضی غیروں کے
یوں بھی مجھے رسوا کرتے ہیں ، ایسے بھی ستایا جاتا ہوں
کس بزم میں میرا ذکر نہیں ، کس عرس میں میری دھوم نہیں
پھر بھی میں اکیلا رہتا ہوں ، مجھ سا بھی کوئی مظلوم نہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف (ا)

قرآن فہمی کے سلسلہ میں محترم پرویزؒ صاحب کی منفرد تصانیف بالعموم اوران کے دروسِ قرآن بالخصوص قرآن کوخود قرآن ہی سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش ہے۔قرآنِ پاک نور ہےاور نور کو دیکھنے کے لیے کوئی چراغ لے کرنہیں نکلتا۔چنانچہ اُنہی کے بقول علامہ اقبالؒ نے ایک ملاقات میں اُن سے کہا تھا کہ قرآن پاک کو سمجھنے کے لیے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے: ...... عربی زبان سے واقفیت۔ قرآنِ پاک خود گواہ ہے کہ وہ عربیٍ مبین میں نازل ہوا۔اس لیے محاورۂ عرب کا جاننا ضروری ہے یعنی وہ معنی جو نزولِ قرآن کے وقت مخاطبین سمجھتے تھے؛ ...... معاصر علوم سے کماحقہ واقفیت؛ ...... تصریفِ آیات۔قرآن کوئی نصابی کتاب نہیں کہ کوئی ایک موضوع ایک ہی جگہ پر مکمل اور مفصل بیان ہوگیا ہو۔اس لیے ایک موضوع کے متعلق جو جو احکام، جو جو تفاصیل، مختلف مقامات پہ آئی ہیں، انہیں یکجا کیا جائے تو بات مکمل ہوجاتی ہےاور اس کتابِ عظیم کو سمجھنے کے لیے خارج از قرآن کسی چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔نہ ہی کوئی تشنگی باقی رہتی ہے۔ چونکہ یہ کتاب درسوں کا مجموعہ ہےاس لیےان میں انداز گفتگو کا سا ہے۔ پہلے سے سوچے سمجھے مضمون یا Essay کا نہیں۔ممکن ہےان میں بعض مقامات پر آپ کو تکرار (Repetition) نظر آئے مگر بات واضح کرنے کے لیے کبھی ایسا بھی ضروری ہوتا ہے۔

دروس کی اہمیت کے سلسلہ میں محترم پرویزؒ صاحب کی ایک ضروری وضاحت

''قرآن نے اپنے ہر مقام کی تشریح، صراحت، وضاحت، اورتفسیر تصریفِ آیات کے ذریعہ سے خود کردی ہے، وہ مختلف مقامات میں ایک ہی موضوع کو بار بار لاتا ہے، اس کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرتا ہے۔سطح بیں سمجھتے ہیں کہ اس میں تکرار ہےاور یہ ایک ہی بات ہے جو یہاں بھی کہی ہےاور وہاں بھی کہی ہے۔انہیں معلوم نہیں کہ اصل کیا ہے۔سطح سے نیچے جایئے تو یہ تکرار نہیں ہے، یہ تو ایک ایک بات کی وضاحت ہورہی ہوتی ہے ذرا ذرا سا یہ فرق، جہاں جہاں اس نے بیان کیا ہے، اس کو سامنے لے آیئے، ہر آیت کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے۔اور یہ چیز میں عرض کردوں کہ میں محض عقیدتاً نہیں کہہ رہا۔اب تو میری زندگی کا ذاتی تجربہ یہ ہےاور اسی بناء پہ میں نے یہ ساری کتابیں لکھی ہیں، لغات القرآن دیکھیے، مفہوم القرآن دیکھیے، دوسری کتابیں بھی جس میں میں نے قرآنِ کریم کا یہ کچھ لکھا ہے وہ بھی دیکھیے یہ جو آپ داستانیں سن رہے ہیں، اس کا انداز یہ ہے،اس سے بات سمجھ میں آتی ہے، واضح ہوتی ہے۔یہ آپ کے ہاں جو عربی زبان کے نیچے اردو کے اندر لفظ لکھتے چلے جانا ہے، اس سے قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا بلکہ اس سے آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس قدر غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔یہ جتنے اعتراضات عام طور پہ قرآنِ کریم کے اوپر کیے جاتے ہیں وہ انہی تراجم کی وجہ سے ہوتے ہیں۔'' (بحوالہ درسِ قرآنِ حکیم سورۃ بنی اسرائیل 6جولائی 1975ء)

برادران عزیز! جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ خدائے علیم وخبیر نے قرآنِ حکیم جیسے ضابطہءِ حیات کے ایک ایک لفظ پر غور وفکر کی بار بار تاکید کی ہے چنانچہ یہی وہ نکتۂ ماسکہ ہے کہ جس کے پیشِ نظر محترم پرویز صاحبؒ نے زندگی بھر دیئے گئے دروس کو' مفہوم کی شکل میں بیان نہیں کیا بلکہ اس قندیلِ آسمانی کے ایک ایک لفظ کو تدریسی نکتۂ نظر سے سبقاً سبقاً' ایک کلاس کے انداز میں پیش کیا ہے۔جس کے باعث اکثر اوقات اس کتابِ زندگی کی ایک ایک آیت ہی نہیں بلکہ اس کے ایک ایک لفظ کی تشریح' پورے کے پورے درس کو محیط کیے ہوئے ہے۔دروس کے دوران پنجابی زبان کے سلسلہ میں پرویز صاحبؒ کا ارشاد یہ ہے کہ "آپ پھر کہیں گے کہ یہ پنجابی کو ضرور لے آتا ہے۔ کیا کیا جائے؟ یہ لانی ہی پڑتی ہے۔اس زبان میں عجیب بات ہے۔وہ بات نہیں بنتی جیسے پنجابی میں بنتی ہے۔(بحوالہ درس قرآن حکیم سورۃ بنی اسرائیل مورخہ 17 اگست 1975ء) اس پیش کی جانے والی تفسیر کی یہی وہ خصوصیت ہے کہ جس کے تحت قرآنِ حکیم کے کسی مقام کو بھی قرآن کے آئینہ میں سمجھے اور سمجھانے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی۔

جہاں تک درس کے سننے کا تعلق ہے تو اس کے دوران انسان کی توجہ اکثر بھٹکتی رہتی ہے لیکن مطالعہ کے وقت یہ چیز پیدا نہیں ہوتی۔ اور تصریفِ آیات کی روشنی میں اس طرح کا تفصیلی مطالعہ' ذہن میں گھر بنالیتا ہے چنانچہ ان دروس کو اس شکل میں پیش کرنے کی اہمیت' افادیت اور قدر وقیمت کا اندازہ محترم پرویزؒ صاحب کے بیان کردہ ان تاکیدی الفاظ سے بخوبی ہوسکتا ہے جو آپ نے فروری 1977ء کی 13 تاریخ کو' سورۃ الحج کے درس کے دوران فرمایا:

> ''عزیزانِ من! بڑے غور سے سنیے۔میں ہمیشہ کی طرح پھر عرض کیے دیتا ہوں کہ قرآنِ حکیم کے نسخے ہمیشہ اپنے سامنے رکھا کریں کیونکہ اس طرح ان الفاظ کے سامنے آنے سے بات صحیح سمجھ میں آجاتی ہے جبکہ صرف سننے سے وہ بات نہیں بنتی۔''

ہمیں امید ہے کہ مندرجہ بالا تصریحات کی روشنی میں مفکرِ قرآن کی عمر بھر کی یہ محنتِ شاقہ عام طالب علموں کے علاوہ مزید تحقیقاتی کام کرنے والے صاحبِ علم حضرات کے لیے بھی ممد ومعاون ثابت ہوگی۔

درس کا قرآنی مفہوم

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر قرآنِ حکیم کی ضَو فشاں وادیوں میں عمر بھر سفر کرنے والی اس شخصیت سے یہ پوچھ لیا جائے کہ انہوں نے حق وباطل کو الگ الگ کرنے کے سلسلہ میں لفظ درس کی حقیقت اور اہمیت کو کس انداز سے بیان کیا۔چنانچہ محترم پرویز صاحبؒ اپنی شہرہ آفاق تالیف' لغات القرآن کے صفحہ 646 پر رقم طراز ہیں کہ:

> ''دَرَسَ کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کثرت سے گھِسنا یا مَلنا کہ اس کا نشان مٹ جائے۔اسی سے دَرَسَ اَلنَاقَةَ

ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اونٹنی کو اس کثرت سے چلایا جائے کہ وہ مطیع ومنقاد ہو جائے۔ اَلْـمُـدَارَسَةُ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کے لیے پیہم مشقت کرنا یا اس کی خبر گیری کرنا۔ اور دَرَسَ الْكِتَابَ يَدْرُسُه‘ کے معنی ہیں کتاب کو اس کثرت سے بار بار پڑھنا کہ وہ از بر ہو جائے۔

سورۃ آل عمران میں ہے: بِـمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۹) کتاب کو اس طرح گاھنا کہ اس کے معانی نکھر اور ابھر کر (الگ ہو کر) سامنے آ جائیں۔ اس پر مسلسل غور وفکر کرنا تاکہ الفاظ کے پردوں میں جو حقائق مستور ہیں' وہ نکھر کر سامنے آ جائیں یا جو حقائق انسانی تخیلات کے پردوں میں چھپ گئے ہیں' وہ بے نقاب ہو جائیں۔''

جیسا کہ آپ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ اگر کسی لیکچر کو تحریری شکل میں پیش کرنا مقصود ہو' تو اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس کی کسی حد تک رموزِ اوقاف (Punctuation) اور تدوین (Editing) کی جائے تاکہ قاری کو پڑھنے اور سمجھنے میں دقت نہ ہو۔ چنانچہ اس ضرورت کو پورا کرتے ہوئے رموزِ اوقاف (Punctuation) اور تدوین وعناوین سازی کے اس عمل کے دوران یہ کوشش کی گئی ہے کہ محترم پرویز صاحبؒ کی پیش کردہ فکر کسی شکل میں بھی متاثر نہ ہو۔ تاہم جو حضرات پرویز صاحبؒ کے پیش کردہ دروس کو مِن وعَن سننا چاہیں' پرویزؒ صاحب کے تمام دروس کی کیسٹس محفوظ ہیں۔ وہ وہاں سے سن سکتے ہیں۔

مطالب الفرقان کی تالیف کا آغاز

1975ء میں مرحوم پرویز صاحبؒ کی تفسیر مطالب الفرقان کی تالیف کا آغاز اس وقت ہوا جب ان کا رہروِعمر بہتر (72) سے بھی زیادہ منازل طے کر چکا تھا۔ اس وقت وہ قریب پچیس سال سے ہفتہ واری درسِ قرآن کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ چونکہ ان کے درس میں ہر بات بڑی تفصیل سے سامنے آ جاتی تھی اس لیے ان کے احباب کا تقاضا تھا کہ ان درسوں کی بنیاد پر قرآن کریم کی تفسیر مرتب کی جائے۔ اس میں وہ بڑی دشواریاں دیکھتے تھے اگرچہ ان کے ایک رفیقِ عزیز' ملک ظہور احمد' جو اب مرحوم ہو چکے ہیں' نے تقریباً 15 پاروں کے دروس جو ٹیپ ریکارڈ میں محفوظ تھے [1] صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا تھا۔ لیکن درس کا انداز' چونکہ تصنیفی انداز سے مختلف ہوتا ہے اس لیے وہ ان درسوں کی تفصیلات کو از سرِ نو مربوط ومنظّم مرتب شکل میں پیش کرنے کے اس سلسلۂ دراز کو شروع کرنے کی ہمت نہ پاتے ہوئے بھی' احباب کے شدید تقاضوں کی وجہ سے' اپنے ایک دوسرے رفیق' اخلاق احمد صاحب کو املا کراتے گئے۔ اور تین ماہ کے قلیل عرصہ میں اس کی پہلی جلد کا مسودہ تیار ہو گیا۔ جس میں سورۃ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی ابتدائی 29 آیات کی تفسیر کو سمویا جا سکا۔ اس طرح پہلی جلد بڑے سائز کے قریب پونے چار سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ دوسری جلد 1976ء میں طبع ہوئی جو قریب 476 صفحات پر مشتمل ہے

---

[1] لیکن افسوس کہ ٹرسٹ کے معتبر ذرائع کے مطابق مرورِ زمانہ کے ہاتھوں ان میں سے 70 فیصد دروس اب کہیں بھی نہیں مل پا رہے۔

جس میں سورۃ بقرہ کی آیات 30 تا 112 تک کی تفسیر بیان کی گئی ہے' تیسری جلد سورۃ بقرہ کی آیات 113 تا 286 پر مشتمل ہے جس پر سورہ بقرہ اختتام پذیر ہوئی ہے اور جس کی ضخامت 548 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے آخر میں تینوں جلدوں کے جامع انڈیکس کا اضافہ کیا گیا ہے۔ چوتھی جلد پوری سورۃ آل عمران' سورۃ نساء اور سورہ مائدہ کی تفسیر ہے۔ ضخامت اس کی 600 صفحات ہے۔ اس جلد میں سابقہ تفصیلی اسلوب کو بتام وکمال اختیار نہ کیا جا سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ

یہ نصف صدی کا قصہ ہے دوچار برس کی بات نہیں

معارف القرآن کے پروگرام کی ابتدا

پرویز صاحبؒ نے معارف القرآن کے اس عظیم علمی اور ادبی پروگرام کی ابتدا 1941ء میں دہلی سے شروع کی۔ آپ نے یہ سلسلہ کن تصورات کے تحت شروع کیا؟ وہ کون کون سے نکات وتصادمات تھے جو راستے کی کٹھن منزل تک پہنچنے کے لیے رکاوٹ کا باعث بنے؟۔ آپ نے قرآن فہمی کے لیے کیا انداز اختیار کیا؟۔ قرآن حکیم کو کیسے سمجھا؟ اور دوسروں کو کیسے سمجھایا؟۔ یہ وہ امور ہیں کہ جن کو آپ نے بڑی وضاحت کے ساتھ 1941ء میں معارف القرآن کی جلد اول' جس کا عنوان تھا ''اللّٰہ''[1] میں بیان کر دیا ہے۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں پرویزؒ صاحب کی تحریر کے ایک دو صفحات آپ کے استفادہ کے لیے یہاں پیش کر دیئے جائیں تا کہ آپ اس کام کی مشکلات وموانعات سے واقف ہو سکیں۔ چنانچہ آپ معارف القرآن کی اس مذکورہ جلد میں یوں رقم طراز ہیں:

قرآن فہمی

''اب سوال یہ ہے کہ جب قرآنِ کریم کو کسی خاص زمانہ کے ساتھ مُقَیَّد نہیں کیا جا سکتا اور کوئی شخص اسے اپنے خیالات کی روشنی کے تابع بھی نہیں رکھ سکتا تو پھر اسے سمجھا کیسے جا سکتا ہے؟ قرآن کریم کی رو سے اس کا جواب کچھ مشکل نہیں۔ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنی تفسیر آپ کرتا ہے اور اس تفسیر میں وہ کسی خارجی روشنی کا محتاج نہیں۔ وہ علمِ خداوندی کا نورِ مبین ہے اور نور کو کسی انسانی چراغ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جس خدا نے اسے نازل کیا ہے اس نے اس کی تفسیر بھی خود اپنے ذمہ لے لی ہے۔ **ثم ان علینا بیانہ** (75:19) ''قرآن کی تفسیر ہمارے ہی ذمہ ہے''۔ حقیقت یہ ہے کہ جس خالقِ فطرت نے کلی کو پیدا کیا ہے وہی اسے کِھلا کر پھول بنا سکتا ہے۔ دنیا کی تمام قوتیں جمع ہو کر کوشش کریں کہ کلی کو ہنسا کر پھول بنا دیں تو نہیں بنا سکیں گی۔ اس کی پتیاں بکھر جائیں گی' پھول نہیں بنیں گی۔ سو جس طرح غنچہ کی شگفتگی خود خالقِ فطرت کا کام ہے قرآن کی تبیین وتفسیر بھی اللہ ہی کے ذمہ ہے۔ اس کی ہر بات خود اسکی مدد سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ البتہ اس کے سمجھنے کا ایک خاص طریقہ ہے۔

---

[1] اب یہ کتاب ''من ویزداں'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

''قرآنِ کریم کے مضامین جس انداز وطریق سے بیان کیے گئے ہیں اوران کی ترتیب میں جوحسنِ اسلوب اورنظم وربط ہے اس سے بہتر تو کجا' اس جیسا اسلوب وانداز انسان کے حیطۂ امکان میں نہیں ۔لیکن قرآن کا انداز' ترتیب وبیان' انسانی تصنیفات سے الگ ہے۔ وہ ایک مضمون کو مسلسل ایک ہی مقام پر بیان نہیں کرتا۔ایک جگہ ایک حکم مذکور ہے۔دوسری جگہ اس پر اضافہ ہے' کہیں استثناء ہے' کہیں اجمال ہے' کہیں اس کی تفصیل ہے۔اس اندازِ بیان کا نام قرآنِ کریم کی اصطلاح میں ''تصریفِ آیات'' (یعنی آیات کا پھیر پھیر کر لانا) ہے اوراس سے غرض قرآن کی تفسیر کرنا' اسے سمجھانا ہے۔**انظر کیف نصرف الایات لعلھم یفقھون** (6:65) ''دیکھو ہم کس طرح آیات کو پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں تاکہ وہ بات سمجھ لیں''۔دوسری جگہ ہے کہ ہم تصریفِ آیات اس لیے کرتے ہیں **لنبینه لقوم تعلمون** (6:106) ''تاکہ سمجھنے والوں کے لیے ہم اسے (قرآن کو) واضح کردیں''۔غورفرمائیے۔اوپر سورۂ قیامہ کی آیت ۱۹ میں ارشاد تھا کہ **ان علینا بیانه** (75:19) قرآن کی تبئین ''بیان'' ہمارے ذمہ ہے اور یہاں سورۂ انعام میں فرمادیا کہ یہ تبئین **لنبینه** (6:106) تصریفِ آیات سے کی جاتی ہے۔سو قرآنِ کریم نے خود واضح کردیا کہ تصریفِ آیات سے قرآن اپنی تفسیر آپ کر دیتا ہے۔اس کی تفصیل معارفُ القرآن کی کسی آئندہ جلد میں قرآن کے عنوان کے ماتحت ملے گی۔اس حقیقت کے پیشِ نظر قرآنِ کریم کے مطالب کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مسئلہ زیرِنظر سے متعلق تمام مباحث ومقامات (آیاتِ متعلقہ) بیک وقت نگاہوں کے سامنے آجائیں۔لیکن اس کے لیے قرانِ کریم پر بڑے عبور کی ضرورت ہے اوراس باب میں بالعموم ہماری جو حالت ہے' وہ ظاہر ہے۔نوجوان طبقہ میں قرآنِ کریم کی طرف جو تھوڑا بہت رحجان پیدا ہورہا ہے از بس غنیمت ہے۔ان میں ایک ایسی پیاس کے آثار نظر آرہے ہیں جسے وہ کتابِ حکیم کے چشمۂ حیات سے سیراب کرنا چاہتے ہیں۔لیکن ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ قرآنِ کریم کو سمجھنے کے لیے اس پر ایسا عبور حاصل کرلیں گے جس کا اوپر ذکر کیا جاچکا ہے' (خاصا بعید از قیاس ہے)۔

نوجوان نسل کا اضطراب

''یہ وہ دقّت تھی جو ایک عرصہ سے میرے سامنے آرہی تھی۔سعادت مند نوجوانوں کے دل میں قرآن کا شوق پیدا ہوتا۔وہ مجھ سے پوچھتے کہ ہم قرآن کو کس طرح سمجھیں۔اس کا جواب یہی ہوسکتا تھا کہ قرآن کو پڑھو۔یہ پڑھنے ہی سے سمجھ میں آئے گا۔لیکن جب وہ کہتے کہ ہم نے تو اسے کئی بار پڑھا ہے لیکن نہ صرف یہ کہ وہ سمجھ میں نہیں آتا' بلکہ اس کے اندر ہمیں کوئی لذت وجاذبیت محسوس نہیں ہوتی تو اس سوال کے جواب میں ایک حقارت آمیز ''لاحول'' سے کام نہیں چل سکتا تھا۔اس لیے کہ مستفسرین کے صحیح ذوق' سچی تڑپ اور جذبۂ صادقہ میں میرے لیے شبہ کی کوئی گنجائش نہ تھی۔میں نے اس مشکل کی صحیح وجہ اوراس کا حل معلوم کرنے میں غور کیا اور ہر بار اسی نتیجہ پر پہنچا کہ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ چاہتے یہ ہیں کہ مختلف مباحث ومسائل بیک نظر ان کے سامنے آجائیں اوراس لیے ضروری ہے کہ ان کے

سامنے قرآنِ کریم کو اس شکل میں پیش کیا جائے کہ اس کے سمجھنے میں تردد و کاوش نہ ہو' یعنی جو بات قرآنِ کریم پر از خود عبور حاصل ہونے کے بعد حاصل ہونی چاہیے' وہ انہیں خود تیار کر کے دیدی جائے اور ہر مسئلہ کے متعلق قرآن کریم کی تمام وکمال تعلیم کو اس طرح یکجا جمع کیا جائے کہ وہ ایک مربوط و مسلسل مضمون کی صورت اختیار کر لے۔ یہ چیز ہماری مروجہ تفاسیر میں نہیں مل سکتی اس لیے کہ وہ شروع سے آخر تک ایک ایک آیت کا الگ الگ مطلب بیان کرتی جاتی ہیں۔جس سے آیات کا مطلب سمجھ میں آ جائے' تو آ جائے لیکن قرآنِ کریم کی پوری تعلیم سمجھ میں نہیں آ سکتی۔تبویب القرآن پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں'ان سے بھی یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔کیونکہ ان میں بالعموم آیات کو الفاظ کے اعتبار سے یکجا کیا گیا ہے۔موضوع کے لحاظ سے نہیں۔اگر کہیں موضوع کا بھی خیال رکھا گیا ہے تو آیات کو ایک مربوط مضمون کی صورت میں پیش نہیں کیا گیا۔

ان مشکلات اور الجھنوں کے حل کی کوشش

''ان حالات میں قرآن کریم کی تعلیم کو مذکورہ صدر نہج پر مرتب کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ایسے کام درحقیقت جماعتوں کے کرنے کے ہوتے ہیں۔لیکن ہمارے موجودہ دورِ انفرادیت میں جبکہ جماعتی نظام کا تصور ہی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے' یہ امید کہ کوئی جماعت اس مقصد کے لیے تیار ہو جائے گی' موہوم تھی۔ میں نے کوشش بھی کی کہ کوئی جماعت اس کے لیے آمادۂ عمل ہو جائے لیکن ناکام رہا۔اب میرے لیے سوائے اس کے چارہ کار نہ تھا کہ میں اس عظیم الشان کام کے لیے خود ہی قدم اٹھاؤں۔ چنانچہ جو نقشہ میرے سامنے تھا' اس کے مطابق میں نے تجربتہً دو تین عنوانات کو لیا۔ابتداء میں کچھ دِقّت ضرور ہوئی لیکن جب اس کے نتائج میرے سامنے آئے تو میری نگاہوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ایک طرف اہلِ طلب کا تقاضا۔دوسری طرف اس تھوڑی سی کوشش کے درخشندہ نتائج۔اب میرا خیال یقین کی حد تک پہنچ گیا کہ یہ کام کرنے کا ہے۔کام کی عظمت اور اپنی کمزوریاں حوصلہ شکن تھیں۔لیکن وقت کی ضرورت اور نتائج کی اہمیت جرأت آفریں' بالآخر تائیدِ غیبی نے مجھے اس صبر آزما اور عظیم المرتبت مہم کے لیے آمادہ کر دیا اور اس کے بعد میں نے اس فریضۂ مقدس کو مقصدِ زندگی قرار دے کر' اپنی فرصت کا ایک ایک لمحہ اس ''جنون'' کی نذر کر دیا چنانچہ بارہ برس ہونے کو آئے' یہ مرحلۂ شوق مسلسل طے ہو رہا ہے۔سینکڑوں ابواب تجویز کئے گئے۔ ہر باب کے ماتحت سینکڑوں عنوانات قائم ہوئے۔ ہر عنوان سے متعلقہ سینکڑوں آیاتِ قرآنی یکجا کی گئیں۔ یہ کام ہو چکا تو اس منزل کا آخری مرحلہ شروع ہوا۔اور ہر عنوان کے ماتحت جمع شدہ آیات میں ایک خاص ربطِ معنوی قائم کر کے انہیں مسلسل اور مربوط مضامین کی شکل میں ترتیب دینا شروع کیا۔اس سے قرآنِ کریم کا ایک ایسا دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) مرتب ہو گیا ہے' جس میں حقائقِ قرآنی سے متعلق تمام وکمال تعلیم'ایک ایک عنوان کے ماتحت ایک ایسے مسلسل اور دل کش مضمون کی صورت میں سامنے آ جاتی ہے' جس میں قرآن کی تفسیر خود قرآن سے ہوتی چلی جاتی ہے۔اس جلیل القدر عمارت کا پورا مسالہ تیار ہے اور

اس کا ایک گوشہ یا یوں کہیے کہ منزلِ اولیں تعمیر ہو کر آپ کے سامنے ہے۔ میں اس مرحلۂ شوق و جنون کی قطع شدہ منزل پر جب نگہِ بازگشت ڈالتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ یا اللہ! یہ مسافت میں نے کس طرح طے کر لی؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ کی توفیق اور اس کا فضل شامل حال نہ ہوتا تو شاید ''کئی عمروں'' میں بھی مجھ سے اتنا کام نہ ہوسکتا ۔ **و ذالک فضل اللہ یوتیه من یشاء** (62:4) ۔ اس مقام پر جہاں میری جبینِ نیاز' بارگہِ ایزدی میں اظہارِ تشکر و امتنان کے لیے زمیں بوس ہے۔ وہاں میرے قلب کی انتہائی گہرائیوں میں دو ہستیوں کے لیے جذبات سپاس گذاری رقصاں ہیں۔ ایک حکیم الامتہ حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمتہ' جن کی نگۂ حقیقت بین و بصیرت افروز' اس وادیٔ شوق میں میرے لیے چراغِ راہ بنی اور دوسرے شفیقِ محترم [1] علامہ محمد اسلم جیراجپوری مدظلہٗ العالی۔ جن کی رفاقت و شفقت' صعوبات سفر میں حوصلہ بخش و ہمت افزا ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اول الذکر کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ثانی الذکر کو خدمتِ قرآنِ کریم کے لیے تادیر سلامت رکھے۔

''میں ایک مرتبہ اس حقیقت کو پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ معارف القرآن یا اس نہج کی کوئی اور کتاب' قرآنِ کریم کا بدل نہیں ہو سکتی۔ قرآن اپنے الفاظ' آیات بلکہ سورتوں تک کی ترتیب میں قرآن ہے۔ کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے کہ اس کی ترتیب میں کسی قسم کا ردو بدل کر سکے۔ اس لیے مضامین کے اعتبار سے آیاتِ قرآنی کی ترتیب و تدوین' قرآن فہمی میں سہولت پیدا کرنے کے لیے ہے۔ جس طرح ترجمۂ قرآن' قرآنِ کریم کے سمجھنے کے لیے مفید ہوتا ہے' نہ ترجمہ متنِ کتاب کا بدل ہوسکتا ہے' نہ آیات کی مضامین کے اعتبار سے ترتیب قرآن کا بدل ہوسکتی ہے یہ تو محض قرآنِ کریم کے سمجھنے اور سمجھانے کے مختلف اسالیب ہیں۔

تفسیرِ قرآن کسی ایک فرد کا کام نہیں

''قرآنِ کریم ضابطۂ حیات ہے۔ تاریخ اور جغرافیہ' فلسفہ اور ہیئت' طبعیات اور حیاتیات' فلکیات اور طبقات لارض کی کتاب نہیں۔ لیکن چونکہ یہ اس کی کتاب ہے جس کا علم تمام علوم کا سرچشمہ ہے اس لیے قرآن کریم میں ضمناً اور تبعاً جہاں جہاں متفرق علوم و فنون کا ذکر آ گیا ہے ان اجمالی اشارات میں ان علوم کی اصولی تفصیلات سمٹ کر آ گئی ہیں............ مثلاً وجودِ باری تعالیٰ یا حیاتِ اخروی کے دلائل میں تخلیقِ ارض و سمٰوٰت کا ذکر آ گیا ہے تو ہر چند یہ تذکرہ ایک ضمنی حیثیت رکھتا ہے لیکن ہو نہیں سکتا کہ سائنس کے اکتشافات تخلیقِ ارض و سما کے متعلق اپنی تحقیقات کے بعد جس نتیجہ پر پہنچیں وہ اس سے مختلف ہو جو قرآن کریم میں ضمناً مذکور ہے۔ اگر ان دونوں میں اختلاف ہے' تو سمجھ لیجیے کہ ہنوز سائنس کی تحقیق یقین کے مرتبہ تک نہیں پہنچی۔ ظن تفسی و قیاس کے حدود کے اندر ہے۔ اس اعتبار سے قرآنِ کریم جو اولاً اور اصولاً حیاتِ انسانی کی ہدایت کا ضابطہ ہے' مختلف علوم و فنون کا مجموعہ بھی بن گیا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم کے ان گوشوں کی تفسیر جو مختلف

---

[1] اب مرحوم ہو چکے ہیں۔

علوم وفنون سے متعلق ہیں' کسی ایک شخص کا کام نہیں ہوسکتا۔قرآنِ کریم کی رو سے ان مقامات کے معانی تو متعین ہوسکتے ہیں لیکن ان معانی کی تفصیلات و جزئیات وہی سمجھ سکتے ہیں جو ان علوم کے ماہر ہوں اور جو بتاسکیں کہ ذہنِ انسانی نے اس وقت تک اس خاص فن میں کہاں تک رسائی حاصل کی ہے اور قرآنِ کریم اس سے بھی آگے کہاں تک لے جاتا ہے۔یہ وہ مقامات ہیں جہاں ہر ایک شعبہ کے لیے الگ الگ ماہرین کی ضرورت ہے جو قرآن کی روشنی میں ان علوم کی ریسرچ (تحقیق) اور اس کے نتائج سے قرآنِ کریم کے اجمالی اشارات کی تشریح کریں۔بعض اہلِ ذوق حضرات نے اس قسم کی کوشش بھی کی ہے لیکن یہ کام بھی انفرادی کوششوں کا نہیں۔حکومت یا نظامِ جماعت کا کام ہے۔ماہرینِ فنون کی جماعتیں قرآن کریم کی ایک ایک آیت کو لے کر اس پر عمریں صرف کردیں اور اپنی تحقیقات کے نتائج آگے منتقل کرتے چلے جائیں۔اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہے حتیٰ کہ قرآن کریم کی متشابہ آیات' محکمات کی ذیل میں آتی جائیں اور انسان علیٰ وجہ البصیرت پکار اٹھے کہ **ذلک الکتاب لاریب فیه** (2:2) ۔ ظاہر ہے کہ ان مقامات کی تشریح میرے بس کی بات نہیں ہے۔ان مقامات پر میں زیادہ سے زیادہ اتنا کرسکا ہوں کہ ان خاص علوم کے اصول و مبادیات کو قرآنی روشنی میں بیان کردوں تاکہ اس سے ذہن میں ایک اجمالی سا تصور مرتسم ہوجائے کہ قرآنِ کریم اس خاص شعبہ میں کیا اصول بیان کرتا ہے۔یہ مقامات فنی امور سے متعلق ہیں لیکن قرآنِ کریم کا وہ حصہ جو نفسِ انسانی کی ہدایت سے متعلق ہے اور جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کا دستورِ اساسی ہے' اس کی واضح تفسیر آپ کے سامنے آجائے گی۔اس ضمن میں' مَیں نے اس چیز کو بھی پیش نظر رکھا ہے کہ آج کل ہمارے مغرب زدہ نوجوان طبقہ کے دلوں میں جس قسم کے شکوک وشبہات عام طور پر پیدا ہوتے ہیں' ان کا ازالہ بھی ساتھ ہی ساتھ ہوجائے۔اس غرض کے لیے مجھے تمہیدی اور توضیحی عبارات بڑھانی پڑی ہیں۔لیکن عمود ان کا بھی قرآنِ کریم ہی کی تعلیم ہے۔''

علامہ حافظ اسلم جیراجپوری کی گذارشات

اس کے بعد ہمارا خیال ہے کہ یہاں یہ عرض کردینا بھی مناسب ہوگا کہ معارف القرآن کی اس پہلی جلد ''اللہ'' کا مقدمہ محترم علامہ حافظ اسلم جیراجپوریؒ صاحب کے قلم کا رہینِ منت ہے۔جس میں آپ نے قرآن فہمی کے سلسلہ میں سیر حاصل بحث کرتے ہوئے علاوہ دیگر امور کے مختلف لکھی جانے والی تفاسیر کی خوبیوں اور خامیوں کو بھی بڑے عالمانہ انداز میں پیش کیا جس کا مطالعہ قارئین کے لیے یقیناً سودمند ہوگا۔آپ لکھتے ہیں:

نقائصِ تفسیر

''1- سب سے پہلا نقص یہ ہے کہ ان مفسرین نے قرآن کی تشریح کے اصول مقرر نہیں کئے۔علماء اصول نے جو قواعد لکھے ہیں' اول تو وہ مخصوص قرآن فہمی کو پیش نظر رکھ کر نہیں مرتب کئے گئے ہیں' بلکہ عام ہیں اور زیادہ تر ان کا تعلق الفاظ سے ہے۔دوسرے ان کی بناء محض

قیاس پر ہے جس میں ہر نقطہ پر اختلاف کی گنجائش اور غلطی کا احتمال ہے۔ تیسرے وہ صرف چند قاعدے ہیں جو بالکل ناکافی ہیں۔ زمانۂ مابعد میں امام ابن تیمیہ نے جو ترجمان القرآن کے لقب سے مشہور تھے' اس ضرورت کو محسوس کر کے اصول لکھنے شروع کئے مگر نامعلوم وجوہ سے صرف تمہید ہی لکھ کر رہ گئے۔ آخری زمانہ میں شاہ ولی اللہ مرحوم دہلوی نے اصولِ تفسیر میں ایک رسالہ ''فوز الکبیر'' لکھا ہے۔لیکن اس میں بعض صرف ایسے مطالب کی مختصر تشریحات ہیں جن سے فہمِ قرآن میں مدد مل سکتی ہے۔ان کو اصول نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ وہ محدود ضوابط نہیں ہیں جن سے کوئی مخصوص طریقۂ تفسیر کا متعین ہو سکے۔ بلکہ وہ شاہ صاحب کے فہمِ قرآن کی نوعیت کو ظاہر کرتی ہیں اور بس۔

''الغرض تفسیرِ قرآن کے اصول قطعاً مرتب نہیں ہو سکے ہیں حالانکہ سب سے پہلا کام یہی تھا۔اسلیے یہ تمام تفاسیر جو لکھی گئی ہیں' کسی علمی یا عقلی اصول پر مبنی نہیں ہیں۔ چنانچہ ایک ممتاز مفسر علامہ فناری کا قول نقل کر چکا ہوں کہ تفسیر کے لیے بجز چند معمولی قاعدوں کے اصول مطلقاً نہیں ہیں۔جن پر اس کی جزئیات کا مدار ہو''۔(مرآۃ التفسیر صفحہ ۸)

''2- ان مفسرین نے قرآن کی تفسیر کا جو طریقہ رکھا ہے' وہ وہی ہے جس کے مطابق کسی انسانی کتاب کی تشریح کی جاتی ہے۔یعنی فاتحہ سے شروع کر کے ایک ایک آیت کی سلسلہ وار تفسیر لکھتے چلے جاتے ہیں اور خاتمہ تک پہنچا دیتے ہیں۔اس طرح آیات والفاظ کے معانی کی شرح تو ضرور ہو جاتی ہے مگر قرآن سمجھ میں نہیں آتا' یعنی اس سے کوئی تعلیم حاصل نہیں ہوتی اس لیے کہ اس کی تعلیمات اس ترتیب اور ربط کے ساتھ نہیں بیان کی گئی ہیں' جس طرح انسانوں کی کتابوں میں بیان کی جاتی ہیں۔ بلکہ اس کی ہر تعلیم متعدد سورتوں اور آیتوں میں اس کے طول وعرض میں بتدریج اتاری گئی ہے۔تاوقتیکہ کسی خاص مسئلہ کے متعلق تمام تعلیمات متفرق سورتوں سے نکال کر جمع نہ کر لی جائیں اور ان کو صحیح ترتیب کے ساتھ مرتب نہ کیا جائے۔اس مسئلہ کی پوری قرآنی تعلیم ہرگز سمجھ میں نہیں آسکتی۔لہٰذا ان تفسیروں نیز ترجموں سے جو سلسلہ بسلسلہ آیات کے ساتھ چلتے ہیں' قرآنی تعلیمات کی توضیح نہیں ہو سکتی۔فہمِ قرآن کے لیے ان تفسیروں کی نوعیت تقریباً وہی ہے' جو فنِ طب میں کتبِ مفردات کی ہے جن میں حروفِ تہجی کی ترتیب کے ساتھ دواؤں کے نام' خواص' آثار اور بدل وغیرہ لکھ دیئے جاتے ہیں۔ظاہر ہے کہ کوئی شخص ان کو پڑھ کر طبیب نہیں بن سکتا۔بجنسہٖ اسی طرح ان تفاسیر وتراجم کے مطالعہ سے بھی کوئی شخص حقائقِ قرآنی کا عالم نہیں ہو سکتا۔

''3- اکثر تفاسیر میں آیات والفاظ کی تشریحات روایات سے کی گئی ہیں اور تفسیری روایات کی بابت ہم لکھ چکے ہیں کہ ان کا بڑا حصہ خود محدثین کے نزدیک موضوع ہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل نے جن کے اوپر حدیث کی امامت منتہیٰ ہوئی' کہہ دیا ہے کہ تفسیری روایتیں تمام تر بے اصل ہیں۔قصص میں اسرائیلیات لائی جاتی ہیں جو بیشتر ناقابلِ اعتبار ہیں۔ یہی حال اسبابِ نزول کی روایتوں کا ہے۔قدیم مفسروں نے ان روایتوں کے سلسلۂ اسناد بھی لکھے تھے' جن سے صحیح اور غیر صحیح کی تمیز ہو سکتی تھی۔مگر متاخرین نے ان کو بھی حذف کر دیا اور اپنی تفسیروں میں ان روایات کو بلا اسناد کے نقل کرنے لگے۔جس کے باعث عوام میں ان کی حیثیت مسلمات کی سی ہو گئی

اور بہت سی آیتوں کی غلط تفسیریں امت میں رائج ہوگئیں۔ یہی سبب ہے کہ جس قدر تفاسیر کی کثرت ہوتی گئی' اسی قدر مسلمانوں کی قرآنِ کریم کی اصلی اور صحیح تعلیم سے بُعد ہوتا گیا۔

''4- ایک خاص شکایت یہ ہے کہ ان تفسیر نگاروں نے خود اپنے دماغوں سے بہت کم محنت لی ہے الا ماشاءاللہ زیادہ تر متقدمین ہی کی باتیں اور روایتیں نقل کرتے چلے آئے ہیں۔ بعض بزرگ تو اس قسم کے گذرے ہیں' جنہوں نے اپنی تفسیریں محض ثواب کا ذخیرہ اور جنت کا ذریعہ سمجھ کر لکھی ہیں۔یعنی **تقرباً الی اللہ** خدامِ قرآن میں داخل ہوگئے۔ بجا' لیکن ان کی تفسیروں میں کوئی چیز ایسی نہیں ملتی' جس پر کسی طالبِ قرآن کی زبان سے ان کے لیے مغفرت کی دعا نکلے۔ یا جو بوجھ اپنی تصنیف کا وہ پڑھنے والوں پر ڈال گئے ہیں اس کی کوئی تلافی ہو سکے۔ بیشتر اسی قسم کی تفسیریں تھیں جو معدوم یا متروک ہوگئیں' کیونکہ یہ حقیقت ہے جس کو قرآن نے سکھلایا ہے کہ **واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض** (13:17) ''وہی چیز دنیا میں رہے گی' جو لوگوں کے لیے نفع رساں ہوگی۔

''جن لوگوں نے دماغ سے کام لیا ہے' ان میں سے اکثر ایسے ہیں' جنہوں نے اپنے خاص خاص عقیدوں کو موقع بے موقع قرآن کے ذریعہ سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض نے محض جدتِ طبع دکھائی ہے' مثلاً ابن نورک نے حضرت ابراہیمؑ کے قول **لیطمئن قلبی** (2:260) کی تفسیر میں لکھا ہے کہ قلبی ان کے ایک دوست تھے۔یا **کطی السجل للکتب** (21:104) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ ''سجل'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب کا نام تھا۔ حالانکہ تمام ائمہ حدیث و تاریخ متفق ہیں کہ اس نام کا کوئی صحابی نہیں ہے۔ یا **مَرَجَ البَحرین** (25:53) کی تفسیر علی و فاطمہ اور **اللؤلؤ و المرجان** (55:22) کی تفسیر حسین رضی اللہ عنہم یا **الصابرین والصادقین والقانتین والمنفقین والمستغفرین** (3:16) کی تفسیر میں ''صابر'' سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' ''صادق'' سے صدیق' ''قانت'' سے عمر فاروق' ''منفقین'' سے عثمان غنی اور ''مستغفرین'' سے حضرتِ علی رضی اللہ عنہم۔غرض اسی طرح کی سینکڑوں آیات ہیں جو ان حضرات نے مسخ کی ہیں۔ ❶

''5- یہ مفسرین بالعموم قرآن میں نسخ کے قائل ہیں۔ چنانچہ بہت سی محکم اور یقینی آیتوں پر بھی نسخ کے احکام لگاتے چلے جاتے ہیں۔ بلکہ جن لوگوں نے ناسخ اور منسوخ پر کتابیں لکھی ہیں' ان کی تو کوشش یہی معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر ہو سکے نسخ دکھلائیں۔ ان کے بیان کے مطابق نصف بلکہ اس سے بھی زیادہ احکامی آیات منسوخ ہیں' غرض اس نسخ کے عقیدہ نے بھی تفسیروں کے اندر ایک عجیب پیچیدگی پیدا کر دی ہے۔

''6- یہ مفسرین بہت سی آیتوں کی تفسیر میں متعدد معانی اور مختلف اقوال نقل کرتے ہیں۔ مثلاً **غیر المغضوب علیھم ولا**

---

❶ تذکرہ الموضوعات صفحہ 84

الضالین (1:7) کی تفسیر میں دس قول ہیں **والفجر ولیال عشر** (89:11) کی متعدد تفسیریں ہیں **وشاھد و مشھود** (85:3) کی شرح میں کئی باتیں کہی گئی ہیں۔**اصحاب الاخدود** (38:13) کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ وہ اہل فارس تھے یا یمن کے باشندے تھے یا حبشی یا نجرانی یا شامی تھے۔ [1] الغرض سینکڑوں الفاظ و آیات ہیں' جن کی کئی کئی تفسیریں' یا' یا' کر کے لکھتے چلے جاتے ہیں اور کسی ایک بات کو جزم و یقین کے ساتھ بیان نہیں کرتے۔ان میں سے صحیح مفہوم کے فیصلہ کی قوت خود ان کے اندر مفقود ہوتی ہے حالانکہ صحیح مفہوم ایک اور صرف ایک ہی ہوسکتا ہے۔ایسی تفسیروں سے بجائے اس کے کہ آیات کی توضیح ہو' وہ اور مبہم ہو کے رہ جاتی ہیں۔

''7- ان مفسروں کو قرانی حقائق کی جستجو کم اور غیر متعلق اور غیر ضروری باتوں کی تلاش زیادہ رہتی ہے۔جنت کا ذکر ہے' تو اس کے پیالوں اور آبخوروں کی تعداد کا شمار اور کوثر اور طوبیٰ کی پیمائش کریں گے۔دوزخ کے بیان میں اس کے طبقوں کی گہرائی اور سانپوں اور بچھوؤں کی درازی ناپیں گے۔جنگِ بدر میں فرشتوں کے نزول کی حقیقت سمجھانے کے بجائے' ان کے چہروں' گھوڑوں اور عماموں کے رنگ اور ان کی سواری و حملہ و قتال کی کیفیت لکھیں گے۔یاجوج و ماجوج کے تاریخی حالات بیان نہیں کریں گے' بلکہ کوئی لکھے گا کہ ان کے قد اس درخت سے مشابہ ہیں' جو ملک شام میں نظر آتا ہے اور جس کی بلندی ایک سو بیس گز ہوتی ہے اور کوئی لکھے گا کہ ان کا ایک کان اوڑھنا ہے اور دوسرا بچھونا۔اگر ان چیزوں کا موقع نہیں پائیں گے تو فصاحت و بلاغت کی لطافتیں دکھلانے لگیں گے یا خیالی فلسفیانہ بحثوں میں الجھ جائیں گے۔

''یہ سات بڑے بڑے عیوب واسقام جو میں نے گنائے ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہیں کہ موجودہ تفسیروں میں شاید ہی کوئی تفسیر ان سے خالی ہو۔''(بحوالہ معارف القرآن' جلد اول' اللہ: مقدمہ' ص۔۳۵)

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اگر کسی بڑی سے بڑی فصیح البیان شخصیت کے کسی موثر سے موثر لیکچر کو صفحۂ قرطاس پر اسی طرح' انہی کے الفاظ میں منتقل کر دیا جائے تو بھی اس شکل میں پڑھنے والے کو کسی نہ کسی حد تک رموزِ اوقاف (punctuation) اور تدوین (Editing) کی ضرورت ضرور محسوس ہوتی ہے۔لہٰذا ہمیں امید ہے کہ قارئین **مطالب الفرقان فی دروس القرآن** کے مطالعہ کے سلسلہ میں اس پہلو کو نظر انداز نہیں کریں گے۔تاہم جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے' جو احباب پرویز صاحبؒ کے دروس کو من وعن سننا چاہیں ان کے لیے مذکورہ دروس کا ریکارڈ مکمل طور پر محفوظ ہے۔اگر ہماری اس کوشش سے' ایک سوچنے والا ذہن بھی قرآنِ کریم کے قریب آ گیا تو ہم سمجھیں گے کہ ہماری محنت ثمر بار ہوگئی اور ہمیں دیدہ ریزیوں کا صلہ مل گیا۔بقول پرویز رحمت اللہ علیہ ہمیں قوی احساس ہے کہ ''زمانے کے تقاضے کچھ ایسی برق رفتاری سے آگے بڑھ رہے ہیں کہ سست روی کے لیے اس دور میں کہیں گنجائش نہیں۔اس تیز گامی کے دور میں اگر کوئی قوم یا

---

[1] تفسیر جامع البیان

جماعت پاؤں میں سے کانٹا نکالنے بھی رک گئی تو زمانے کا ریلہ اسے کچلتا ہوا آگے بڑھ جائے گا۔'' (بحوالہ ماہنامہ طلوع اسلام' جون 1958 ص۔)

قرآن فہمی کا سلسلہ نہ کسی دور میں ختم ہوسکتا ہے' نہ کسی انسان تک پہنچ کر رک سکتا ہے۔ یہ ایک جوئے رواں ہے جو لامتناہی وسعتوں کا امکان رکھتی ہے۔ جوں جوں انسانی علم وسیع ہوگا قرآنی حقائق' بیش از بیش بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہےگا۔ **ھی حتّٰی مطلع الفجر** ۔(مفہوم القرآن ص۔ط۔از علامہ پرویزؒ)

یہ تھا وہ فکرِ قرآنی کا کوہکن' جس کی خاراشگافی کو دیکھ کر زبان پر بے ساختہ یہ شعر آجاتا ہے کہ

پاؤں بھی لہو لہان تھے اُن کے رستے بھی پتھریلے تھے
گھستے گھستے گھِس گئے آخر پتھر جو نوکیلے تھے

بہرحال اس طرح یہ مردِ قلندر فہمِ قرآن کے یہ انمول موتی اپنی طبعی شمعِ حیات کے آخری دم تک ملت اسلامیہ کے اس اجڑے ہوئے گلستان میں بکھیرتا چلا گیا۔

محمد اشرف ظفر
نمائندہ بزم طلوعِ اسلام لاہور
اکتوبر 2003

....

<u>ضروری گزارش:</u> قارئین کرام سے التماس ہے کہ تفسیر ہذا میں اگر قرآن حکیم کے متن میں سہواً کہیں کسی قسم کی کوئی کوتاہی رہ گئی ہو تو براہ کرم مطلع فرما کر مشکور فرمائیں۔ مہربانی ہوگی۔

(نوٹ) جہاں کہیں آپ قرآنی آیات کے حوالہ جات دیکھنا چاہیں تو اس کے لیے عرض ہے کہ ان میں سے ایک نمبر سورۃ کا ہے جبکہ دوسرا نمبر آیت کا ہے۔یعنی 4:2 کا مطلب ہے 4: سورۃ النسآء کی 2: دوسری آیت۔

(سورۃ الفاتحۃ)



فہرست مشمولات سورة الفاتحة

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

دوسرا باب: سورۃ الفاتحہ (بسم اللہ اور آیت 1)

پانچواں باب: سورۃ الفاتحہ (آیت 4)

چھٹا باب: سورۃ الفاتحہ (آیت 4 وایاک نستعین)

ساتواں باب: سورۃ الفاتحہ (آیت 5)

آٹھواں باب: سورۃ الفاتحہ (آیت 6)

نواں باب: سورۃ الفاتحہ (آیت 7)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

پرویز علیہ الرحمتہ کی منفرد قرآنی فکر کا آغاز حضرت علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ سے قُرب حاصل ہونے کے بعد ہوا۔ علامہ اقبال ہی کے سُجھائے ہوئے خطوط (Lines) پر چلتے ہوئے پرویز علیہ الرحمتہ کی بے مثال نگارشات کا سلسلۂ زریں شروع ہوا۔اس پس منظر کا مختصر سا خاکہ پرویزؒ مرحوم نے ایک جگہ خود اپنے الفاظ میں یوں تحریر کیا ہے:

''جس نہج پر معارف القرآن لکھی گئی ہے اس کا خاکہ علامہ اقبالؒ رحمتہ اللہ علیہ کے ذہن کا مرہون منت ہے۔ میں نے اس خاکہ کو ایک مفصل خط کی صورت میں ارباب علم وقلم کو بھیجا اور ان سے درخواست کی کہ اگر وہ اس قسم کی کتاب کی افادیت سے متفق ہوں تو ایسی کتاب تصنیف کریں۔ ان تمام حضرات نے خاکے کی بہت تعریف کی لیکن ہر ایک نے یہ لکھ کر معذرت چاہی کہ ایسا کام افراد کا نہیں' جماعتوں کے کرنے کا ہے۔ میں نے حضرت علامہؒ کو اس سے مطلع کیا اور لکھا کہ اس کام کے لئے کوئی............آدمی .... تیار نہیں ہوتا۔انہوں نے اس خط کے حاشیے پر لکھ کر خط واپس کر دیا کہ ''اگر کچھ وقت کے لئے تم ہی وہ آدمی' بن جاؤ تو اس میں کیا حرج ہے''؟ یہ بات میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھی کہ اس قسم کا قرآنی انسائیکلو پیڈیا لکھنے کے لئے وہ میری طرف اشارہ کریں گے۔ میں نے جب اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کا اظہار کرتے ہوئے معذرت چاہی تو انہوں نے اس کے جواب میں ایک ایسی بات لکھ دی جس نے میری زندگی کا رخ بدل دیا۔

انہوں نے تحریر فرمایا: ''تم مسافت کی لمبائی اور راستہ کی تاریکی سے ڈرتے ہوئے قدم نہیں اٹھاتے کیونکہ تم سمجھتے ہو کہ تمہارے پاس جو چھوٹا سا مٹی کا دیا ہے' وہ صرف دو چار قدم تک راستہ روشن کر سکتا ہے۔ تمہارا یہ خوف اسی وقت تک ہے جب تک تم اس دیے کو لے کر ایک جگہ کھڑے ہو۔تم اسے لے کر چل پڑو۔اور پھر دیکھو کہ یہی چھوٹا سا دیا کس طرح سینکڑوں میل کا راستہ روشن کئے چلا جاتا ہے۔نقص دیئے کا

نہیں، تمہارا اپنا ہے۔ تمہارے چلنے کی دیر ہے، یہ روشنی تم سے چار قدم آگے آگے ہوگی اور جہاں تک چلتے جاؤ گے، آگے ہی آگے رہے گی''۔ میں نے بلا مزید استفسار و تامل اس ننھے سے دیئے کو ہاتھوں میں لے کر چلنا شروع کر دیا اور تجربے نے بتا دیا کہ یہ دیا فی الواقع میرے راستہ کو مسلسل روشن کرتا چلا گیا''۔

(قرآنی فیصلے، جلد دوم، ص ص ۱۱۰۔۱۱۱)

پرویز علیہ الرحمتہ مزید فرماتے ہیں کہ:

''یہ طریق بڑا صبر آزما، اور یہ مراحل بڑے ہمت طلب تھے۔ لیکن انہیں طے کئے بغیر یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ میری عمر کا باقی حصہ اسی کوہ کنی اور جوئے شیر براری میں گزرا ہے۔ اور اس احساس سے میری جبینِ تشکر بارگاہِ ایزدی میں بصد عجز و نیاز جھک جاتی ہے کہ اس کی توفیق و تائید نے مجھے اس میں بڑی کامیابی عطا فرمائی ہے۔ جہاں تک قرآنی الفاظ (مفردات) کے معانی اور تصورات متعین کرنے کا مرحلہ تھا، میں نے برس ہا برس کی محنتِ شاقہ کے بعد قرآنی لغت مرتب کیا جو چار جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے تصریفِ آیات کے ضمن میں، تبویب القرآن کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ (اس کا ضخیم مسودہ سال گذشتہ کتابت کے لئے دے دیا گیا تھا جو اب چھپ چکا ہے) ان دونوں بنیادوں پر میں نے پورے کے پورے قرآن کا مفہوم متعین کیا، جو تیس پاروں میں شائع ہو چکا ہے۔ اسی دوران میں، میں نے قرآنی تعلیم اور حقائق کو مختلف تصانیف کی شکل میں بھی شائع کیا جو ملک کے تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ میں بالخصوص بڑی مقبول ہوئی ہیں:

من و یزداں، ابلیس و آدم، جوئے نور، برقِ طور، شعلۂ مستور، معراجِ انسانیت، جہانِ فردا، کتاب التقدیر، ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت، شاہکارِ رسالت اسی سلسلۂ زریں کی مختلف کڑیاں ہیں۔

اس کے ساتھ میں نے ہفتہ واری درسِ قرآنِ کریم کا سلسلہ بھی جاری کیا جو بحمد اللہ قریب پچیس سال سے مسلسل چلا آ رہا ہے۔ چونکہ درس میں ہر بات بڑی تفصیل سے سامنے آ جاتی ہے، اس لئے یہ سلسلہ بڑا موثر، بلیغ اور دلکش ثابت ہوا۔ احباب کا شروع ہی سے تقاضا تھا کہ ان درسوں کی بنیاد پر قرآن کریم کی تفسیر مرتب کی جائے۔ میں اس میں بڑی دشواریاں دیکھتا تھا۔ اگرچہ میرے ایک رفیق عزیز (ملک ظہور احمد) کی برسوں کی خارہ شگافی نے ان درسوں کو، جو ٹیپ ریکارڈر میں محفوظ کر لئے جاتے ہیں، صفحۂ

قرطاس پر منتقل کر دیا تھا' لیکن درس کا انداز تصنیفی انداز سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ تفسیر کے لئے' ان دروس کی تفصیلات کے انبار سے متعلقہ حقائق کو الگ کر کے انہیں ازسرِ نو مربوط و مرتب شکل میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے میں اس سلسلۂ دراز کو شروع کرنے کی اپنے میں ہمت نہیں پاتا تھا۔ لیکن سال گذشتہ احباب کے اس تقاضا نے ایسی شدت اختیار کر لی کہ مجھے بالآخر سپر انداز ہونا پڑا۔ کچھ وقت تک مسلسل لکھنے سے اب میرا ہاتھ تھک جاتا ہے۔ اس مشکل کا حل میرے ایک دوسرے رفیق (اخلاق احمد صاحب) نے پیش کر دیا۔ چنانچہ میں تفسیر کو املا کراتا گیا اور وہ لکھتے گئے۔ اور قریب تین ماہ کے نہایت قلیل عرصہ میں اس کی پہلی جلد کا مسودہ تیار ہو گیا۔ (مطالب الفرقان' جلد اول' ص ص۔ ق۔ ک)

مگر واحسرتا! کہ مطالب الفرقان کی پہلی جلد سے شروع ہو کر یہ سلسلہ سورۃ الحجر تک ہی پہنچا تھا کہ پرویز علیہ الرحمتہ داغِ مفارقت دے گئے اور یہ گراں قدر اور منفرد تفسیر مکمل نہ ہو سکی۔ کافی عرصہ گزر جانے کے بعد' بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کے جواں ہمت نمائندہ' محترم محمد اشرف ظفر صاحب' کے دل میں' اس تفسیر کو مکمل کرانے کے خیال نے انگڑائی لی۔ یہ خیال ایک شدید جذبے کی شکل اختیار کرتا چلا گیا۔ مگر پرویز صاحب جیسا انشاء پرداز کہاں سے ملتا۔ ناچار باقی ماندہ دروس کی تسوید کا کام شروع کر دیا گیا اور انہیں پنچو ایشن اور ضمنی عنوانات جمانے کے بعد شائع کرانے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اب یہ حاضر ہے۔

اس کو پڑھتے ہوئے جہاں تکرار کے باعث ناگوارئ احساس کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے وہیں ''تحریر میں تقریر'' کی لطف اندوزیوں اور ایک گونہ افادیت کے بھی بے پایاں امکانات مضمر ہیں۔ بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کی جانب سے سورۃ النحل پر مشتمل **''مطالب الفرقان فی دروس القرآن''** پیشِ خدمت ہے۔ اُمید ہے کہ اسے قبولِ خاطر ارزانی ہو گا اور یہ سلسلہ بتدریج پورے قرآن کریم کو محیط ہو جائے گا۔

والسلام

ایاز حسین انصاری

چیئرمین ادارہ طلوع اسلام لاہور

پہلا باب: سورۃ الفاتحہ (تمہید)



آغازِ سخن بسلسلۂ درس قرآنِ حکیم کراچی 1950ء

عزیزانِ من! یہ پرویز کی آواز ہے۔ میں اپنے مکان B/25 ' گلبرگ 2 'لاہور' پاکستان' سے بول رہا ہوں۔ آج اکتوبر 1979 کی 14 تاریخ ہے۔ میں آپ احباب سے مخاطب ہو رہا ہوں' اس کے متعلق اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ میں قرآنِ کریم کا ایک ادنیٰ سا طالب علم ہوں۔ میں نے اپنی پوری زندگی اس کتابِ عظیم کے سمجھنے اور سمجھانے میں بسر کی ہے۔ پہلے عام مروجہ تراجم کے 'انداز سے' اس کتاب کو سمجھنے کی کوشش کی' لیکن اس سے کچھ بات سمجھ میں نہ آئی' تو میں نے پھر اس انداز سے کہ جس میں خود اس کتاب نے اپنے متعلق کہا ہے کہ اس کو سمجھا جائے' اس کے سمجھنے کی کوشش کی۔ قریب پچاس سال سے میں اس کوشش میں مصروف ہوں۔ [1] اس کے سمجھنے کے بعد مجھ پر یہ فریضہ عائد ہو گیا کہ: ''دیکھا ہے جو کچھ میں نے' اوروں کو بھی دکھلا دوں''۔ یہ فرمانِ خداوندی ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے فرمایا گیا تھا کہ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (5:67) خدا کی طرف سے جو تجھ پر نازل کیا جاتا ہے' اسے دوسروں تک بھی پہنچا دے۔ خدا کی طرف سے ان کا یہ نازل ہونا' نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی پر ختم ہو گیا لیکن قرآن کے نزول کے بعد یہ زندۂ جاوید کتاب قرآن کریم قیامت تک رہے گی۔ یہی فریضہ ہر اس شخص پر عائد ہو جاتا ہے جو قرآنِ کریم کو سمجھے اور دوسروں تک بھی پہنچائے۔

اس فریضہ کی ادائیگی کا آغاز تو میں نے اس سے بہت پہلے' دہلی اور شملہ میں' متفرق خطابات سے کر رکھا تھا' لیکن پاکستان بننے کے

---

[1] اکتوبر 1979ء میں پرویز صاحب دروس قرآن کے دوسرے دور میں سورۃ لقمان تک پہنچ گئے تھے۔ ان ایام میں باہر کے احباب جو سورۃ الفاتحہ کے دروس پہلے دور کی کیسٹس کے ذریعہ سنا کرتے تھے' ان کا تقاضا تھا کہ پرویز صاحب اپنی آواز میں سورۃ الفاتحہ کے دروس کو دوبارہ ریکارڈ کروا دیں کیونکہ کیسٹس کی آواز کی کوالٹی میں کافی فرق پڑ گیا تھا۔ اس طرح پرویز صاحب نے دوبارہ سورۃ الفاتحہ کے دروس ریکارڈ کرائے اور چونکہ 1968ء کے بعد 1979ء تک ان کے فہم وبصیرتِ قرآن میں بھی اضافہ ہو گیا تھا اس لیے موجودہ دروس کی تعداد نو ہے جب کہ پہلے دور کے دروس قرآن کی تعداد آٹھ تھی۔

بعد [1] قرآن کے درس کا سلسلہ میں نے کراچی میں 1950 میں، [2] شروع کیا۔ اس وقت قرآن کا یہ درس مسلسل نہیں تھا، مختلف موضوعات سامنے آتے تھے اور ہر موضوع کے متعلق قرآنِ کریم میں جو کچھ آیا ہے اپنی بصیرت کے مطابق میں اسے سامعین کے سامنے پیش کرتا تھا۔ یہ سلسلہ 1958 تک رہا جب تک میں کراچی میں رہا۔

لاہور میں ہفتہ وار درسِ قرآنِ حکیم کا آغاز

جب میں 1958ء میں کراچی سے منتقل ہو کر لاہور آیا تو اسی سال یعنی 1958 میں، میں نے درسِ قرآنِ کریم کا سلسلہ یہاں، خود اپنے مکان پر، جاری رکھا۔ یہ ہفتہ واری درس تھا۔ چونکہ اس زمانے میں دفاتر وغیرہ میں چھٹی اتوار کے دن ہوتی تھی، اس لیے یہ درس اتوار کی صبح کو میرے مکان پر ہوا کرتا تھا۔ 1958ء سے لے کر 1967ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ جب اس پورے قرآنِ کریم کے پہلے سلسلہ درس کا اختتام ہوا، تو اسی اختتام کے ساتھ ہی یہ تقاضا شروع ہوا کہ مجھے ازسرِ نو اس سلسلے کو جاری کرنا چاہیے کیونکہ اس دوران میں بہت سے ایسے احباب درس کے حلقے میں شامل ہو گئے تھے جو پہلے دَور میں یا شروع میں شامل نہیں تھے یا بعد میں یا درمیان میں، آ کر اس پچھلے وقت کے لیے شامل نہ رہے۔ بہرحال ان سامعین کا تقاضا تھا کہ درس کا سلسلہ پھر شروع کیا جائے چنانچہ 17 مارچ 1968ء [3] میں یہ سلسلہ ازسرِنو شروع کیا گیا۔ مسلسل درسِ قرآن کریم اس زمانے سے آج تک ہر اتوار کی صبح کو یہاں ہوتا آ رہا ہے اور اب جیسا میں نے عرض کیا ہے اکتوبر 1979 میں ہم سورۃ لقمان اکتیسویں سورۃ تک پہنچ پائے ہیں۔

---

[1] پاکستان کے قیام کے بعد، پرویزؒ دہلی اور شملہ سے بسلسلۂ ملازمت کراچی تشریف لائے۔ 1955ء میں قبل از وقت پنشن حاصل کر لی تا کہ وہ اپنے ہمہ اوقات وتوجہات اپنی زندگی کے قرآنی مشن کے فروغ کے لیے وقف کر سکیں۔ اپریل 1958ء میں لاہور تشریف لے آئے اور موجودہ دارالقرآن و درسگاہ تعمیر ہو کر جولائی 1958ء سے سلسلۂ درس شروع ہوا۔ ابتداءً درس کے موضوعات اسلام کے بنیادی تصورات اور اصطلاحات رہے، جن کے بغیر مسلسل درسِ قرآن کی تفہیم آسان نہ ہو سکتی تھی۔ پہلا باقاعدہ درسِ قرآن ستمبر 1960ء میں شروع ہوا۔ جس کی تکمیل ایک مدتِ طویل یعنی سوا سات سال کے بعد اتوار 31 دسمبر 1967ء کو بخیر وخوبی عمل میں آئی۔ (مرزا محمد خلیل: جشنِ نزولِ قرآن وتکمیلِ درس قرآن: استقبالیہ، مجلّہ طلوع اسلام، فروری 1968ء، ص ص۔ 9 تا 11)

[2] میں نے اس سلسلہ (درسِ قرآن) کو 1950ء کے قریب کراچی میں شروع کیا تھا۔ یہ وہاں مسلسل جاری رہا تا آنکہ میں 1958ء میں لاہور منتقل ہو کر آ گیا اور اس سلسلہ کو یہاں جاری کر دیا۔ ابتدائی دو سال قرآنِ کریم کے بنیادی تصورات پیش کرنے میں صرف ہو گئے اور اس کے بعد 1960ء سے، اس کا مسلسل درس شروع کر دیا گیا۔ (پرویزؒ: جشنِ نزولِ قرآن وتکمیلِ درسِ قرآن: خطاب، موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال، مجلّہ طلوع اسلام، فروری 1968ء، ص ص 12 تا 19)۔

[3] سامعین درس (اوّل) کا اصرار تھا کہ محترم پرویزؒ اپنے اس درس کا دوسرا دور شروع کر دیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کے طویل وعریض پروگرام کو التزاماً جاری رکھنا بڑا صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے۔ انہوں نے احباب کے اس تقاضائے شوق کے سامنے سرِتسلیم خم کر دیا لیکن اپنی صحت کی بحالی کے لیے صرف دو ماہ کے وقفہ کی ''درخواست کی''، جس پر احباب نے بادلِ ناخواستہ رضامندی کا اظہار کیا۔ چنانچہ اب اس درس کا ازسرِنو سلسلۂ وسط مارچ سے شروع کیا جائے گا۔ (حوالہ: طلوعِ اسلام فروری 1968ء، ص 8 (ایک خصوصی اعلان) نیز مجلّہ طلوعِ اسلام اپریل 1968ء، ص 17)

قرآنِ کریم کا یہ درس یہاں قارئین تو بالمشافہ سنتے ہیں لیکن باہر کے احباب کے لیے اسے ٹیپس پر محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ ٹیپس کے بعد جب کیسٹس کا سلسلہ جاری ہوا تو پھر اسے کیسٹس پر بھی منتقل کیا گیا اور اس طرح یہ درس مقامی نہ رہا' بلکہ پہلے پاکستان کے مختلف شہروں میں اس کا رواج ہوا اور اس کے بعد پاکستان کے باہر بھی مختلف مقامات پر مستقلاً بھی' انتظاماً بھی' اور صبح صبح بھی' بہت سے احباب نے اپنے ہاں کیا' بزموں نے بھی اس سلسلے کو مسلسل اپنے ہاں جاری رکھا اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ سلسلہ نہ صرف یہ کہ اس وقت رواں دواں جاری ہے بلکہ یہ حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اور میں اللہ تعالیٰ کے اس کرمِ بے پایاں پر جس قدر بھی اظہارِ تشکر کروں کم ہے۔

اس سلسلۂ نو کی ابتداء جیسا کہ ظاہر ہے سورۃ الفاتحہ سے ہی ہونی تھی چنانچہ اس سورۃ کی تکمیل آٹھ درسوں میں' علاوہ اس تمہیدی درس کے ہوئی' احباب نے اپنی اپنی جگہ اس کو بڑی ہی کثرت اور وسعت سے پھیلایا اور اس کا اظہار بھی متعدد مقامات پر کیا۔ ان کا تاثر یہ ہے کہ اگر اسے دل کے کانوں سے سن لیا جائے تو قرآنِ کریم اکثر و بیشتر پورے طور پر سمجھ میں آ جاتا ہے یا کم از کم دین کی تعلیمات' اقوال' اسلام کے بنیادی نظریات' قواعد' اور پیام' انسان کے سامنے آ جاتا ہے۔ اس لیے اس درس کے یہ کیسٹس عام طور پر مختلف مقامات پر بہت زیادہ سنائے گئے اور سنائے جاتے رہے ہیں۔ بعض مقامات سے اطلاع آئی کہ ان کے پرانے ہونے کی وجہ سے اُن کی آواز کچھ تھوڑی سی مفقود ہو گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ میں ان درسوں کو یعنی سورۃ فاتحہ کی تفسیر کو' جو میں نے درسوں میں بیان کی تھی' اب از سرِ نو ریکارڈ کر دوں تاکہ آواز میں جو کھنکی پیدا ہو گئی تھی' وہ دور ہو جائے۔

سورۃ فاتحہ کی تفسیر کا از سرِ نو آغاز

ان احباب کے تقاضے کی تعمیل میں' میں ان درسوں کو از سرِ نو ریکارڈ کر رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ دروس تو صرف ٹیپس پر ریکارڈ ہوئے تھے' یہ کہیں پورے طور پر لکھے نہیں گئے تھے کہ انہی کو پڑھ کر میں ریکارڈ کرتا چلا جاؤں۔ یوں سمجھیے کہ میں از سرِ نو سورۃ فاتحہ کی تفسیر ان درسوں کے ذریعے سے بیان کروں گا۔ اصولی طور پر تو یہ وہی ہو گی جو کچھ میں نے پہلے پیش کیا تھا' لیکن ظاہر ہے کہ تفسیر کے اعتبار سے اس میں کہیں کچھ کمی اور کہیں کچھ بیشی آ جائے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ کمی کچھ کم ہو گی اور بیشی شاید کچھ زیادہ لیکن 1968ء کے بعد اس گیارہ سال کے عرصے میں بہر حال قرآن کے متعلق میرا فہم' میری بصیرت' کچھ پہلے سے زیادہ ہی ہو گئی ہے' فکر میں بھی کچھ زیادہ عمق آ گیا ہے۔ اس لیے بعض مقامات پر اس میں ایسے نئے نکات بھی آئیں گے جو پہلے درسوں میں نہیں آ سکے تھے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ اس سلسلۂ نو کو جو میں اسی سورۃ کی تفسیر کے سلسلے میں' ان درسوں کے ذریعے آغاز کر رہا ہوں' ان تمام احباب تک پہنچانے کے لیے مجھے توفیق عطا فرمائے۔ وَمَا تَوۡفِیۡقِیۡ اِلَّا بِاللّٰہِ الۡعَلِیِّ الۡعَظِیۡمِ

قرآن حکیم کی بعض بنیادی اصطلاحات کی اہمیت

اس زمانے میں بھی میں نے سورۃ فاتحہ کے درس کا آغاز کرنے سے پہلے ہی ایک تعارفی درس بھی پیش کیا تھا اور اس میں، میں نے بتایا تھا کہ قرآنِ کریم کیا ہے، اس کو کیسے سمجھا جاتا ہے، اسے کیسے سمجھایا جاتا ہے، اس کی بعض بنیادی اصطلاحات کا مفہوم کیا ہے؟ وہ ابتدائی تعارفی درس بھی بڑا ہی مقبول ہوا۔ اس لیے میں نے مناسب سمجھا ہے کہ انہی خطوط پر یہ تعارفی درس بھی دوبارہ ریکارڈ کر دیا جائے۔ اب وہ تعارفی درس پیش خدمت ہے۔

لفظ قرآن کا بنیادی مفہوم

سب سے پہلے صرف لفظ قرآن کو لیجیے۔ اس لفظ کا مادہ ''ق ر ء'' ہے۔ عربی زبان میں مادہ کسے کہتے ہیں، اور اس کی خصوصیت کیا ہوتی ہے، اس کے متعلق میں ذرا آگے چل کر عرض کروں گا۔ اس مادہ کے بنیادی معنی ہوتے ہیں ''جمع کرنا اور محفوظ رکھنا''۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جمع اور حفظ بھی تو عربی زبان کے ہی الفاظ ہیں اور خود قرآنِ مجید نے بھی انہیں اپنے ہاں استعمال کیا ہے تو پھر اس لفظ کے مادہ ''ق ر ء'' میں کیا خصوصیت ہے کہ قرآن کا لفظ اس مادہ سے لیا گیا، جمع یا حفظ سے نہیں لیا گیا۔ قرآنِ مجید کا ایک اعجاز لفظوں کے انتخاب میں ہے اور اس کا یہ انتخاب خود پکار کر کہہ دیتا ہے کہ

این کتابے نیست چیزے دیگر است

''ق ر ء'' کے معنی ہوتے ہیں ''کسی چیز کو اس طرح جمع اور محفوظ رکھنا جس طرح رحم مادر میں نطفہ محفوظ رکھا جاتا ہے''۔ ظاہر ہے کہ رحم میں نطفہ اس طرح محفوظ نہیں رکھا جاتا جس طرح مثلاً کسی تھیلی میں چند سکے محفوظ رکھے ہوں۔ وہ سکے جامد ہوں گے اور ویسے کے ویسے پڑے رہیں گے لیکن رحم میں نطفہ جامد نہیں ہوتا، اس میں بڑھنے، پھولنے، پھلنے، نشو ونما پانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم تمام نوعِ انسان کے لیے قیامت تک ضابطہ حیات ہے۔ اس لیے اس میں یہ صلاحیت ہونی چاہیے اور یہ صلاحیت ہے کہ یہ انسانی زندگی کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیتا چلا جائے، یہ ہر زمانے میں انسانی فکر کی امامت کا فریضہ سرانجام دے، یہ کاروانِ انسانیت کے لیے، ہر منزل میں چراغِ راہ ہو، یہ کسی مقام پر بھی یہ نہ کہہ دے کہ مجھ میں اب آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں رہی۔ ظاہر ہے کہ یہ مقام اسی ذات کو حاصل ہو سکتا ہے، جس میں علم انسانی کی نسبت سے بڑھنے اور پھولنے پھلنے کی صلاحیت ہو۔ یاد رکھیے کہ قرآنِ کریم کے احکام تو اپنے اپنے مقام پر محکم پہاڑ کی طرح اٹل ہیں، ان کے معانی اور مفہوم بھی خود قرآن نے متعین کر دیئے ہیں۔

یہ جو کچھ میں نے کہا ہے کہ اس میں علم انسانی کی نسبت سے بڑھنے، پھولنے پھلنے، آگے جانے کی صلاحیت ہو تو یہ اُن حقائق کے متعلق ہے جو قرآنِ کریم میں بیان ہوئے ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے کہ جسے خود قرآن نے ان حسین و بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے: **سَنُرِيْهِمْ**

ایٰـتِنَـا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْـفُسِهِـمْ حَتّٰـی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)۔اب یہ جو میں نے اس آیت کے آخر میں (41:53) کہا ہے اور یہی کچھ میں اس کے بعد بھی کہتا چلا جاؤں گا تو آپ سمجھ لیجیے کہ اس کے معنی کیا ہیں۔ یہ (41:53) اس آیت کا حوالہ ہے جو میں نے ابھی تلاوت کی ہے یا اسی طرح جو آگے تلاوت کروں گا' یہ ان کے حوالے ہوں گے۔ میں اس طرح حوالے دیا کرتا ہوں کہ پہلے سورۃ کا نمبر ہوتا ہے اور اس کے بعد آیت کا نمبر ہے مثلاً: (41:53) کے معنی یہ ہیں کہ یہ قرآنِ کریم کی اکتالیسویں سورۃ کی ترپین آیت ہے تو یہ آیت جو میں نے ابھی پیش کی ہے' اس میں قرآن نے کہا تھا کہ سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰـی یَتَبَیَّـنَ لَهُـمْ اَنَّـهُ الْحَقُّ (41:53)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نوعِ انسان کو اپنی نشانیاں عالمِ انفس و آفاق میں دکھاتے چلے جائیں گے تاآنکہ یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے کہ قرآن نے جو کچھ کہا ہے' وہ حق و صداقت پر مبنی ہے۔یعنی جوں جوں انفس و آفاق میں پوشیدہ حقیقتیں بے نقاب ہوتی جائیں گی' قرآن کی صداقت مزید نکھر اور اُبھر کر سامنے آتی جائے گی' انسانی علم کی ہر تحقیق اور سائنس کا ہر یقینی انکشاف قرآنی دعاوی کی شہادت بنتا چلا جائے گا۔ دوسرے مقام پر اس نے کہا ہے کہ اِنْ هُـوَ اِلَّا ذِكْـرٌ لِّـلْـعٰـلَـمِیْـنَ (38:87) یہ عالمگیر انسانیت کے لیے ضابطہ ہدایت ہے' اس لیے وَلَتَعْـلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِیْنٍ (38:88) اس میں بیان کردہ حقائق' سب کے سب' ایک ہی وقت میں سامنے نہیں آجائیں گے۔ یہ کچھ وقت کے بعد' بے نقاب ہوں گے اور ہوتے چلے جائیں گے۔

یہ ہے لفظ قرآن کی' مادہ کے اعتبار سے خصوصیت۔ بعض ماہرین لغت کا خیال ہے کہ یہ لفظ قرآن عبرانی ہے اور اس کے معنی ہیں اعلان عام' جسے انگریزی میں Proclamation (اعلامیہ) کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے قرآن کے معنی ہوں گے ''مملکت خداوندی کا اعلامیہ''۔ وہ جو عام طور پہ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے یہ آیت نازل ہوئی تھی: اِقْـرَاْ بِـاسْـمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (96:1) تو اس کے معنی ہوں گے: اٹھ اور دنیا میں اس خدا کی عالمگیر ربوبیت کا اعلانِ عام کر دے جس نے کائنات اور انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ یہ اس حقیقت کا اعلان ہے کہ انسانوں کی ربوبیت یعنی نشوونما' انسانوں کے ہاتھ میں نہیں رہے گی' یہ اس خدا کے نظام کی تحویل میں رہے گی' جس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اور ان کی نشوونما کا ذمہ لیا ہے۔ سوچیے' عزیزانِ من! کیسا انقلاب آفریں ہے خدا کا یہ اعلان' جو اس روایت کی رو سے ہے کہ سب سے پہلی آیت یہ ہے جسے سب سے پہلے عالم انسانیت میں عام کیا گیا۔

خدا تعالیٰ نے قرآنِ حکیم کو ضابطہ حیات کے معنی میں کتاب بھی کہا ہے

اب آگے چلیے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کو کتاب بھی کہا ہے۔ اس لفظ کا مادہ ''ک ت ب'' ہے' جس کے معنی ''حکم دینے یا کسی بات کو واجب قرار دینے کے ہیں''۔ مثلاً قرآنِ مجید میں کتب علیکم الصیام (2:103) تم پر روزے فرض قرار دیئے گئے ہیں۔ کتب علیکم القتال (2:216) تم پر عندالضرور جنگ کرنا قانوناً لازم قرار دیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے کتاب کے معنی ''ضابطہ قانون''

کے ہوں گے۔ قرآنِ کریم نے اس لفظ کو ان معانی میں خود استعمال کیا ہے۔ مثلاً سورۃ النساء میں پہلے تفصیلاً بتایا گیا ہے کہ قانونِ خداوندی کی رو سے کون کون سے رشتے تم پر حرام ہیں اور اس کے بعد کہا ہے کہ **كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ** (4:24) یہ تمہارے لیے خدا کا قانون ہے۔ اسی جہت سے قرآن کے متعلق کہا کہ **فِيۡهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ** (98:3) اس میں نہایت محکم قوانین ہیں۔ لہٰذا قرآنِ کریم کو جب کتاب کہا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ "اس میں قوانین خداوندی دیئے گئے ہیں"۔

اس مقام پر، عزیزانِ من! ضمناً ایک نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ دنیا میں قوانین یا Laws دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک وہ جنہیں قوانین فطرت یا Laws of Nature کہا جاتا ہے اور دوسرے وہ جن کا تعلق خود انسان کی اپنی ذات اور اس کی تمدنی زندگی سے ہوتا ہے۔ قوانین فطرت کے متعلق ہر صاحبِ علم یعنی Scientist (سائنسدان) اس کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ انسانوں کے بنائے ہوئے نہیں ہیں۔ ایک بہت بڑے سائنسدان کے الفاظ میں یہ یوں ہے کہ "ہم کتابِ فطرت کو پڑھتے ہیں، اسے لکھتے نہیں ہیں"[1] یعنی فطرت کے قوانین انسانوں کے بنائے ہوئے نہیں ہیں۔ وہ موجود ہیں۔ ہم صرف ان کو سمجھتے ہیں، ان کا انکشاف (Discover) کرتے ہیں۔ جہاں تک دوسری قسم کے قوانین کا تعلق ہے، تو ان کے متعلق یہ سمجھیے کہ یہ وہ قوانین ہیں جن کا تعلق خود انسان کی اپنی ذات اور اس کی تمدنی زندگی سے ہے۔

انسانوں کے بنائے ہوئے معاشرتی قوانین فوز و فلاح کے حامل نہیں ہو سکتے

مغرب کے سیکولر نظام (Secular System) کی عمارت اس مفروضے پر استوار ہوتی ہے کہ انسانوں کو حق حاصل ہے کہ وہ ان قوانین کو خود وضع کریں یعنی انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین انسانوں پر نافذ کیے جائیں، لیکن قرآن کا دعویٰ ہے کہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے تحت انسانی معاشرے کو فوز و فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔ ان قوانین کے بنیادی اصول اور مستقل اقدار بھی قوانین فطرت کی طرح خدا ہی کی طرف سے ملنے چاہئیں۔ یہ اصول و اقدار وحی کی روح سے ملتے ہیں اور اب قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ قرآن نے جہاں انسانی زندگی سے متعلق قوانین کو کتاب اللہ سے تعبیر کیا ہے، وہاں اس نے قوانینِ فطرت کے لیے بھی یہی اصطلاح استعمال کی ہے۔ مثلاً سورۃ توبہ میں ہے کہ **اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوۡرِ عِنۡدَ اللّٰهِ اثۡنَا عَشَرَ شَهۡرًا فِىۡ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوۡمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ** (9:36) یہ حقیقت ہے کہ کتاب اللہ کی رو سے مہینوں کی تعداد بارہ ہے اور یہ اس زمانے سے مقرر ہے جب خدا نے ارض

---

[1] اس سائنسدان کا نام Sulivan (سلیوان) ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: We only read the Book of Nature, we Can`t write it (ہم صحیفہ فطرت کو پڑھ سکتے ہیں، لکھ نہیں سکتے)۔ اس کی تشریح کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 29 (مکمل)، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور 2006ء ص ص۔ 510 تا 312۔

وسمٰوات کو پیدا کیا تھا۔ یعنی جتنی مدت میں زمین سورج کے گرد پورا چکر کاٹتی ہے وہ ایک سال کا عرصہ ہوتا ہے اور اس عرصہ کو بارہ پر تقسیم کر کے مہینوں کا شمار کیا جاتا ہے۔ اس تقسیم کی رو سے، ہر سال کا ہر مہینہ، سابقہ سال کے اس مہینے کے مطابق ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کی وضاحت کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی؟ اس کے متعلق میں متعلقہ مقام پر وضاحت کروں گا۔ اس وقت صرف یہ سمجھیے کہ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ بات قانونِ فطرت کی ہو رہی تھی یعنی اللہ تعالیٰ نے قانونِ فطرت کو بھی کتاب اللہ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے بعد کہا ہے کہ **مِنۡهَآ اَرۡبَعَةٌ حُرُمٌ** (9:36) ان بارہ میں سے چار مہینے ایسے ہیں جن میں جنگ ممنوع قرار دی گئی ہے۔ یہ قانون انسانی معاشرہ سے متعلق ہے، فطرت سے نہیں ہے اور اس کے بعد ہے کہ **ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ** (9:36) یہ خدا کا دینِ قیم ہے یعنی قوانینِ فطرت اور انسانی زندگی سے متعلق قوانین دونوں کے مجموعے کا نام الدین ہے۔ اور یہی دینِ قیم ہے، یہی دین محکم ہے، خدا کی طرف سے دیا ہوا ہے۔

برادرانِ عزیز! ان تصریحات سے واضح ہے کہ کتاب اللہ کے دو حصے ہیں: ایک صحیفہ فطرت ہے، جو خارجی کائنات میں بکھرا پڑا ہے اور دوسرا صحیفہ وحی ہے، جس کا محفوظ اور مکمل مجموعہ قرآنِ کریم ہے۔

قوانینِ فطرت سے اعراض کا نتیجہ جہنم ہے

قرآنِ کریم کی رو سے یہ دونوں قوانین خدا کی طرف سے عطا کردہ ہیں اور دونوں کی پابندی ضروری ہے۔ قوانینِ فطرت کی پابندی سے فطرت کی قوتیں مسخر (Harness) ہو جاتی ہیں اور قوانینِ وحی کی پابندی سے یہ قوتیں انسانی ذات کی نشو و ارتقاء اور عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے صرف کی جاتی ہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک ضابطہ قوانین سے بھی اعراض برتا جائے، تو زندگی کا اعتدال قائم نہیں رہتا اور کاروانِ انسانیت منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ اگر قوانین فطرت سے اعراض برتا جائے تو دین مذہب میں تبدیل ہو کر **خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا** (2:85) دنیاوی زندگی میں ذلت و خواری کا موجب بن جاتا ہے اور اگر مستقل اقدارِ خداوندی سے اعراض برتا جائے، تو دنیا اس جہنم میں گرفتار ہو جاتی ہے جس کے شعلے آج تمام اقوامِ عالم کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہیں۔ اس روشِ زندگی کو قرآنِ کریم نے کتاب کے ایک حصے پر ایمان اور دوسرے حصے سے کفر سے تعبیر کیا ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے کہ **اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡکِتٰبِ وَ تَکۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ** (2:85) کیا یہ لوگ کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے اور دوسرے حصے سے کفر برتتے ہیں، بلکہ اس میں تو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ کیا تم لوگ ایسے ہو کہ تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے سے کفر برتتے ہو، تو یاد رکھو! کہ **فَمَا جَزَآءُ مَنۡ یَّفۡعَلُ ذٰلِکَ مِنۡکُمۡ اِلَّا خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا ج وَیَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ یُرَدُّوۡنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الۡعَذَابِ ط** (2:85) جو ایسا کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو گا کہ دنیا کی زندگی میں ذلت و خواری اس کے حصے میں آئے گی اور قیامت میں وہ شدید ترین عذاب میں مبتلا ہو گا۔

انسانی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کرنا کفر ہے

تاریخِ انسانیت اس حقیت پر شاہد ہے کہ تسخیرِ فطرت اور مستقل اقدار کو جب بھی الگ الگ رکھا گیا' اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہ نکلا۔ انسانی زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت (Indivisible Unit) ہے۔ اسے مختلف حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ کتاب میں تفریق کا ایک پہلو تو یہ ہے' جس کی طرف میں نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے یعنی قوانینِ فطرت اور مستقل اقدار میں مُغَایَرَت [1] پیدا کرنا۔ دوسرا گوشہ یہ ہے کہ خود قرآنِ کریم کے ایک حصے پر عمل کرنا اور دوسرے سے اعراض برتنا۔ اس کا نتیجہ بھی ذلت وخواری کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ہم نے صدیوں سے یہی روش اختیار کر رکھی ہے اور اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھیے کہ **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ** (2:183) اور **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ** (2:216) دونوں یکساں احکامِ خداوندی ہیں' لیکن ہم **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ** (2:183) پر تو اس شدت سے عمل پیرا ہوتے ہیں لیکن **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ** (2:216) کو اپنی زندگی سے یکسر خارج کر رکھا ہے حالانکہ مومن کی ساری زندگی مجاہدانہ عسکریت کی زندگی تھی۔ روزوں پر زور اور عسکری تربیت سے اجتناب' یہ کتاب کے ایک حصے پر ایمان اور دوسرے حصے سے کفر کے مترادف نہیں تو اور کیا ہے۔

الحاد

اتنا ہی نہیں کہ کتاب کے ایک حصہ پر عمل اور دوسرے سے مجرمانہ تغافل! قرآن کریم تو یہاں تک بھی کہتا ہے کہ کسی ایک قانون یا صفتِ خداوندی کی پابندی میں اس قدر شدت اختیار کر لینا کہ اس سے دوسرے قوانین یا صفاتِ الٰہیہ نظر انداز ہو جائیں' تو اس کا نتیجہ بھی خوشگوار نہیں نکل سکتا۔ ایک جگہ اس نے کہا ہے کہ **اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا** (41:40) جو لوگ ہمارے قوانین میں ایک طرف نکل گئے ان کی یہ روش ہماری نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ دوسرے مقام پر ہے کہ **وَ ذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ** (7:180) جو لوگ صفاتِ خداوندی میں سے کسی ایک صفت کو لے کر اس میں ایک طرف دُور تک نکل جائیں' تم ان سے کنارہ کشی کرو۔ مثال کے طور پر یہودی اور ہندو خدا کی صفتِ عدل میں اس قدر متشدد ہو گئے کہ انہوں نے لغزش خوردہ انسانوں کے لیے بازآفرینی کا کوئی دروازہ ہی کھلا نہ رہنے دیا۔ دوسری طرف عیسائیت' اس کی صفتِ رحیمیت میں اس قدر متشدد ہو گئی کہ اس نے زندگی سے عمل کو یکسر خارج کر دیا اور ہر بات کو خدا کا رحم اور Grace پر منحصر قرار دے دیا۔ قرآنِ کریم کی رو سے وہ روش بھی غلط تھی اور یہ بھی غلط۔ صحیح روش وہی ہے جو ان قوانین وصفات کی پابندی میں' صحیح تناسب وتوازن لیے ہوئے' انہیں علیٰ حدِ بشریت' اپنے اندر منعکس کرے اور

---

[1] غیریّت' بے گانگی

عملی زندگی میں انہیں معیار قرار دے۔ اس وقت میں صرف انہی اشارات پر اکتفا کرتا ہوں تفصیل اس اجمال کی اپنی اپنی جگہ آپ کے سامنے بعد میں آتی رہے گی۔

قرآن حکیم کے علاوہ دنیا میں کوئی کتاب بھی بغیر سوچے سمجھے نہیں پڑھی جاتی

قرآنِ کریم کو کتاب کہنے سے اس حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرانا بھی مقصود تھا کہ یہ ایک کتاب ہے اور جس طرح تم کسی کتاب کو پڑھتے ہو اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہو' اسی طرح اسے بھی پڑھو اور اس سے مستفید ہو۔ آپ سوچیے کہ اگر آپ کو کوئی ایسی کتاب دے دی جائے' جس کی زبان سے آپ ناواقف ہوں' تو آپ اس کتاب کو کبھی نہیں پڑھتے حتیٰ کہ اگر اُس کی زبان مشکل ہو' تو آپ اس کے دو چار صفحے پڑھ کر الگ رکھ دیتے ہیں کہ اس کا معیار میری علمی سطح سے اونچا ہے۔ اگر اس کتاب کا پڑھنا آپ کے لیے ضروری ہے تو آپ اس کی زبان سیکھتے ہیں اور اپنے اندر اتنی استعداد پیدا کرتے ہیں' جس سے وہ کتاب سمجھ میں آجائے۔ آپ کبھی یہ نہیں کرتے کہ آپ وہ کتاب پڑھتے جائیں خواہ وہ آپ کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ دنیا کی کسی کتاب کے ساتھ آپ یہ نہیں کرتے لیکن اس میں ایک استثناء (Exception) ہے اور وہ ہے قرآنِ کریم۔ اس کے متعلق یہ عقیدہ وضع کر لیا گیا کہ اس کی زبان آتی ہو یا نہ آتی ہو' اسے پڑھتے رہنا چاہیے' اس سے ثواب حاصل ہوتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا ہے کہ دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے' جسے اس شدت اور کثرت سے پڑھا جاتا ہو' اور اس کے ساتھ ہی دنیا کی کوئی اور کتاب ایسی نہیں جسے بے سمجھے پڑھا جاتا ہو۔

قرآنِ حکیم کے خلاف ایک گہری سازش

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو قرآنِ کریم سے دور رکھنے کے لیے یا یوں کہیے کہ قرآن کو ان کی نگاہوں سے اوجھل کرنے کے لیے یہ ایک بڑی گہری [1] سازش تھی' جسے تقدس (Sacred) کا لباس پہنا کر مزین بنا دیا گیا۔ یوں قرآن کتاب نہ رہا۔ معاف رکھیے' جنتر منتر (Mumbo Jumbo) کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔ کتاب اور جنتر منتر میں فرق یہ ہوتا ہے کہ کتاب کے الفاظ سمجھ کر پڑھے جاتے ہیں اور جنتر منتر کے الفاظ بلا سمجھے دہرائے جاتے ہیں' یہاں تک کہ قرآن کے الفاظ کے تعویذ لکھے جانے لگے' اس کی آیات کے ورد ہونے لگے اور اس کا نام رکھا گیا ''اعمالِ قرآنی'' اور ایسا کرنے والا کہلانے لگا ''عامل''۔ سوچیے کہ ہم اس کتاب کے ساتھ کیا کر رہے ہیں؟ یاد رکھیے! جب تک مسلمان قرآن کو کتاب نہیں سمجھتا' وہ اس سے کچھ فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔

---

[1] قرآنِ کریم کے خلاف مزید سازشوں (Conspiracies) کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء' ص ص 221 تا 242۔

قرآنِ حکیم نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں ہی مدون شکل میں موجود تھا

برادرانِ عزیز! یہاں ایک اور نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقرہ کے شروع میں کہہ دیا تھا کہ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ (2:2) یہ ایک ''کتاب'' ہے۔ عربوں کے ہاں کتاب کا لفظ اس وقت بولتے تھے جب ''منتشر اجزاء کی شیرازہ بندی کر کے اُن میں لوہے کا کڑا (Iron Ring) پرو دیا جاتا تھا یا سلائی کر دی جاتی تھی''۔ قرآن کو الکتاب کہنے سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ صحیفۂ مقدسہ حضورِ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں ایک مرتبہ اور مدوّن کتاب کی شکل میں موجود تھا، جس کی شیرازہ بندی بھی ہو چکی تھی۔ سورۃ الطّور میں ہے کہ وَالطُّوْرِ o وَکِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ o فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (52:1-3) قرآن سطروں میں لکھی ہوئی کتاب تھی۔ پہلے اسے منتشر اوراق پر لکھا جاتا تھا اور بعد میں اس کی شیرازہ بندی کی جاتی تھی۔

عربوں کے ہاں ہرن کی کھال چھیل کر اسے (چرمی کاغذ) Parchment[1] کی شکل میں، قرطاس بنا لیتے۔ اسے رَقّ کہا جاتا تھا۔ جن تحریروں کو محفوظ رکھنا مقصود ہوتا، انہیں اس پر قلم بند کر لیتے تھے۔ جہاں تک کاتبین وحی کا تعلق ہے، سورۃ عبس میں ہے کہ قرآن کی کتابت بڑے باعزت اور قابلِ اعتماد کاتبوں نے کی تھی (80:15-16)۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ روایات جن میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں قرآن جمع اور مدوّن نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی تدوین بعد میں منتشر ٹھیکریوں، ہڈیوں اور پتوں کی مدد سے حضرت ابوبکر صدیق (632-634) یا حضرت عمر فاروق (634-645) یا حضرت عثمان غنی (645-656ء) رضی اللہ عنہم کے زمانے میں ہوئی تھی، وضعی ہیں، جنہیں قرآن کی اہمیت اور خصوصیت کو نظروں سے گرانے کے لیے اختراع کیا گیا ہے۔ قرآن حضورؐ کے زمانے میں، حضور ﷺ کی زندگی میں ہی، اسی شکل میں مرتب، مدوّن، قرطاس پر موجود تھا، جس شکل میں آج ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔ اس میں ایک لفظ بھر کی کمی بیشی کہیں نہیں ہوئی۔ اسی مرتب اور مدوّن کتاب کے متعلق کہہ دیا گیا کہ یہ کتاب مکمل ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا: وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ط لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ ج (6:116)۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ خدا نے اسے نازل کیا ہے اور وہ خود اس کی حفاظت کا ذمے دار ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ (15:9)۔ خدا نے اس کی تصریح فرما دی کہ قرآنِ

---

[1] Parchment: بھیڑوں، بکریوں، میمنوں یا بچھڑوں کی کھال جسے اس طرح تیار کیا جائے کہ اس پر لکھا جا سکے۔ (حوالہ ڈاکٹر جمیل جالبی (مدیر): قومی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1992، ص1412) نیز......

The skin of a sheep, or goat, prepared for writing or painting upon A written text. stiff, durable paper made in imitation of the material. Pergamum in Western Turkey (where it was first used as a substitute for Papyrus) (Ref. Reader`s Digest (1990) Universal aictionary. London: The Readers Digest Association Limited. pp.1124-1125)

کریم ایک مرتب کتاب کی شکل میں رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں موجود تھا۔ یہ ہر طرح سے مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی اور یہ بھی کہ یہ قیامت تک کے لیے محفوظ رہے گا۔

ختمِ نبوت

برادرانِ عزیز! اس سے آپ، علاوہ دیگر امور، اس حقیقت کو بھی دیکھ لیں گے کہ قرآنِ کریم نے ختمِ نبوت کی حقیقت کو کس طرح واضح کر دیا ہے۔ جب ایک ایسا ضابطہ حیات ہو جو تمام نوعِ انسان کے لیے، قیامت تک کے لیے، مرتب اور محفوظ شکل میں دے دیا گیا ہو اور اس کے بعد اس میں کوئی تبدیلی بھی نہ کر سکتا ہو، تو ایسی کتاب کی موجودگی میں کسی نبی یا رسول کے آنے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ قرآن کی ابدّیت، اکملیّت، محفوظیّت اور عالمگیریّت خود ختمِ نبوت کی دلیل ہے۔ قرآن کی نص صریح کی روح سے کوئی نبی یا رسول بغیر کتاب کے نہیں آیا لہٰذا جب خدا کی طرف سے آخری کتاب دی جائے تو اس کا لانے والا خود بخود آخری رسول ہو جائے گا۔ اس لیے نبی اکرم ﷺ خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں اور اس کی کتاب آخری کتاب ہے جو قیامت تک کے لیے محفوظ ہے۔

قرآنِ حکیم کے لیے عربی زبان کی خصوصیات کی وضاحت

اب آیئے قرآن کریم کی زبان کے متعلق۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں کہا ہے کہ یہ کتاب بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ (26:195) ہے۔ یعنی اس کتاب کی زبان عربی مبین ہے اور دیگر مقامات پر بھی اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ یہ کتاب عربی مبین میں نازل ہوئی ہے۔ خود لفظ عربی کے معنی بھی ''فصیح اور واضح کے ہیں''، اور جب اس کے ساتھ ''مبین'' کا اضافہ کر دیا جائے تو اس کے واضح تر ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔ یہ کتاب واضح ہے اور غَيْرَ ذِىْ عِوَجٍ (39:28) ہے، یعنی اس میں کوئی پیچ وخم نہیں، ابہام نہیں، التباس نہیں: صاف، نکھری، سیدھی، واضح، کتابِ روشن، حتیٰ کہ قرآن کو نور بھی کہا گیا ہے، یعنی خود روشن اور دنیا کو روشن کرنے والی کتاب۔ جس طرح روشنی اپنے وجود کو یا اپنے آپ کو دکھانے کے لیے کسی اور روشنی کی محتاج نہیں ہوتی، اسی طرح قرآنِ کریم بھی اپنے مطالب ومفاہیم واقدار واصول وپیغام وتعلیم کو واضح کرنے کے لیے کسی خارجی روشنی کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی وضاحت ذرا آگے چل کر آئے گی۔

قرآنِ حکیم صرف اپنے الفاظ میں ہی قرآنِ حکیم ہے

جہاں تک عربی زبان کا تعلق ہے، قرآنِ کریم کی زبان اس کے علاوہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی تھی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اصول یہ بتایا ہے کہ جس قوم کی طرف کوئی رسول بھیجا جاتا ہے، اُس رسول کا پیغام، اُسی قوم کی زبان میں ہوتا ہے۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ کے اوّلیں مخاطب عرب تھے اس لیے قرآنِ کریم انہی کی زبان میں آیا اور انہی کی زبان میں آنا چاہیے تھا لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مشیت کے پروگرام میں کچھ ایسا تھا کہ وہ زبان جس میں قرآن نازل ہونا تھا، ایسی جامع، عمیق اور وسیع ہو کہ وہ قرآنی حقائق کی متحمل ہو سکے۔ علم

الالسنہ کے ماہر بتاتے ہیں کہ اس باب میں دنیا کی کوئی زبان عربی زبان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

جب حضرت ابراہیم ◆ اپنے بیٹے حضرت اسماعیل ◆ کو ذبح کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے تو خدا نے انہیں بیٹے کے حلق پر چھری چلانے سے روک دیا اور کہا کہ ہم اسے ایک عظیم قربانی کے لیے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ حضرت اسماعیل ◆ حضرت ابراہیم ◆ کے بڑے بیٹے تھے اور باپ کی مملکتِ عظیم کا انہی کو وارث ہونا تھا لیکن حکم یہ دیا گیا کہ انہیں حجاز کی وادیٔ غیر ذی زرع میں بسایا جائے۔ غیر ذی زرع کہ جہاں کچھ اگتا ہی نہیں، جہاں کچھ ہوتا ہی نہیں۔ کہا کہ انہیں اس وادی میں بسایا جائے تا کہ یہ وہاں خانۂ خدا کی تولیت کا فریضہ سرانجام دیں اور مملکتِ شام کی سرداری حضرت اسحاق ◆ کو دے دی جائے۔ اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت اسحاق ◆ کی اولاد بنی اسرائیل، امورِ جہاں بانی میں مصروف رہی۔ اس کے حصے میں شوکتِ سلیمانی اور سطوتِ داؤدی آئی، لیکن بنی اسماعیل اسی وادیٔ غیر ذی زرع میں نہایت سادہ زندگی بسر کرتے رہے۔ انہوں نے نہ کوئی حکومت قائم کی اور نہ ہی کسی تہذیب وتمدن کی بنا ڈالی، یہ ایک ہی کام کرتے رہے یعنی عربی زبان کی تشکیل، تعمیر اور تہذیب۔ انہوں نے اس زبان کو اس مقام پر پہنچا دیا کہ دنیا کی کوئی زبان اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی۔

یہ ہمارا عقیدت مندانہ دعویٰ ہی نہیں بلکہ دنیا کے محققین پوری تحقیق وتفتیش کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ ڈاکٹر بک[1] (Dr. Bucke) نے اپنی مشہور کتاب Cosmic Consciousness میں مشہور مستشرق Max Muller کی تحقیقات کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''جس زمانے میں تمام انڈو یورپین زبانوں (Indo-European languages) میں مادی تصورات (Root Concepts) کی تعداد ایک سو اکیس (121) تک پہنچ پائی تھی، عربوں کے ہاں صرف اونٹ کے تضمنات میں پانچ ہزار سات سو چوالیس (5744) الفاظ موجود تھے۔ سوچیے، اس سے اس زبان کی وسعتوں کا اندازہ لگ سکتا ہے۔

عربی زبان کے مادوں کی تعداد 25 ہزار کے قریب ہے

عزیزانِ من! یہ عربی زبان بڑی سائنٹفک زبان ہے۔ اس میں ایک مادہ یعنی Root ہوتا ہے جو عام طور پر تین حرفوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس مادے کے معانی میں ایک بنیادی خصوصیت ہوتی ہے، جو ان تمام الفاظ میں جھلکتی چلی جاتی ہے، جو اس مادے سے مختلف ابواب میں بنائے جاتے ہیں۔ ان مادوں کی تعداد پچیس ہزار (25000) کے قریب ہے۔ آپ اندازہ لگا لیجیے کہ ان مادوں سے جو الفاظ بنائے گئے ہوں گے، ان کی تعداد کس قدر ہو گی، اور پھر اس میں دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مختلف ابواب ہیں، اوزان ہیں، ہر باب کی ایک الگ خصوصیت ہوتی ہے۔ یعنی ایک مادہ یا Root ہے، جس کی ایک متعین خصوصیت ہے۔ وہ خصوصیت ہر اس لفظ میں

---

[1] Richard maurice Bucke.

پائی جائے گی جو اس Root (مادہ) سے بنے اور پھر وہ الفاظ ان ابواب کے مطابق بنیں گے اور ہر باب کی ایک الگ خصوصیت ہو گی۔ اس لیے جو لفظ بھی آپ کے سامنے آئے' اس کے باب کو دیکھیے۔ اور اس کے Root (مادہ) کو دیکھیے۔ ان دونوں کو ملانے سے اس کا ایک متعین مفہوم آپ کے سامنے آ جائے گا۔ یہاں تک کہ یہ ترتیب اس مادے میں فلاں اور فلاں حرف اکٹھا آئے تو اس کی یہ خصوصیت ہو گی' یعنی جتنے بھی Roots (مادے) ایسے ہوں گے جن میں وہ دو حرف آ جائیں ان میں وہی خصوصیت ہو گی' جو ان دو حرفوں کے اکٹھے ہونے سے بتائی گئی ہے۔ اندازہ لگائیے کہ دنیا کی کوئی زبان بھی ایسی ہے جو اس کا مقابلہ کر سکتی ہو۔ یہ تھی وہ زبان جس میں قرآن نازل ہوا۔[1]

قرآنِ حکیم کی عربی زبان آسان ترین بھی ہے اور نہایت عمیق و وسیع بھی

پہلے تو یہی بات یہاں سے سمجھ میں آتی ہے کہ یہ زبان بڑی سائنٹیفک (Scientific) واقع ہوئی ہے۔ اس لیے اس کا سمجھنا بڑا آسان ہے۔ یہ جو اس زبان کو ہوّا بنا کر رکھ دیا گیا ہے تو یہ بھی ایک سازش ہے' جس کا مقصد یہ ہے کہ عام مسلمان قرآن کو براہِ راست سمجھنے نہ لگ جائے اور یہ خاص طبقے کی اجارہ داری رہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اگر آپ میں سے کسی نے عربی ادب پر حاوی ہونا ہو' تو وہ واقعی بڑی محنت بھی چاہتا ہے' بڑی وسعت و معلومات چاہتا ہے' تعلیم میں بھی بہت آگے بڑھنا پڑھتا ہے لیکن قرآنِ کریم تو اس قدر آسان عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے یعنی عجیب چیز ہے کہ زبان کے اعتبار سے اتنا جامع' اتنا وسیع' اتنا عمیق اور سمجھنے کے اعتبار سے اس قدر آسان! خود اس کا دعویٰ ہے کہ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ (54:16) یہ حقیقت ہے کہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے بڑا آسان بنایا ہے۔ دوسری جگہ ہے کہ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (41:3) یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات کو نکھار کر' الگ الگ کر کے' واضح طور پر' بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ قرآن اُن لوگوں کے لیے جو علم و بصیرت سے کام لیں' ایک واضح ضابطہ حیات بن گیا۔ یہ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (16:89) ہے یعنی جن امور کا ذکر اس میں کیا گیا ہے' انہیں بڑی وضاحت سے کھول کر بیان کیا گیا ہے۔

ان تصریحات سے ایک بات واضح طور پر سامنے آ جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے سمجھنے کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ اس میں جو الفاظ آئے ہیں' پہلے Roots[1] یا مادہ کی روح سے ان کے معانی متعین کیے جائیں اور پھر یہ دیکھا جائے کہ زمانہ نزول قرآن میں ان الفاظ کے معانی کیا لیے جاتے تھے۔ ایک لفظ کے Shape (شکل و ساخت) کے اعتبار سے کئی ایک معانی یا مفہوم ہوتے ہیں۔ دیکھنا

---

[1] ان نکات کی مزید تشریح و تبیین کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ انبیاء' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص 21-20' بالخصوص انہی صفحات کے فٹ نوٹ (1,2)20 اور (3-4)21۔

یہ ہوتا ہے کہ جس زمانے میں قرآنِ کریم نازل ہوا تھا عرب اس کے کیا معنی لیتے تھے۔

ہزار سال سے مرتب کی جانے والی لغات کی ایک بنیادی کمزوری

برادرانِ عزیز! قرآنِ کریم کا مفہوم اُسی صورت میں سمجھ میں آ سکتا ہے جب پہلے یہ معلوم ہو کہ زمانہ نزول قرآن میں عرب ان الفاظ کا جو قرآنِ کریم میں آئے ہیں کیا مطلب یا معنی لیا کرتے تھے۔قرآنِ کریم کے متعلق ہمارے ہاں اس ہزار سال میں اس قدر لکھا گیا ہے کہ اس سے کمروں کے کمرے بھر جائیں لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ قرآنِ مجید کا کوئی لغت ایسا نہیں جو اس انداز سے مرتب کیا گیا ہو۔یعنی جو چیز قرآن کے سمجھنے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے' وہ چیز ہمارے ہاں کے اس لٹریچر میں کبھی مرتب ہی نہیں ہوئی۔ لے دے کر ایک امام راغب اصفہانی[1] (متوفی قریب 502ھ) کی لغت ہے' جسے المفردات فی غریب القرآن کہتے ہیں لیکن وہ بڑا مختصر سا لغت ہے۔وہ اس نہج پر مرتب نہیں کیا گیا جس کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے۔[2]

لغت کے مرتب کرنے میں میری سعی وکاوش

قرآنِ کریم کا صحیح مفہوم سمجھنے کے راستے میں میری سب سے بڑی اور پہلی دشواری بھی یہی اسی قسم کے لغت کا فقدان تھا۔لہٰذا میرے لیے ایسا لغت مرتب کرنا یوں کہیے کہ میرے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔تنہا بے ساز وسامان کوئی رفیقِ کار نہیں' کوئی جماعت نہیں اور پھر غالبًا آپ احباب کو اس کا علم ہوگا کہ میں مرکزی حکومتِ ہند میں ملازم بھی تھا لیکن چونکہ مجھے قرآنِ کریم کے ساتھ عشق تھا اور عشق اس قسم کی خاراشگافیوں کو آسان بنا دیا کرتا ہے۔میں نے اللہ کا نام لے کر اس قسم کے لغت مرتب کرنے کا کام شروع کر دیا۔[2] اللہ تعالیٰ کا یہ فضل وکرم سمجھیے کہ میں برسہا برس کی محنت شاقہ کے بعد اس میں کامیاب ہوا اور میرا یہ لغت چار جلدوں میں چھپ کر شائع ہو چکا ہے اور بڑا ہی مقبول ہوا ہے کیونکہ یہ اپنے انداز کی منفرد ڈکشنری یا لغت ہے' جس کا کہیں دوسرا جواب نہیں ملتا۔اس پر میں بدرگاہِ رب العزت جس قدر بھی سجداتِ شکرانہ ادا کروں' کم ہیں۔اس لغت کی مدد سے قرآنِ کریم کے الفاظ کے صحیح معانی تو متعین ہو گئے۔

---

[1] Imam Raghib AL-Isphahani of Persia (1327-1409A.D) (He was) beheaded. (Re. Some Quranic Voices by Shabbir Ahmed, M.D. Florida, USA, Through Website sent on Saturday, April 01, 2006, 6:03pm on the Subject. 2: Analysis of Criticism Against Quran upholders (Questions/Answers): Website Islamdawn.

[2] مزید لغت کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ طٰہٰ' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور 2005ء ص ص 55-154 اور انہی صفحات کا فٹ نوٹ 2۔

بظاہر یہ نظر آئے گا کہ اس کے بعد قرآنِ کریم کی آیات کا ترجمہ کرنا بہت آسان ہو جائے گا یا بہت آسان تھا لیکن یہاں ایک اور دشواری شروع ہوئی۔

الفاظ کے معنی تو یہ کیے لیکن قرآنِ کریم تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک وحی کردہ کتاب ہے اور اس کے تو اعجاز ہی اس قسم کے ہیں کہ انسان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ بالآخر یہ کتاب کس انداز سے مرتب ہوئی ہے۔ اس کا انداز گرانقدر معجزانہ ہے۔ اس میں اس کے خاص اسلوب کو بنیادی دخل ہے۔ اس کی آیتوں کے اندر جو الفاظ آئے ہیں، ان کی ترتیب اور ترکیب تو کچھ اس انداز کی ہے کہ ان کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ بات میں محض اعتقاد کی بنا پر نہیں کہہ رہا بلکہ یہ وہ حقیقت ہے جسے ہم تو ایک طرف، مغرب کے بڑے بڑے مستشرقین، جو عربی زبان کے فاضل ہیں، وہ بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس کی زبان کا اسلوبِ بیان اس قسم کا ہے کہ اس کا ترجمہ دنیا کی کسی زبان میں ہو نہیں سکتا۔ H.A.R Gibb عربی زبان کا بہت بڑا فاضل ہے۔ اس کی ایک کتاب Modern Trends In Islam (اسلام میں جدید رجحانات) ہے۔ اس کا 1945 کا ایڈیشن میرے سامنے ہے۔ وہ اس کتاب میں لکھتا ہے کہ ''حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا...... جس طرح کسی بلند شاعری کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ وحی کی زبان ہی مختلف ہوتی ہے...... قرآنِ کریم کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرو تو اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ اس کے عربی زبان کے تراشے ہوئے نگینوں کے گوشوں کو جامع طور پر سامنے لانے کے بجائے، مترجم اپنے وضع کردہ ایسے الفاظ استعمال کرے گا جو اصلی الفاظ کی وسعت اور جامعیّت کو مقید کر دیں گے۔ ایسی آیات میں، جن میں عام واقعات یا قوانین و احکام مذکور ہوں، ترجمہ کا یہ نقص شاید زیادہ نقصان رساں نہ ہو لیکن، بایں ہمہ، جو مد و جزر، جو نشیب و فراز، جو بلندیاں اور گہرائیاں، جو لطافتیں اور باریکیاں، اور اس کے ساتھ جو جوش و خروش، اصل کتاب میں جلوہ فرما ہے، وہ ترجمہ میں کیا آسکے گا! ذرا اس صاف اور سیدھی سی آیت کو لیجیے: اِنَّا نَحۡنُ نُحۡیٖ وَ نُمِیۡتُ وَ اِلَیۡنَا الۡمَصِیۡرُ (50:43) اور انگریزی ہی نہیں، دنیا کی کسی زبان میں اس کا ترجمہ کر کے دکھایئے۔ اس کے چھ الفاظ میں، جو پانچ مرتبہ ''ہم (We) کی تکرار ہے، اسے کون سی زبان ادا کر سکے گی؟''

قرآن حکیم کے ترجمہ کی بجائے اس کا مفہوم بیان کرنے کی طرح ڈالی گئی

عزیزانِ من! قرآنِ کریم کے الفاظ کے معانی متعین کرنے کے بعد بھی اس کی آیات کا ترجمہ کرنا میرے لیے کیا، کسی کے بھی بس میں نہ تھا۔ لہٰذا میں نے ترجمے کے بجائے قرآنِ کریم کا مفہوم لکھا۔ اس کا نام ہے ''مفہوم القرآن''۔ میرا یہ ''مفہوم القرآن''، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے الحمد سے والناس تک مسلسل تیس پاروں کا مفہوم ہے۔ اور وہ نہایت حسن و خوبی سے شائع ہو چکا ہے۔ اسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے، وہ متفقہ طور پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس سے قرآنِ کریم کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں رہتی۔

قرآنِ حکیم کی وضاحتوں کے بارے میں ارشادِ خداوندی

یہ کچھ تو قرآنِ کریم کی آیات کے مفہوم کے متعلق تھا جب کہ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم کا ایک اور اہم باب بھی ہے جو اس نازل کرنے والے خدا نے کہا ہے کہ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (75:19) قرآن کی وضاحت خود ہمارے ذمے ہے۔ اس کے لیے طریق کیا اختیار کیا گیا ہے' یہ بات غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔ قرآن کا انداز عام کتابوں جیسا نہیں۔ عام کتابوں کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اس میں وہ کتاب مختلف ابواب میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔ ہر باب کا ایک خاص موضوع ہوتا ہے اور اس موضوع سے متعلق تعلیم اس باب کے تحت مربوط طور پر دے دی جاتی ہے یعنی جب ایک باب ختم ہوتا ہے تو جو کچھ اس موضوع کے متعلق کہنا مطلوب و مقصود ہے' وہ اس باب کے اندر آ جاتا ہے۔ قرآن اس طرح کی تصنیف کردہ کتاب نہیں۔ یہ یوں سمجھیے کہ جیسے تئیس سال میں عطا فرمودہ مختلف خطبات کا مجموعہ ہو۔ اس میں ایک بات ایک مقام پر آئی ہے۔ اس کی مزید وضاحت دوسرے مقام پر ہے' تفسیر کسی اور جگہ ہے' استثناء کسی اور سورت میں ہے۔ نیز مختلف حقائق کو مختلف واقعات کے ضمن میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ اسے تصریفِ آیات سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی آیات کو پھیر پھیر کر لانا۔ سورۂ انعام میں ہے کہ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (6:105)۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن میں مختلف آیات کو پھیر پھیر کر اس لیے لایا گیا ہے کہ بات اس طرح واضح ہو جائے جیسے چھلکا اور مغز الگ ہو جاتے ہیں اور یوں بات نکھر اور ابھر کر سامنے آ جائے۔ اس کے بعد یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے سمجھنے کے لیے دو بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک محاورۂ عرب یعنی نزولِ قرآن کے زمانے میں عربی زبان کے ان الفاظ کا جو قرآن میں استعمال ہوئے ہیں' وہ مفہوم' جو عرب لیتے تھے' اس سے واقفیت۔ دوسری بات قرآنِ کریم پر اتنا عبور ہو کہ جو بات کسی ایک آیت میں کہی گئی ہے یہ چیز بیک وقت آپ کے سامنے آ جائے کہ اس کے متعلق قرآن کے دیگر مقامات میں کیا آیا ہے۔

قرانِ حکیم کے انسائکلو پیڈیا یا تبویب کی اہمیت اور اس کی تیاری کا مرحلہ

جس طرح قرآنِ کریم کے الفاظ کے متعلق بیان کیا گیا ہے' اس قسم کا بھی کوئی لغت پہلے سے موجود نہیں تھا۔ قرآنِ کریم کے اس انداز کو آپ انسائیکلو پیڈیا کہیے کہ عربی زبان میں اسے تبویب [1] کہتے ہیں' یعنی باب کرنا قرآنِ کریم کے متعلق اس قسم کی بھی کوئی کتاب اس سے پہلے موجود نہیں تھی' یعنی ایسی کتاب جو ہر اس موضوع کے متعلق بیک وقت بتا دے جو آپ کے ذہن میں آئے کہ قرآنِ کریم میں

---

[1] قرآنی موضوعات کو تبویب کی شکل میں پیش کرنے کے موضوع کے متعلق مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء' ص ص 170 تا 171۔

یہ موضوع کس کس مقام میں آیا ہے' اس کے متعلق کیا کیا آیا ہے' وضاحت کہاں ہے' اضافہ کہاں ہے' استثنا کہاں ہے' تشریح مزید کہاں ہے' براہِ راست یہ کچھ کہاں کہاں کہا گیا ہے یا کسی واقعہ کے ضمن میں یہ کچھ کس کس جگہ ہے۔ یہ تمام چیزیں بیک وقت سامنے آ جائیں اور غور فرمایئے عزیزانِ من! کہ یہ مرحلہ پہلے سے بھی زیادہ دشوار گزار اور محنت طلب تھا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر اس تبویب یا انسائیکلوپیڈیا کا بھی آغاز کر دیا اور اس کے فضل و کرم سے اس میں اس طرح کامیاب ہوا کہ میری تبویب القرآن' قریباً دو ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی یہ کتاب شائع ہو کر بڑی ہی مقبول ہو چکی ہے۔ [1]

اب آپ سوچ لیجیے کہ قرآنِ کریم کے سمجھنے کے لیے جو کچھ میں نے کیا ہے' وہ کس قدر محنت طلب مرحلہ تھا۔ پہلے جس انداز سے سمجھا اور پھر اس کو سمجھانے کا جو انداز ہے' اس کے لیے لغات القرآن ہے یہ لغات القرآن صرف قرآنِ کریم کے الفاظ کے وہ معانی بتاتا ہے' جو زمانہ نزولِ قرآن میں عرب لیتے تھے' پھر ان معانی کی رو سے سارے کے سارے قرآن کا مفہوم مرتب کیا اور قرآن کے موضوعات کے متعلق اس قسم کی تبویب کا انسائیکلوپیڈیا ترتیب دیا کہ جو موضوع آپ کے سامنے آئے' آپ کو بیک وقت معلوم ہو کہ قرآن میں اس کے متعلق کیا کیا آیا ہے۔ ان چیزوں کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کو صحیح طور پر سمجھنے کی کسی اور چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

قرآنِ حکیم پر غور و فکر کی شرط ہر دَور کے لیے لازم ہے

عزیزانِ من! ان دونوں شرطوں سے زیادہ اہم ایک اور شرط بھی ہے اور وہ ہے تدبر فی القرآن (4:82) یعنی قرآنِ کریم کے سمجھنے میں غور و فکر سے کام لینا۔ آپ قرآنِ کریم کے ورق الٹیے' قریب قریب ہر صفحہ پر آپ کو علم و بصیرت اور عقل و شعور سے کام لینے اور غور و فکر کرنے کی تاکید ملے گی۔ تدبر کا حکم نہ کسی خاص فرد کے لیے ہے' نہ کسی خاص زمانے کے لیے ہے' وہ تمام افراد کے لیے اور تمام زمانوں کے لیے ہے۔ اس لیے قرآن کو تقلیداً سمجھا ہی نہیں جا سکتا' نہ ہی کسی ایک فرد کا تدبر و تفکر دوسرے کے لیے سند اور حجت ہو سکتا ہے۔ یعنی اس طرح سے نہیں ہے کہ کسی خاص زمانے میں' کسی خاص فرد نے' جو قرآنِ مجید کی کوئی تفسیر لکھ لی' وہی ہمارے لیے بھی کافی ہو گئی۔ ایسا نہیں ہے۔ یہ ہر زمانے کے مسلمان کو' ہر زمانے کے انسان کو' دعوت دیتا ہے کہ وہ خود قرآنِ کریم پر غور و فکر کرے۔ اس لیے کسی ایک فرد کا تدبر اور تفکر دوسرے کے لیے سند اور حجت نہیں ہو سکتا۔

قرآنِ حکیم سے استفادہ کرنے والے کے لیے وقت کے تقاضوں سے آگاہ ہونا بھی ضروری ہوگا

قرآنِ کریم پر غور کرنے والے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے زمانے میں جس سطح تک علمِ انسانی پہنچ چکا ہے' اس پر اس کی

---

[1] ان کی مزید تشریح و وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان انتیسواں پارہ' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006ء

نگاہ ہو۔قرآن انسانی زندگی کے تقاضوں کا حل پیش کرتا ہے۔اگر کسی کو یہ ہی معلوم نہ ہو کہ اس کے زمانے کے انسانی تقاضے کیا ہیں، تو وہ قرآن سے کیا رہنمائی حاصل کر سکے گا۔اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ جس طرح ایک فرد کا تدبر فی القران دوسرے کے لیے سند اور حجت نہیں ہوسکتا، اسی طرح جو کچھ قرآن کے متعلق کسی ایک زمانے میں سمجھا گیا ہو، وہ بھی حرفِ آخر نہیں ہوسکتا۔ جوں جوں علمِ انسانی بڑھتا جائے گا، نت نئے قرآنی حقائق واضح ہوتے چلے جائیں گے۔

قرآنِ حکیم کی کسی بات میں بھی تضاد نہیں ہے

اب آگے چلیے۔قرآنِ کریم میں ہے کہ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (4:82) کیا ان لوگوں نے قرآن میں تدبر نہیں کیا؟ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ لوگ اس میں کئی اختلاف پاتے۔یعنی قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں کہیں اختلاف نہیں اور یہ چیز اس کے من جانب اللہ ہونے کی ایک دلیل ہے۔ ہمارے ہاں عام طور کہا جاتا ہے کہ قرآن کے الفاظ میں تو کوئی اختلاف نہیں یعنی جتنے بھی قرآن کے نسخے ہیں، ان میں متن (Text) ایک ہی جیسا ہے، اس میں کوئی اختلاف کی بات نہیں، کوئی اختلافی چیز نہیں۔سب جگہ یہی الفاظ ہیں کہ اس میں تو کوئی اختلاف نہیں لیکن اس کی تعبیرات (Interpretations) مختلف ہوسکتی ہیں۔آپ سوچیے کہ لفظی اختلافات کا نہ ہونا بھی کوئی ایسی خصوصیت ہے جس کا اس تحدی سے ذکر کیا جاتا؟ بات تو ساری تعبیرات کی ہے۔اگر کسی کتاب کی عبارت کی کیفیت یہ ہو کہ وہ زید کو کوئی مفہوم دے اور بکر کو اس کے بالکل متضاد مفہوم، تو کیا اہلِ علم کے نزدیک اس کتاب کی کوئی وقعت ہوسکتی ہے؟ یاد رکھیے! قرآنِ حکیم کی کسی بات میں بھی تضاد نہیں ہے۔

قرآن حکیم پر تدبر مشروط ہوگا

قرآن سمجھنے کے لیے جو شرائط خود قرآن نے مقرر کی ہیں، اگر ان کے مطابق قرآن میں تدبر کیا جائے، تو اس کے کسی حکم کی دو تعبیرات (Interpretations) ہو ہی نہیں سکتیں۔اس لیے اگر امت قرآن کو اپنی سمجھ اور حجت اور آخری دلیل تسلیم کرلے، تو امت میں کسی قسم کا تفرقہ اور اختلاف پیدا ہی نہیں ہوسکتا؟

اس مقام پر ایک نکتے کی وضاحت ضروری ہے۔قرآنِ کریم میں کچھ تو احکام وقوانین دیئے گئے ہیں اور کچھ حقائق۔احکام وقوانین کے لیے ایسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، جن کے معانی متعین اور ٹھوس (Concrete) ہیں لیکن حقائق بالخصوص وہ حقائق، جن کا تعلق مابعد الطبیعات (Meta -Physics) سے ہے، انہیں تشبیہات کے انداز میں بیان کیا گیا ہے اور اہلِ علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ تشبیہات واستعارات سے ہر شخص اپنے اپنے فہم اور علمی سطح کے مطابق مشبہ بہ کے متعلق تصور قائم کرسکتا ہے۔ان تصورات میں اختلاف ہوگا لیکن جہاں تک قرآنی ہدایت کا تعلق ہے، ان کی دو تعبیریں نہیں ہوسکتیں۔ یہ احکام وقوانین اسلامی نظام کی طرف سے نازل ہوں گے،

اس لیے ان کی عملی جزئیات میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔ یوں امت میں وحدت فی العمل پیدا ہو جائے گی اور قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لیے فکری آزادی بھی قائم رہے گی۔

قرآن فہمی کے سلسلہ میں شرط اول قلب ونگاہ کی بالیدگی ہے

عزیز برادران! ان تمام شرائط سے کہیں زیادہ گہری شرط ایک اور ہے اور وہ یہ ہے کہ جب تک اپنے ذہن کو پہلے سے قائم شدہ نظریات، معتقدات اور تصورات سے پاک نہیں کرلیا جائے گا، قرآن سمجھ میں نہیں آسکے گا۔ لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (56:79) قرآنِ کریم کا واضح ارشاد ہے۔ یعنی ''جس کے قلب ونگاہ انسانی خیالات کی آمیزشوں سے پاک نہ ہوں، اسے قرآن سے کوئی مس نہیں ہو سکتا۔ انسانی قلب خدا کا مسکن بن نہیں سکتا جب تک اس حریم کعبہ سے انسانی فکر کے تراشیدہ بتوں کو نکال باہر نہ کیا جائے۔ جو شخص پہلے سے کوئی خیال قائم کر کے قرآن کی طرف اس لیے آتا ہے کہ اسے اپنے اس خیال کی کسی نہ کسی طرح تائید مل جائے، تو اسے قرآن کی بارگاہ سے بُری طرح پھٹکار پڑتی ہے۔ مفکر قرآن اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں:

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے!

قرآن فہمی کے سلسلہ میں اہل عرب کی کیفیت اور ہماری تقلید پرستی

دماغ کو پہلے ان بتوں سے پاک کرنا چاہیے اور پھر دیکھیے کہ قرآنِ کریم کس طرح جلوہ پیرا ہو کر اس میں داخل ہوتا ہے! بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ اہلِ عرب کی زبان تو عربی ہے۔ وہ بھی قرآن کو صحیح طور پر کیوں نہیں سمجھ پاتے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بھی قرآن کو غیر عرب مسلمانوں کی طرح تقلیداً سمجھتے ہیں یعنی کسی زمانے میں، کسی شخص نے، جس طرح قرآن کو سمجھا اور وہ آنے والوں کے لیے سند اور حجت بن گیا۔ اس کے بعد یہ سوال ہی نہ رہا کہ قرآنِ کریم میں خود غور وفکر کیا جائے۔ یہ تقلیدی قرآن عربوں کو عربی زبان میں پڑھایا جاتا ہے اور غیر عربوں کو ترجموں کے ذریعے ان کی اپنی زبان میں۔ اپنی فکر سے نہ یہ قرآن کو سمجھتے ہیں، نہ وہ۔ اس لیے اس باب میں عرب اور عجم کی بھی کوئی تفریق نہیں رہی۔ تفسیر کی جو کتابیں الازہر میں پڑھائی جاتی ہیں، وہی دیوبند یا اب کراچی ملتان اور لاہور کے دار العلوموں میں زیر تدریس رہتی ہیں۔ اپنی فکر وبصیرت نہ یہاں ہے، نہ وہاں۔

قرآنی رموز کو جاننے اور سمجھنے میں صدیوں سے حائل رکاوٹ

قرآن سمجھنے کے لیے سوال اہلِ زبان ہونے کا نہیں ہے۔ سوال زبان دانی کے بعد اہلِ فکر ونظر ہونے کا ہے۔ اپنے غور وفکر اور علم

وبصیرت کی رو سے قرآنِ کریم کو سمجھنے میں ایک بہت بڑی دشواری حائل ہوتی ہے۔ ہمارے اسلاف نے یعنی متقدمین نے جو تفسیریں لکھیں اگر وہ ان کے متعلق یہ کہتے کہ یہ ان کا اپنا خیال ہے اپنی رائے ہے اپنا فہم ہے تو ان سے اختلاف کی گنجائش ہو سکتی تھی۔ ایک انسان کے خیال سے دوسرا انسان اختلاف کر سکتا ہے۔ اس میں نہ کوئی گناہ کی بات ہے نہ جرم کی بات لیکن ہوا یہ کہ انہوں نے جو تفسیر لکھی تو اس کے متعلق یہ کہا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی بتائی ہوئی تفسیر ہے۔ ہمارے ہاں سب سے پہلی قرآنِ کریم کی تفسیر امام طبریؒ [1] کی تفسیر کہلاتی ہے۔ وہ بھی نبی اکرم ﷺ کی وفات کے دو اڑھائی سو سال بعد تیسری صدی ہجری میں ہوئے ہیں۔ یہ پہلی مفصل قرآن کی تفسیر سمجھی جاتی ہے۔ پھر انہوں نے کیا یہ ہے کہ ہر آیت کی تفسیر کے متعلق لکھا یہ ہے کہ یہ نبی اکرم ﷺ کی بیان فرمودہ تفسیر ہے۔ تب ہوا یہ کہ وہ طبری کی تفسیر نبی اکرم ﷺ کی ارشاد فرمودہ تفسیر قرار پا گئی اور اس کے بعد آپ سوچیے کہ کس کی جرأت ہے کہ اس سے اختلاف کر سکے۔ جس تفسیر کے متعلق کہا جائے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی ارشاد فرمودہ ہے تو پھر وہ کون مسلمان ہے جو اس کے خلاف کوئی ایک لفظ بھی کہہ سکنے کی جرأت کر سکے۔ چنانچہ اس کے بعد آج تک جتنی تفسیریں لکھی گئیں ان میں الفاظ کا فرق ہوگا انداز بیان کا فرق ہوگا اسلوب کا فرق ہوگا تفصیل کا فرق ہوگا لیکن بنیادی طور پر معنویت کے اعتبار سے اس سے کوئی اختلاف نہ کر سکتا تھا نہ کسی نے کیا ہے۔

امام طبریؒ اور امام بخاریؒ کی محنت کے ماحصل کا نتیجہ

یہ ساری تفسیریں جو ہزار سال کے زمانے میں لکھی گئی ہیں یوں کہیے کہ امام طبریؒ کی تفسیر پر طرحی غزلیں ہیں لیکن میں ابھی عرض کروں گا کہ وہ جو آیات کی تفسیر انہوں نے لکھی ہیں وہ نبی اکرم ﷺ کی نہیں ہیں وہ روایات پر مبنی ہیں اور روایات کے متعلق میں ابھی عرض کروں گا کہ وہ کس طرح سے وجود میں آئیں اور ان کے متعلق کوئی شخص بھی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ وہ فی الواقع نبی اکرم ﷺ کی ہیں۔ صورت تو یہ ہوئی لیکن اس سے امت کو جو نقصان پہنچا وہ یہ ہے کہ ہزار سال پہلے طبرستان کے رہنے والے ایک امام طبریؒ تھے اور دوسرے امام بخاریؒ (260-194 ھ) وہ بھی بخارا کے ہی رہنے والے تھے۔ انہوں نے حدیث کا مجموعہ مرتب کیا اور امام طبری نے پہلی تفسیر مرتب کر دی۔ دونوں روایات پر مبنی ہیں دونوں میں سے کسی کے متعلق بھی یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی ہیں۔

طبری ؒ کی تفسیر کے متعلق اختلاف کی ذرا سی گنجائش نکل سکتی تھی اگر نبی اکرم ﷺ کے زمانے کی صحیح یقینی تاریخ ہمارے پاس موجود ہوتی لیکن وہ بھی ہمارے پاس نہیں ہے۔ امام طبریؒ نے جہاں قرآن کی تفسیر لکھی وہیں اس زمانے کی تاریخ بھی لکھ دی: تفسیر تیس

---

[1] ان نکات کی وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور 2004ء ص ص 30 تا 31 نیز فٹ نوٹ 1

جلدوں میں' تاریخ تیرہ جلدوں کے اندر اور اس میں بھی ایک سند نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کبار کی ہے۔ اب اس تاریخ سے بھی کوئی اختلاف نہیں کرسکتا۔ انہوں نے کیا یہ کہ جو تفسیر دی' اس تفسیر کی تائید میں تاریخی واقعہ لکھ دیا' جو تاریخی واقعہ لکھا اس کی تائید میں ایک تفصیلی روایت لکھ دی' تو اب اس کے بعد آپ کے ہاں نبی اکرم ﷺ کے زمانے کی' ان کے عقیدے کے مطابق' قرآن کی تفسیر بھی مرتب ہوگئی اور اس دور کی تاریخ بھی مرتب ہوگئی۔ اب اس تفسیر سے کوئی اختلاف نہیں کرسکتا' اس تاریخ سے بھی کوئی اختلاف نہیں کرسکتا۔ اس ہزار سال میں جس طرح سے اسلام کی یہ گاڑی اصلی پٹڑی سے دوسری پٹڑی پہ جاکے پڑ گئی ہے اُس میں بنیادی طور پر جو ذمے داری عائد ہوتی ہے' جو بنیادی سبب ہے' وہ یہی تفسیر' یہی تاریخ ہے' اسی نہج پر ہر ایک نے تفسیر لکھی تو اس کے بعد' جیسا کہ میں ابھی عرض کروں گا' کہ یہ جو روایات کی بنیادوں کے اوپر تفسیر یا تاریخ لکھی جاتی ہے' یہ جو امت کے اندر اتنا زیادہ اختلاف پیدا ہو رہا ہے'۔ اس کی بنیاد ہی یہ ہے۔

نبی اکرم ﷺ پہ قرآنِ کریم نازل ہوا۔ یہ ظاہر ہے کہ جس انداز سے حضور قرآن کریم کو سمجھ سکتے تھے' اس سے بہتر تو ایک طرف' اس سے الگ کون سا مسلمان قرآن کو سمجھ سکتا تھا' اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ جو تفسیر ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ احادیث کے اندر ہے۔ اب احادیث کی صورت یہ ہے کہ نہ تو نبی اکرم ﷺ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب کر کے دیا اور نہ ہی صحابہ کبار نے کوئی مجموعہ مرتب کیا۔ احادیث کے پہلے مجموعے نبی اکرم ﷺ کی وفات کے ڈھائی تین سو سال بعد جا کر مرتب ہوئے اور یہ کسی پہلے سے Written Material (تحریری مواد) پر مبنی نہیں ہیں' کسی تحریری سند یا مواد پر مبنی نہیں ہیں' بلکہ سب زبانی روایات پر مبنی ہیں۔ امام بخاریؒ نے زبانی روایت کو اپنے مجموعۂ حدیث میں شامل کرلیا۔ جن حدیث کی چھ کتابوں کو سنیوں [1] کے ہاں صحیح ترین قرار دیا جاتا ہے' ان سب میں سرِ فہرست امام بخاریؒ کا مجموعہ ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ''میں نے جب احادیث جمع کرنی شروع کیں' تو چھ لاکھ کے قریب روایات میں نے لوگوں سے سنیں۔ ان میں سے میں نے پانچ لاکھ چورانوے ہزار کو تو خود اپنی صوابدید کے مطابق مسترد کر دیا' تو قریب چھ ہزار احادیث یا روایات رکھیں۔ ان میں سے بھی اگر جو مکرر بیان کی گئی ہیں' کو الگ کر دیا جائے' تو وہ قریباً تین ہزار رہتی ہیں''۔ لیکن یہ جو تین ہزار رہتی ہیں' ان میں بھی تو کسی روایت کو نہ نبی اکرم ﷺ کی سند ہے' نہ صحابہ کبار کی کوئی تصدیق ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ امام بخاری نے کسی سے سنا' انہوں نے اپنے باپ سے سنا' انہوں نے اپنے استاد سے سنا' انہوں نے فلاں سے سنا' انہوں نے فلاں سے سنا' انہوں نے فلاں صحابی سے سنا' تو انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا تھا۔ ہر حدیث کا یہ انداز ہے۔

آپ سوچیے' عزیزانِ من! کہ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے دواڑھائی سو سال بعد اس انداز سے' ان اسباب کے ذریعے سے' کہ فلاں نے فلاں سے سنا تھا' جو روایت بیان کی جائے گی' اس میں کہاں تک یقینی طور پر کہا جائے گا' کہ وہ رسول اللہ کی ہے۔ اسی لیے یہ جتنی

---

[1] ان نکات کی وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء' ص ص 199 تا 218، نیز فٹ نوٹ 1`2(200)۔

حدیثیں ہیں' ان میں سے ہر حدیث کے بعد پہلے کہا جاتا ہے کہ ''قال رسول اللہ''۔حضور نے فرمایا اور آخر میں کہا جاتا ہے ''او کما قال رسول اللہ'' یا جیسے رسول اللہ نے فرمایا ہے۔یعنی خود یہ لوگ بھی یقینی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ جو کچھ ہم بیان کرر ہے ہیں' یہ رسول اللہ کی کہی ہوئی ہیں اور پھر یہ رسول اللہ کے الفاظ بھی نہیں ہے۔حدیث کہتے ہیں کہ وہ معنوی طور پر آ گے آئیں' یعنی ایک شخص نے یہ سمجھا' اُس نے آ گے سمجھایا' اُس نے یہ سمجھا' اُس نے آ گے سمجھایا اور دوسو سال کے بعد وہ شخص جس نے بیان کیا' اسے امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں لکھ لیا۔اس طرح سے یہ احادیث کی چھ مستند کتابیں تو سنیوں کے ہاں ہیں اور اسی قسم کی چار مستند کتابیں شیعہ حضرات کے ہاں ہیں [1] اور کیفیت یہ ہے کہ ایک کتاب دوسری کتاب سے مختلف ہے یعنی خود ایک کتاب کے اندر بہت سے اختلافات ہیں۔یہ ہیں عزیزانِ من! احادیث کے وہ مجموعے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان میں درج وہ احادیث رسول اللہ کی بیان فرمائی ہوئی ہیں۔

احادیث کے متعلق امام احمد بن حنبل کا فرمان

یہ اس قدر نا قابل اعتماد ہے کہ ان احادیث کے متعلق امام احمد بن حنبل ؒ (164-241H/780-855AD) کا قول ہے کہ احادیث کی کتابوں میں تین قسم کی روایات قابل اعتماد نہیں: پیشین گوئیوں سے متعلق' لڑائیوں سے متعلق' اور تفسیر سے متعلق۔ان کے اس قول کی تصدیق خود ان تفاسیر سے ہوتی ہے جنہیں نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔مثالیں تو میں' اس میں بے شمار دے سکتا ہوں' لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے میں اس وقت اس کی صرف دو ایک مثالیں نہیں بلکہ ایک ہی مثال دینا کافی سمجھتا ہوں۔وہ پیش کروں گا۔آپ اس سے اندازہ لگا لیجیے گا کہ روایات کی رو سے قرآنِ کریم کے سمجھنے میں کتنی مدد مل سکتی ہے۔

سورۂ احزاب میں ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا (33:69)۔ جماعت مومنین سے کہا جا رہا ہے کہ اے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنھوں نے موسیٰ کو بہت ستایا' انہیں اذیت دی' تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ ◆ کو ان کی ان اذیت رسانیوں سے محفوظ رکھا۔تم ان کی طرح نہ ہو جانا۔بنی اسرائیل حضرت موسیٰ ◆ کو کس کس انداز سے ستاتے تھے' اس کی تفصیل قرآنِ کریم کے متعدد مقامات میں موجود ہے۔حضرت موسیٰ ◆ اس غلام محکوم قوم کو فرعون [2] جیسے مستبد حاکم کی غلامی سے نجات دلا کر' وادیٔ سینا میں لے آئے تھے۔یہی احسان کچھ کم گراں بہا نہیں تھا۔اس قوم کو چاہیے تھا کہ قدم قدم پر ان کے شکر گزار ہوتے لیکن ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ قدم قدم پر ان کو اذیت دیتے' ان کو تنگ کرتے۔راستے میں ایک جگہ دیکھا کہ ایک قوم ایک بت کی پرستش کرتی ہے' تو حضرت موسیٰ ◆ کا دامن پکڑ کر بیٹھ گئے کہ ہمیں بھی ایسا ایک بت بنا دیجیے تا کہ ہم اس کی پرستش کریں۔کبھی ان

---

[1] اس کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے:: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ حج' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص۔242-200۔

[2] اس کشمکش کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ طٰہٰ' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء

کی کیفیت یہ ہے کہ پانی کی تنگی ہوئی ہے تو جدھر گئے ہیں انہوں نے کہا کہ موسیٰ تم ہمیں کہاں مارنے کے لیے لے آئے ہو۔ وہاں ان کو من وسلویٰ کھانے کو ملتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہمیں تو یہاں بیٹھے ہوئے مصر میں جو ہم اس قوم کی اپنی حاکم قوم کی ہنڈیاں پکایا کرتے تھے اس کی لذتیں یاد آتی ہیں۔ ہمیں دالیں اور پیاز اور لہسن اور سبزیاں یہ کچھ دو۔ یہ من وسلویٰ یہ ہم سے روز روز نہیں کھایا جاتا۔

آپ ◆ چند دن کے لیے ذرا کہیں باہر گئے سامری [1] نے ایک گئوسالہ بنایا اور انہوں نے اس کی پرستش شروع کر دی۔ وہ اس طرح ایک ایک قدم پر حضرت موسیٰ ◆ کو ستایا کرتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ان سے کہا کہ **یٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ وَ قَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ** (61:5)۔ اے قوم! میں نے تمہارے ساتھ کون سی دشمنی کی ہے جس کی وجہ سے تم مجھے قدم قدم پر اس طرح ستاتے ہو حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف خدا کا رسول ہوں اس کے پیغامات تم تک پہنچاتا ہوں تمہیں تو اس کے لیے احسان مند ہونا چاہیے تھا لیکن تمہاری کیفیت یہ ہے کہ ایک ایک قدم پر مجھے تنگ کرتے ہو اذیتیں پہنچاتے ہو اسی لیے حضرت موسیٰ ◆ نے اللہ تعالیٰ سے فریاد کی تھی کہ اے اللہ! میں اور میرا بھائی بس ہم یہ دونوں ہیں جو اپنے ذمے دار ہیں ورنہ یہ قوم فاسق ہے۔ جو کچھ یہ کر رہی ہے اس کی ذمے داری ہم پہ عائد نہیں ہوتی۔

میں نے یہ تفصیل اس لیے بیان کی کہ یہ معلوم ہو جائے کہ وہ جو قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ اے جماعت مومنین! تم حضرت موسیٰ ◆ کی قوم کی طرح نہ ہو جانا انہوں نے انہیں بڑا ستایا تھا اور ان کی اذیت رسانیوں کی تفصیل خود قرآن نے دی ہے اس کی وضاحت ہو جائے۔

حضرت موسیٰ ◆ کے متعلق ایک روایت

اب آپ دیکھیے کہ اس آیت کی تفصیل روایات کی رو سے کیا ملتی ہے؟ یہ بخاری شریف کی روایت ہے۔ غور سے سنیے گا عزیزانِ من! حضرت ابوہریرہ ◆ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل برہنہ غسل کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھا جاتا تھا اور حضرت موسیٰ ◆ تنہا غسل کیا کرتے تھے۔ بنی اسرائیل نے کہا کہ واللہ! موسیٰ ◆ کو ہم لوگوں کے ہمراہ غسل کرنے سے سوا اس کے کچھ مانع نہیں کہ وہ...... کے مرض میں مبتلا ہیں۔ اتفاق سے ایک دن موسیٰ ◆ غسل کرنے گئے اور اپنا لباس پتھر پر رکھ دیا۔ وہ پتھر ان کا لباس لے بھاگا اور حضرت موسیٰ ◆ بھی اس کے تعاقب میں یہ کہتے ہوئے دوڑے کہ اے پتھر! میرے کپڑے دے دے اے پتھر! میرے کپڑے دے دے یہاں تک کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ ◆ کی طرف دیکھ لیا اور کہا واللہ! موسیٰ ◆ کو کچھ بیماری نہیں

---

[1] بچھڑے (گئوسالہ) اور سامری کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورۂ طٰہٰ ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور 2005ء ص ص 242 اور 250 اور فٹ نوٹ 1 (250)۔

ہے اور پتھر ٹھہر گیا۔ موسیٰ ◆ نے اپنا لباس لے لیا اور پتھر کو مارنے لگے۔ ابو ہریرہ ♦ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم! حضرت موسیٰ ◆ کی مار سے چھ یا سات نشان اب تک اس پتھر پر داخل ہیں۔

عزیز برادران! یہ بخاری شریف کی جلد اول کی روایت ہے جو قرآنِ کریم کی اس آیت کی تفسیر میں بیان کی گئی ہے جس میں قرآنِ کریم نے جماعت مومنین سے کہا تھا کہ تم قوم موسیٰ کی طرح نہ ہو جانا۔ انہوں نے حضرت موسیٰ ◆ کو بہت ہی اذیتیں دی تھیں۔ اس روایت یا اس حدیث کے اندر اس اذیت رسانی کی تفسیر بیان ہو رہی ہے۔ کس قسم کی ہیں وہ تفاسیر جو احادیث کے اندر ہمیں ملتی ہیں۔ عزیزانِ من! ان کا آپ خود اندازہ لگا لیجیے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم کی تفسیر روایات کی رو سے کی جانی چاہیے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ حالانکہ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ یہ روایات یا احادیث رسول اللہ ﷺ کی نہیں ہیں۔ یہ آپ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں اور زبانی روایتیں کوئی دو سوا ڈھائی سو سال کے بعد جمع کی گئی تھیں۔ اب کوئی نہیں کچھ کہہ سکتا کہ ان میں کتنا حصہ حضور ﷺ کا ہے اور کتنا کچھ دوسروں کا ملایا ہوا ہے۔

احادیث کے مجموعوں کے متعلق میرا مسلک یہ ہے کہ ان میں جو باتیں قرآن کے مطابق ہیں، انہیں ہم صحیح تسلیم کر سکتے ہیں لیکن جو قرآن کے خلاف ہیں یا جن سے حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی پر کسی قسم کا طعن پڑتا ہے، ان کے متعلق ہم کہہ دیں گے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں نہیں ہو سکتیں۔ پھر سن لیجیے کہ میں رسول اللہ ﷺ کی کسی حدیث کا انکار نہیں کرتا۔ متذکرہ بالا مواد کی رو سے غلط روایات کے متعلق کہتا یہ ہوں کہ وہ رسول اللہ کی ہو نہیں سکتیں، ورنہ جو احادیث قرآنِ کریم کی تعلیم کے مطابق ہیں، میں نے کبھی بھی اور کہیں بھی ان کا انکار نہیں کیا۔

عزیزانِ من! یہ ہیں سورۃ الفاتحہ کے ان دروس کے اسباب جو آپ کے سامنے پیش کیے گئے اور یہی ہے ان کی پہلی تعارفی نشست۔ اب سورۃ الفاتحہ ہم اگلے درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط



دوسرا باب: سورۃ الفاتحۃ (بسم اللہ اور آیت 1)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے الفاظ کی نوعیت

عزیزانِ من! سلام ورحمت! سورۃ الفاتحہ کے درسوں کے جو Causes (اسباب) میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں' ان کا تعارف پہلی نشست میں کرایا جا چکا ہے۔ اب ہم سورۃ الفاتحہ کے درس کی ابتدا کرتے ہیں لیکن اس سے پہلے اُن الفاظ کو سامنے لانا ضروری ہے جو اِسی سورت کے آغاز میں نہیں بلکہ قرآنِ کریم کی ہر سورت کے آغاز میں لکھے اور پڑھے جاتے ہیں سوائے ایک سورت کے' جسے سورۃ التوبہ کہتے ہیں۔ اس سورت کی ابتدا میں یہ الفاظ اس لیے نہیں لکھے جاتے یا پڑھے جاتے کہ کہا جاتا ہے کہ یہ یقینی طور پر طے نہیں پاسکا تھا کہ سورۃ التوبہ ایک الگ سورت ہے یا سابقہ سورۃ الانفال ہی کا ایک حصہ ہے یعنی یہ ایک ہی سورت مسلسل چلی آتی ہے یا یہ ایک نئی سورت ہے۔ چونکہ یقینی طور پر یہ طے نہیں پاسکا تھا اس لیے انہوں نے یہ کیا کہ سورۃ التوبہ الگ رکھی۔ آٹھویں سورۃ الانفال اور نویں سورۃ التوبہ کے درمیان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہ لکھا کہ اس کا تسلسل بھی قائم رہے اور یہ ایک الگ سورت بھی نظر آئے۔ یہ بہر حال ایک ٹیکنیکل سی بات ہے۔ قرآنِ کریم کے مفہوم پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

قرآنِ حکیم شروع سے آخر تک ایک مربوط کتاب ہے

قرآنِ کریم جیسا کہ آپ دیکھیں گے' الحمد سے والناس تک' ایک مسلسل مربوط کتاب ہے' سورتوں کے یہ الگ الگ نام حوالوں کی آسانی کے لیے ہیں' جیسے آیتوں کے الگ الگ نمبر ہیں۔ اسی طرح قرآنِ کریم کو جو تیس پاروں میں تقسیم کیا گیا ہے' تو اُن کی بھی کوئی خصوصیت نہیں ہے' یہ محض تلاوت کی غرض سے' اور خاص طور پر حفاظ نے اپنی آسانی کے لیے' قرآن کو حصوں میں تقسیم کیا اور ہر حصے کا نام ایک پارہ رکھ دیا۔ پاروں کی یہ ایک خصوصیت ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے سورتوں کے الگ الگ نام بھی حوالوں کی' سہولت کی غرض سے ہیں۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ ہر سورت کے آغاز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے الفاظ ملتے ہیں اور ویسے بھی ہم مسلمان جو کام بھی

کرتے ہیں' اس سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہتے ہیں' اس اعتبار سے بھی یہ ہے کہ یہ بڑے اہم سے الفاظ اور اہم سا ٹکڑا ہے۔ بعض احباب اور علماء کا خیال ہے کہ یہ بذاتِ خود ایک آیت ہے۔ چنانچہ جب وہ کسی سورت کی آیتوں کا نمبر شمار کرتے ہیں تو اسے پہلی آیت کہتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ نہیں' سورت تو اپنی پہلی آیت سے شروع ہوتی ہے اور یہ بسم اللہ کے الفاظ ہر سورت کے اوپر تبرکاً لکھے جاتے ہیں لیکن سورت یہ ہو یا وہ ہو' یہ حقیقت ہے کہ قرآنِ کریم کے اندر سورۃ النمل میں یہ الفاظ اسی طرح سے آئے ہیں۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ حضرت سلیمان ◆ [1] نے ملکہ سبا[2] (Sheba) کو جو خط لکھا تو اس کا آغاز اس طرح سے کیا: **اِنَّـهٗ مِنۡ سُلَيۡمٰنَ وَ اِنَّـهٗ بِسۡـمِ اللّٰهِ الـرَّحۡـمٰنِ الرَّحِيۡمِ** (27:30)۔ چونکہ یہ الفاظ اسی طرح سے قرآنِ کریم کے متن کے اندر آ گئے ہیں اس لیے یہ الفاظ منزل من اللہ یعنی وحی خداوندی ہیں اور ہمارے لیے اتنا سمجھ لینا ہی کافی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے الفاظ کا حقیقی مفہوم اور اس کی وضاحت

عام طور پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے معنی کیے جاتے ہیں: ''میں شروع کرتا ہوں پاک نام اللہ کے' جو بے حد مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔'' بسم اللہ میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس کے معنی ''شروع کرتا ہوں'' ہوں۔ ان معانی کے لیے اس سے پہلے ''ابتد ع'' کا لفظ محذوف مانا گیا ہے۔ جس کے معنی ہیں: ''میں شروع کرتا ہوں۔''

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس سے پہلے ''اقراء'' کا لفظ محذوف ہے کیونکہ سورۃ العلق میں آیا ہے: **اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَـلَـقَ** (96:1)۔ کہا جاتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ پر وحی کا آغاز اس آیت سے ہوا تھا' جس میں حضور ﷺ سے کہا گیا تھا'' کہ تو پڑھ ساتھ

---

[1] تاریخ کا قیاس اس طرف جاتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا زمانہ 950 ق م کا ہے۔

[2] جس زمانے میں قوم سبا اپنے عہد شباب میں تھی اس کی حکمران ملکہ سبا تھی۔ قوم سبا کا مسکن جنوبی عرب (یمن کا مشرقی علاہ) تھا اور مآرب دارالسلطنت۔ یہ اس زمانے کی مہذب اور طاقتور قوم تھی' تجارت میں بہت آگے' زمین زرخیز' قیمتی دھاتیں' جواہرات ریشم اور بخورات کے مسالے بافراط ملتے تھے۔ ہندوستان کا مالِ تجارت یمن کے ساحل پر جا کر اترتا' وہاں سے یہ لوگ اس سامان کو شام' فلسطین اور مصر تک لے جاتے۔ تجارت اور اس کے ساتھ حکومت' نتیجہ یہ کہ شمالی عرب اور افریقہ تک مختلف آبادیوں پر ان کا تسلط رہا۔ قریب 1100 ق م' زمانہ عروج سمجھئے۔ پہلی صدی ق م میں یہ قوم تباہ ہوگئی۔ ان کی بستیوں کے کھنڈرات اور ان کے کتبات آج تک ان کی مٹی ہوئی سطوت کی زندہ شہادتیں ہیں۔ یہ لوگ بڑی بڑی عمارتیں بناتے اور قلعے تعمیر کرتے تھے اور آبپاشی کے لیے انہوں نے بڑے بڑے بند (Dams) بنا رکھے تھے۔ چنانچہ ایک بہت بڑا بند خود دارالسطنت مآرب کے قریب تھا جسے سدمآرب کہتے ہیں۔ (حجاز کے عرب بند (Dam) کو ''سد'' اور عربِ یمن عرم کہتے ہیں) یہ بند (Dam) پہاڑوں کے اندر بڑی بڑی دیواریں کھینچ کر بنایا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے اردگرد کا علاقہ سیراب ہوتا تھا۔ اس سے یہ سرزمین وسیع وعریض باغ بن گئی تھی۔ پہلے یہ بند ٹوٹا' جس سے شہر تباہ و برباد ہوا اور گردوپیش کا علاقہ ایسا ویران ہوا کہ اس میں جھاؤ اور خاردار بیریوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا (34:16-17) حوالہ: پرویزؒ: برق طور' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1993' ص ص 259-261

پاک نام اپنے رب کے، جس نے پیدا کیا۔“ اس آیت کا صحیح مفہوم اپنے مقام پر آئے گا۔ بہر حال کہنا یہ مقصود تھا کہ بسم اللہ کے معنی کیے جاتے ہیں: ”میں شروع کرتا ہوں ساتھ نام اللہ کے“ اور اس میں چونکہ کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس کے معنی ”میں شروع کرتا ہوں“ ہو، اس لیے مانا یہ جاتا ہے کہ اس سے پہلے یہ الفاظ تھے اور وہ محذوف ہیں، پڑھے نہیں جاتے، اُن کا مطلب یہی لیا جائے گا۔ لیکن اگر ذرا گہرائی میں جایا جائے تو اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ نہ تو اس سے پہلے کوئی لفظ محذوف ہے اور نہ ہی اس کے معنی ”میں شروع کرتا ہوں“ ہیں، کیونکہ بسم اللہ میں ”ب“ کا حرف آیا ہے۔ اس کے معنی ”ساتھ“ کیے جاتے ہیں: ساتھ نام اللہ کے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کے معنی ”ساتھ“ بھی ہیں لیکن جیسا کہ آپ تعارفی درس میں سن چکے ہیں کہ عربی زبان میں تو ایک ایک لفظ بلکہ بعض اوقات ایک ایک حرف کے بھی متعدد معنی ہوتے ہیں اور اُن میں سے ہمیں دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کون سا معنی موضوع، مفہوم اور مضمون کے اعتبار سے اس آیت میں صحیح طور پر فٹ (Fit) بیٹھتا ہے۔ یعنی اس سے پہلے کوئی لفظ محذوف نہ مانا جائے تو پھر ”ب“ کے معنی ”ساتھ“ کے بجائے دوسرے لینے چاہئیں اور ”ب“ کا دوسرا اہم معنی ”مقصد، غایت“ ہے۔ یعنی ”میں یہ جو کچھ کر رہا ہوں یا کرنا چاہتا ہوں، وہ اس مقصد کے لیے ہے، اُس کی غایت یہ ہے، اُس کا سبب یہ ہے، اُس کی علت یہ ہے، میں یہ اُس لیے کر رہا ہوں“۔ اب یہاں تو بات صاف ہوگئی کہ بسم اللہ کے معنی یہ ہوئے کہ میں ”جو کچھ بھی کر رہا ہوں یا جو کچھ اُس کے بعد کہا جائے گا، اُس کا مقصد، اُس کی غایت، اُس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ بات آگے آئے گی“۔ دوسرا یہ کہ حرف ”ب“ کے ساتھ جو پہلا لفظ آیا ہے، وہ ”اسم“ ہے۔ ”اسم“ کا ترجمہ عام طور پر ”نام“ کیا جاتا ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک تو ذاتی نام ہے جسے اللہ کہتے ہیں یعنی ذاتِ خداوندی کا نام اور باقی تمام اللہ کی صفات ہیں۔ صفت کے لیے عربی زبان میں لفظ ”اسم“ آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب یہ ”اسم“ کا مادہ ”س م و“ ہے تو اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں: ”کوئی ایسی علامت جس سے متعلقہ چیز پہچانی جائے“۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کی حقیقت تو انسان کے تصور میں بھی نہیں آ سکتی۔ یہ برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے متعلق تو ہم کچھ نہیں جان سکتے لیکن اس نے اپنی جو صفات بیان کی ہیں، ان صفات کا ایک تصور ہمارے ذہن میں آتا ہے۔ یہ صفاتِ خداوندی اسماء الحسنٰی کہلاتی ہیں۔ سورۃ الحشر میں مختلف صفاتِ خداوندی بیان کرنے کے بعد کہا گیا ہے کہ **لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى** (59:24) خدا کی تمام صفات نہایت حسن و خوبی سے کامل توازن لیے ہوئے ہیں۔ لہٰذا میرے نزدیک بسم اللہ میں ”اسم“ سے مراد صفتِ خداوندی ہے، اسمائے خداوندی۔ اس کے بعد بسم اللہ میں دوسرا لفظ ”اللہ“ آتا ہے۔ میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے کہ اللہ تو خدا کا ذاتی نام ہے۔ بسم اللہ کے معنی ہوئے: ”اللہ کی اُس صفت یا اِن صفات کے مقصد یا غرض کے لیے یہ کام شروع کیا جاتا ہے یا یہ کچھ کیا جاتا ہے۔“

عزیز برادران! بسم اللہ کے بعد رحمٰن اور رحیم کے دو الفاظ آئے ہیں۔ یہ خدا کے دو اسماء ہوئے، یہ خدا کی دو صفات ہوئیں جن کے

لیے'' یہ کچھ کیا جائے گا''۔ ان معانی کی رو سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا مفہوم یہ ہوگا کہ'' جو کچھ اس کے بعد کہا جائے گا یا کیا جائے گا' اس کا مقصد یہ ہے کہ خدا کی صفاتِ رحمانیت اور رحیمیّت کا ظہور اور نمود ہو یعنی یہ صفاتِ خداوندی مخصوص طور پر بروئے کار آ جائیں۔ جب قرآنِ کریم کی کسی سورت کے آغاز میں آنے والے ان الفاظ کو خدا کی طرف منسوب کیا جائے یعنی یہ سمجھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے متعلق ایسا فرمایا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ'' خدا کا ارشاد یہ ہے کہ ہم نے اس قرآن یا قرآنِ مجید کی اس آیت کو یا اس سورت کو اس لیے نازل کیا ہے کہ'' ہماری صفتِ رحمانیت اور رحیمیّت کی عام نمود ہو جائے''۔ اور جب ایک مردِ مومن' ایک مسلم' ایک مسلمان' اپنے کسی کام کی ابتدا ان الفاظ سے کرے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ'' میں اس کام کو اس لیے ہاتھ میں لے رہا ہوں کہ اس سے خدا کی صفت رحمانیت اور رحیمیت کی نمود ہو جائے۔'' یہ بسم اللہ کی غایت' خدا کی صفتِ رحمانیت و رحیمیّت' کو عملاً بروئے کار لانا ہے۔

خدا تعالیٰ کے نزدیک نزولِ قرآن کا اصل مقصد

اب سوال یہ سامنے آئے گا کہ خدا کی صفتِ رحمانیت اور رحیمیّت کا مفہوم اور مقصود کیا ہے؟ یوں تو خدا کی تمام صفات اپنے اپنے مقام پر یکساں عظمت اور اہمیت کی حامل ہیں لیکن ظاہر ہے کہ جن صفات کو خدائی پروگرام اور اس کی ابتدا میں انسان کے پروگرام کی غرض و غایت بتایا گیا ہو' وہ خاص اہمیت کی حامل ہوں گی۔ لہٰذا یہ دونوں صفاتِ خداوندی' رحمٰن اور رحیم' بڑے گہرے غور و فکر کے متقاضی ہیں۔ پہلے تو میرا یہ خیال تھا کہ میں اسی مقام پر ان کا قرآنی مفہوم واضح کر دوں لیکن آگے چل کر جب ہمارے سامنے سورۂ فاتحہ کی پہلی اور دوسری آیتیں آئیں گی تو وہاں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ کے بعد اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ آئے گا۔ چونکہ یہ الفاظ وہاں آتے ہیں' اس لیے ان کے مفہوم کے بیان کا صحیح اور مناسب مقام وہی ہے۔ اس کے لیے آپ کو تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔ اگر آپ صرف اتنا سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم نازل فرمایا ہے تو اس کا بھی مقصد یہ ہے کہ انسانی دنیا میں اس کی صفتِ رحمانیت اور رحیمیّت عام ہو جائے اور اس کے بندے جس پروگرام کو بھی ہاتھ میں لیں اس کی غرض و غایت بھی یہی ہونی چاہیے۔ بنابریں' اس وقت میں جو اپنی بصیرت کے مطابق قرآنِ کریم کے معانی اور مطالب بیان کر رہا ہوں اور آپ انہیں سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں تو اس سے ہمارا مقصد یہی ہونا چاہیے کہ اللہ کی'' رحمت'' کا عام ظہور ہو جائے۔ میرے پیشِ نظر بہرحال یہی مقصد ہے اور یہی میری تمام کوششوں کا منتہیٰ ہے۔ جب آگے چل کر رحمٰن اور رحیم کا مفہوم آپ کے سامنے آئے گا تو پھر اُس وقت آپ سمجھ جائیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ جھوم اٹھیں گے کہ یہ جو ہم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہتے ہیں تو یہ کتنے بڑے پروگرام کا' کتنے عظیم مقصدِ حیات کا' اعلان ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے یہ الفاظ صرف دہرانے کے نہیں ہیں بلکہ یہ ایک پروگرام ہے جس کو عملاً بروئے کار لانا امتِ مسلمہ کا فرض ہے اور اُس میں تعاون اور شرکت کرنا ہر عبدِ مسلم کا فریضہ حیات ہے تو یہ ہوئی بات بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی! اب اس کے

بعد ہمارے سامنے سورۃ فاتحہ آتی ہے۔

سورۃ فاتحہ کی حیثیت قرآنِ حکیم کے 'پیش لفظ' کی سی ہے

سورۃ فاتحہ یوں کہیے کہ جیسے کسی کتاب کا Preface (پیش لفظ) ہوتا ہے' Introduction (تعارف) ہوتا ہے۔ اس سورت کی سات چھوٹی چھوٹی آیات میں اگر یہ کہا جائے کہ واقعی قرآنِ کریم کی تعلیم کا ملخص سمٹ کر آ گیا ہے تو اس میں قطعاً مبالغہ نہیں ہوگا۔ یہ بڑی ہی جامع سورت ہے اور قرآنِ کریم کا Opening (افتتاحیہ) اسی قسم کی سورت سے ہونا چاہیے اس لیے ہم اس کی پہلی آیت **اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ** (1:1) سے شروع کرتے ہیں۔

ذاتِ خداوندی کے متعلق غیر مسلموں کا ایک اعتراض جو غلط فہمی پر مبنی ہے

عزیزانِ من! جیسا کہ آپ نے دیکھا ہے' اس کا پہلا لفظ ''الحمد'' ہے۔ **اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ** (1:1) کے عام طور پر معنی کیے جاتے ہیں ''سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو پالنے والا ہے سارے جہانوں کا''۔ میں ترجمہ اور اس کے مفہوم کے متعلق تو بعد میں عرض کروں گا' پہلے میں اُس اعتراض کو لیتا ہوں جو غیر مسلم بالعموم اس مفہوم یا اس ترجمہ کے خلاف کرتے ہیں۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ ہم مسلمانوں کا خدا (معاذ اللہ) عجیب ہے' جو خود اپنے منہ سے کہتا ہے کہ تمام تعریفیں میرے لیے ہیں۔ اِن لوگوں کے کہنے کے مطابق' اس کا اپنے منہ سے خود' اپنے متعلق ایسی باتیں کرنا' زیب نہیں دیتا۔ اُن کا یہ اعتراض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ وحی خداوندی کے ذریعے' جو قرآن کے اندر محفوظ ہے' درحقیقت انسانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ ایسا کہیں اور ایسا کریں۔ یہ ہدایت ہے۔ یہ Doctrines[1] ہیں' جو خدا کی طرف سے دیئے گئے ہیں۔ لہٰذا ''الحمد'' سے مراد یہ نہیں کہ خدا اپنی تعریف آپ کرتا ہے۔ وہ تو اِس سے مستغنی ہے۔ اُس نے انسانوں سے کہا ہے کہ تم اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو اور اِسے ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھو کہ ساری ''حمد'' خدا کے لیے ہے۔ اصل یہ ہے کہ اگر قرآنِ کریم کے شروع میں ہی ایک لفظ ''قل'' مان لیا جائے کہ ''کہو'' تو اُس کے بعد جو سارا قرآن کریم ہے' اس کے متعلق یہ کہا جائے گا' یہ سمجھا جائے گا کہ خدا نے انسانوں سے کہا ہے کہ ''تم ایسا کہو' ایسا کرو۔'' لہٰذا اس اعتبار سے غیر مسلموں کا وہ اعتراض کوئی وزن نہیں رکھتا۔

---

[1] تعلیمات یا کسی خاص موضوع سے متعلق تعلیمات کا مجموعہ یا نظام۔ (حوالہ: ڈاکٹر جمیل جالبی: قومی انگریزی۔ اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان' اسلام آباد' 1992' ص 607۔

لفظ 'حمد' کے قرآنی مفہوم کی شرط اول

اب آیئے حمد کی طرف۔ جیسا کہ ابھی میں نے ترجمے میں کہا ہے اور ہر ترجمے میں یہ آپ کو ملے گا کہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے یعنی حمد کا ترجمہ ''تعریف'' کیا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ قرآن کے مفہوم کو صحیح طور پر واضح نہیں کرتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ پہلے تعارفی درس میں' میں عربی زبان کی وسعت اور جامعیت کی حقیقت [1] اقتباسات سے بیان کر چکا ہوں۔ تعریف کے لیے عربوں کے ہاں اور الفاظ بھی ہیں۔ خود تعریف بھی تو عربی زبان کا لفظ ہے لیکن قرآن کریم میں وہ الفاظ خدا کے لیے استعمال نہیں ہوتے۔ اس کے لیے ''حمد'' کا لفظ ہی آیا ہے۔ لہٰذا اس لفظ کے بنیادی اور حقیقی مفہوم کو سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ حمد کے معنیٰ کیا ہیں؟ اور اس لفظ کو کن معانی میں استعمال کرتے ہیں؟ زمانہ نزولِ قرآن کی عربی میں اس کا مفہوم کیا لیا جاتا تھا؟ جب وہ مفہوم سامنے آئے گا تو پھر آپ دیکھیں گے کہ خدا کے لیے یہی لفظ کیوں استعمال کیا گیا ہے اور یہ بھی کہ اس کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ ''سب تعریف خدا کے لیے ہے۔'' اس کا مفہوم کہیں بلند اور اس سے کہیں وسیع تر ہے۔ عربوں کے ہاں کسی نہایت حسین' متناسب' نادر شاہکار (Master Piece) کو دیکھ کر انسان کے دل میں جو جذباتِ تحسین ' جو Appreciation (ستائش) کے جذبات' بے ساختہ بیدار ہوں' اور خود دل سے اٹھیں' تو ان کے والہانہ اظہار کو ''حمد'' کہا جاتا ہے۔ ویسے تو انہی الفاظ سے آپ سمجھ لیجیے کہ ''حمد'' کے معنیٰ کیا تھے لیکن اس کے لیے وہ چند شرائط عائد کرتے تھے کہ ''حمد'' کن چیزوں کی کی جائے گی اور کس انداز سے کی جائے گی۔ پہلی شرط تو یہ ہے کہ جس حسن و رعنائی اور شاہکار کی ستائش کی جا رہی ہے وہ ایک خارجی حقیقت اور محسوس شے ہونی چاہیے۔ غیر محسوس اور مشاہدہ میں نہ آنے والی چیزوں کے متعلق ہمارے دل میں جذباتِ تحسین و ستائش پیدا نہیں ہو سکتے۔ مثلاً ہم کسی مصور کی تعریف' اس کی ان تصاویر کے ذریعے ہی کر سکتے ہیں' جو مرئی (Visible) طور پر ہمارے سامنے آجائیں۔ اس لیے قرآن کریم نے اُن نمود و نمائش کا ذوق رکھنے والوں پر طنز کیا ہے' جو بغیر تعمیری اور نفع بخش کام کیے' اپنی ستائش چاہتے ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ یُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا (3:187) یہ وہ لوگ ہیں' جو چاہتے ہیں کہ اُن کی تعریف اُن کاموں کی بنا پر کی جائے' جنہیں وہ کرتے نہیں ہیں۔ لہٰذا محض کسی نظریہ یا کسی Idea (خیال و تصور) یا کسی قسم کے تصور کے لیے ''حمد'' کا لفظ نہیں بولا جائے گا۔ وہ Ideal' وہ نظریہ' وہ تصور' جب عملی شکل میں' محسوس پیکر میں' سامنے آئے گا' تو اس وقت اس کی تحسین و ستائش کے لیے ''حمد'' کا لفظ بولا جائے گا۔ اس سے پہلے نہیں بولا جائے گا۔ یہ ہے پہلی شرط۔

---

[1] اس کی مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: (ص ص 20 تا 26)' مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 29 (مکمل)' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006ء

''حمد'' اور ''مدح'' میں بنیادی فرق

دوسری شرط یہ ہے کہ کسی کی جس بات یا جس کام کی ''حمد'' کی جارہی ہو وہ اس سے اختیاری طور پر سرزد ہونی چاہیے۔ بے اختیاری یا مکینکی انداز سے کسی فعل کا سرزد ہوجانا ''حمد'' کا مستحق نہیں بناتا حتیٰ کہ وہ حسن جو کسی میں پیدائشی طور پر موجود ہو یعنی وہ اُس کا اپنا اکتسابی (Acquired) نہ ہو اُس کے لیے بھی ''حمد'' کا لفظ نہیں بولا جاتا' مدح کا لفظ بولا جاتا ہے۔ مثلاً وہ کہتے یہ ہیں کہ ''رقصِ طاؤس'' میں' یعنی مور کے ناچ میں' طاؤس یعنی خود مور' مستحقِ حمد نہیں ہوتا' اُس کا خالق ''مستحقِ حمد'' ہوتا ہے۔ رقصِ طاؤس میں طاؤس ''مستحق مدح'' ہوتا ہے اور اُس کا خالق یعنی خدا سزاوارِ حمد ہوتا ہے' اس لیے کہ طاؤس کا رقص اُس کی اپنی کسی کاریگری کا نتیجہ نہیں ہوتا وہ اُس کی فطرت کے اندر ہوتا ہے' از خود سرزد ہوتا ہے لیکن خدا نے وہ خصوصیت پیدا کی ہے اس لیے خدا ''مستحق حمد'' ہے اور طاؤس ''مستحق مدح'' ہے۔

''حمد'' کے لیے تیسری شرط

تیسری شرط یہ ہے کہ ''حمد'' کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ''حمد'' کرنے والے کے دل کی آواز ہو۔ کسی کے دباؤ میں اُس کی تعریف کرنا ''حمد'' نہیں' مدح کہلائے گا' نہ ہی ''حمد'' میں ملمع کاری' نمائش' منافقت یا کسی کو بنانے کے لیے تعریف کرنے کا کوئی دخل ہوسکتا ہے۔ ''حمد'' میں جذباتِ تحسین بے ساختہ زبان پر آجاتے ہیں۔ یوں کہیے کہ کسی مصور کے نادر شاہکار کو دیکھ کر' مونا لیزا (Mona Lisa)[1] کے تبسم کو دیکھ کر' بے ساختہ زبان سے آہا ہا نکل جائے' اسے ''حمد'' کہا جائے گا۔ اس میں تصنع نہیں' آورد نہیں' بناوٹ نہیں' دل سے بے ساختہ تحسین و آفریں کے اچھے جذبات کا جو اظہار ہوگا اُسے ''حمد'' کہا جائے گا۔

---

[1] Mona Lisa (It is the) most valuable painting and widely recognized as the most famous in the history of Art. The Mona Lisa (La Gioconda) by Leonordo da Vinci (1452-1519) in the Louvre, Paris, France was assessed for Insurance Purposes at $100 million for its move to Washington, Dc, USA and New York City for exhibition from14 Dec. 1962 to 12 Mar. 1963. However, Insurance was not concluded because the cost of the Closest security precautions was less than that of the premuiums. It was painted c. 1503-07 and measures 77x53 cm 30.5x20.9 in. It is believed to portray either Mona (Short for Madonna) Lisa Gherardini, the wife of Francesco del Giocondo of Florence, of Constanza d` Avalos, coincidentally nicknamed La Gioconda, mistress of Giuliano de Medici. King Francis 1 of France bought the painting for his bathroom in 1517 for 4000 gold florins, or 15.3 kg 92 oz of gold. (Mc Farlan, Donald (Ed.): the Guinness Book of Records 1992, Guinness Publishing Ltd. Spain, October 1991. p.180)

''حمد'' کی چوتھی شرط

اگلی شرط یہ ہے کہ جس چیز کی ''حمد'' کی جا رہی ہو' اُس کا ٹھیک ٹھیک علم ہونا بھی ضروری ہے۔ محض گمان کی بنا پر ''حمد'' نہیں کی جاسکتی۔ مبہم تصورات' دھندلے نقوش' شکوک اور تذبذب پیدا کرنے والے خیالات' کبھی ''حمد'' کا جذبہ پیدا نہیں کر سکتے۔ ''حمد'' فروعی تخیل' توہم پرستی' اور اندھی عقیدت سے نہیں ابھرتی۔ اس کا سرچشمہ وہ یقین محکم ہوتا ہے' جو علی وجہ البصیرت حاصل ہو۔ اگلی شرط یہ ہے کہ جن نفع بخش' کشش انگیز رعنائیوں اور حسن وتناسب کے شاہکاروں کی حمد کی جا رہی ہو' اُن کے لیے ضروری ہے کہ وہ درجہ کمال تک پہنچ چکے ہوں اور اُن کی نفع بخشیاں محسوس ہوں۔ جو آپ خود تکمیل تک نہ پہنچا ہو یا جو انسانیت کے لیے نفع بخش نہ ہو' وہ مستحق حمد وستائش نہیں ہوتا۔ آرٹ برائے آرٹ مضرت رساں تو ہوسکتا ہے' سزاوارِ حمد نہیں ہوسکتا' اس لیے کہ مستحق حمد وہی شے ہوگی جو نوعِ انسانی کے لیے نفع بخشی کا موجب ہوگی۔ یہ ہے لفظ ''حمد'' کا مفہوم۔

دنیا کی کسی زبان میں بھی لفظ ''حمد'' کا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا

عزیزانِ من! محاورۂ عرب کی رو سے لفظ ''حمد'' کے اس مفہوم کی روشنی میں آپ بتایئے کہ کیا دنیا کی کسی زبان میں اس کا ترجمہ ہوسکتا ہے؟ کیا اردو زبان کا لفظ تعریف یا انگریزی زبان کا لفظ Praise اس مفہوم کا حامل ہوسکتا ہے؟ اور پھر قرآنِ کریم نے تو اس کو الحمد کہا ہے۔ جب اس لفظ پر الف لام یعنی ال آجائے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہر قسم کی حمدّیت اپنے انتہائی درجے میں صرف خدا کے لیے ہے' اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہوسکتا۔

''الحمد'' کی وسعتوں کا اندازہ تسخیر کائنات سے ہی ممکن ہے

عزیزانِ من! جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات' انسان کے قیاس وخیال وگمان ووہم سے بھی ماوراء ہے' اس لیے اس کی ذات کا محض ذہنی تصور ''حمد'' کے جذبات بیدار نہیں کرسکتا کیونکہ ''حمد'' کی شرط اولیں یہ ہے کہ وہ شے محسوس (Concrete) ہو۔ لہٰذا جس طرح کسی تصویر کی تحسین سے درحقیقت' مصور کی حمد مقصود ہوتی ہے' اسی طرح خدا کی حمد اس کی مخلوق کی رعنائیوں اور نفع بخشیوں کو کام میں لانے ہی سے ہوسکتی ہے۔ اس نے خود کہا ہے کہ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (17:44) کائنات کی ہر شے اپنے خالق کی حمد کی منہ بولتی تصویر ہے۔ اس میں لفظ تصویر بھی آیا ہے۔ اس کا مفہوم اپنے مقام پر آئے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ خدا کی حمد اس کی پیدا کردہ کائنات پر غور وفکر ہی سے ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے مومنین کی ایک صفت یہ بھی بتائی ہے کہ وہ حامدون (9:112) ہوتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب حمد خداوندی مظاہر فطرت پر غور وتدبر کی رو سے ہی ممکن ہے تو مومنین کا بنیادی فریضہ یہ

ہو گا کہ وہ اشیائے کائنات پر غور و فکر کریں' کائنات کے مختلف گوشوں میں تحقیقات کریں اور اُن کے محسوس نتائج کی نفع بخشیوں کو نوعِ انسانی کے لیے عام کر کے حمد خداوندی کا عملی ثبوت دیں۔

اربابِ فکر و نظر کی تعریف قرآنِ حکیم کے آئینہ میں

یہی ہیں وہ اربابِ فکر و نظر' جن کے لیے خدا نے کہا ہے کہ اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ (3:189) یہ حقیقت ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کی تخلیق اور رات اور دن کی گردش میں صاحبانِ عقل و بصیرت کے لیے حقیقت تک پہنچنے کی بڑی نشانیاں ہیں۔ صاحبانِ عقل و بصیرت وہ لوگ ہیں جو اَلَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ (3:190) اٹھتے بیٹھتے لیٹے ہر آن قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں وَیَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ تخلیقِ ارض و سماء پر غور و فکر کرتے ہیں اور جب کائنات کی ان اشیاء میں ریسرچ کرنے کے بعد خالق فطرت کی ندرت کاریاں اور نفع بخشیاں ان کے سامنے بے نقاب ہو کر آتی ہیں تو وہ بے اختیار پکار اٹھتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا (3:190) اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو نے اس سلسلۂ کائنات کو نہ تو بے مقصد پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی مقاصد کے لیے۔ یہ ہے خدا کی حمد اور یہ ہیں وہ اربابِ فکر و نظر جنہیں حامدون کہا جائے گا یعنی خدا کی حمد کرنے والے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ [1] علماء کہہ کر پکارا ہے۔

قرآنِ حکیم نے تو اِن ''حامدون'' کو علما کہا ہے

آپ حیران ہوں گے کہ ہمارے ہاں تو علماء کا تصور ہی کچھ اور ہے لیکن ذرا دیکھیے کہ قرآنِ کریم کن لوگوں کو علماء کہتا ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً (35:27) کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ خدا کا نظامِ آب رسانی کس قدر تعجب انگیز اور حکمت انگیز ہے' وہ فضا کی بلندیوں سے بارش برساتا ہے وَاَخۡرَجۡنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخۡتَلِفًا اَلۡوَانُهَا (35:27) اور اس ایک ہی پانی سے طرح طرح کی روئیدگی' پھل' پھول' اناج وغیرہ پیدا کرتا ہے وَمِنَ الۡجِبَالِ جُدَدٌۢ بِیۡضٌ وَّحُمۡرٌ مُّخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُهَا وَغَرَابِیۡبُ سُوۡدٌ (35:27) اور کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ یہ پہاڑ' یونہی جامد مادہ کی ساکت و صامت تصویر نظر آتے ہیں' یہ خدا کے نظامِ ارتقاء کی کتنی عظیم الشان نشانیاں اپنے اندر لیے ہیں۔ اِن کی پہچان سے جو کہیں سرخ ہیں' کہیں سفید اور کہیں کالے بھجنگ۔ اِن کی ایک ایک تہہ کتنے کتنے طویل المیعاد ادوار کی تاریخ اپنے دامن میں سمٹائے ہوئے ہے وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالۡاَنۡعَامِ مُخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُهٗ

---

[1] (35:28)

کَـذٰلِکَ (35:28) اور پھر انسانوں پر، مال مویشی پر، اور کرۂ ارض پر موجود دیگر جاندار مخلوق پر غور کرو کہ یہ کس طرح بے شمار انواع میں بٹی ہوئی ہے اور ان میں کی ہر نوع کس قدر جداگانہ خصوصیات کی حامل ہے۔ مگر یہ تمہاری کم علمی اور کوتاہ نگہی ہے کہ تم تحقیق سے کام نہیں لیتے اور اشیائے کائنات کو محض سرسری نظروں سے دیکھ کر آگے بڑھ جاتے ہو لیکن خدا کے بندوں میں سے اربابِ علم وحکمت، جب ان پر غور وفکر کرتے ہیں، تو وہ اُس کی عظمت وجبروت کے نشانات کو پا کر پکار اٹھتے ہیں کہ اِنَّـمَـا یَـخۡشَـی اللّٰـهَ مِنۡ عِبَادِهِ الۡعُـلَـمَـآءُ (35:28) درحقیقت خدا کی عظمت سے وہی لوگ کپکپا اٹھتے ہیں، جو اِن اشیائے کائنات پر اتھاہ گہرائیوں سے غور وفکر کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں انہی کو علماء کہا گیا ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک مومن کا فریضہ تسخیر کائنات کے بعد اس کے محاصل کو کھلا رکھنا ہے

اب آپ غور فرمالیجیے کہ قرآن کن لوگوں کو علماء کہتا ہے اور ہمارے ہاں یہ اصطلاح کن لوگوں کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ یہ علماء کا لفظ یوں سمجھ لیجیے کہ جن معنوں میں ہم آج کل سائنٹسٹ کہتے ہیں، ان معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ انہی کے لیے دوسری جگہ کہا ہے کہ اِنَّ فِـی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ (45:3) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں مومنین کے لیے نشانیاں ہیں۔ یہ نظر آیا کہ مومن کا فریضہ یہ ہے کہ وہ خارجی کائنات کے نظام پر غور وفکر کرے۔ اسی سے فی الحقیقت خدا کی تخلیق پر، خدا کی صفات پر، خدا کی قدرت پر، وہ ایمان پیدا ہوتا ہے کہ جس سے انسان بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ فی الواقع مستحق حمد اسی کی ذات ہو سکتی ہے، کسی اور کی نہیں، اسی لیے اسے مومنین کا فریضہ کہا اور دوسری جگہ ہے کہ اِنَّ فِی اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَّــقُــوۡنَ (10:6) وہ لوگ جنہیں متقی کہا جاتا ہے، یہ وہی لوگ ہیں، جو اختلافِ لیل ونہار پر، اللہ تعالیٰ کی کائنات کی تخلیق پر، اور ان تمام چیزوں پر، غور وفکر کرتے ہیں اور یہ چیزیں ان کے لیے خدا کی ذات پر ایمان پیدا کرنے کے لیے نشانیاں بن جاتی ہیں۔ تو علماء بھی یہی ہیں، مومن بھی یہی ہیں اور متقی بھی یہی ہیں۔ اس سے آپ کے دل میں یہ خیال گزرتا ہوگا کہ اِس انداز سے، اس مفہوم کے اعتبار سے، قرآنِ کریم کی اِن شرائط کے اعتبار سے، تو پھر علماء تو غیر یورپ کی اقوام کے سائنٹسٹ ہی ہیں۔ کیا مومن اور متقی بھی وہی لوگ ہوں گے؟ یہ بڑا ہی اہم سوال ہے اور گہری سوچ کا متقاضی۔

کیا یورپ کے سائنٹسٹ مومن بھی ہیں؟

عزیزانِ من! اشیائے کائنات پر غور کرنے کے ساتھ ایک اور چیز بھی ہے جسے قرآنِ کریم نے خدا کی ''حمد'' کا موجب بتایا ہے۔ یہ ساری چیزیں تو انسان کی طویل زندگی سے متعلق ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ اسے سفرِ حیات میں صحیح رہنمائی کی بھی ضرورت ہے اور یہ رہنمائی وحی کی رو سے ملتی ہے، جس کی آخری کڑی قرآنِ کریم میں محفوظ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو بھی مظہرِ حمدیت قرار دیا ہے جہاں فرمایا کہ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِہِ الۡکِتٰبَ وَلَمۡ یَجۡعَلۡ لَّہٗ عِوَجًا (18:1) ہر قسم کی حمد کی مستحق وہ ذات ہے جس نے اپنے بندے پر ایک ایسا ضابطہ قوانین' نازل کیا ہے کہ جس میں کسی قسم کا پیچ وخم نہیں۔ سیدھے راستے پر چلانے والا ضابطہ حیات ہے۔ گویا دو چیزیں ہوئیں' جن سے انسان حامد بن سکتا ہے اور قوم حامدون کے زمرے میں آ سکتی ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ کائنات کی قوتوں کو مسخر (Harness) کرے اور دوسرا یہ کہ اُن قوتوں کو وحی کی رو سے بتائی ہوئی اقدار کے مطابق' نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے صرف کرے۔ جب یہ دو چیزیں اکٹھی ہوں گی تو وہ قوم ہوگی کہ جنہیں حامدون کے زمرے میں شامل کیا جائے گا۔ ان میں سے اگر ایک چیز بھی کم ہوگی' تو وہ حامدون میں نہیں آئے گی۔

نبی اکرمؐ کے متعلق قرآنِ حکیم کا خراجِ تحسین

جس ذاتِ اقدس و اعظمؐ نے سب سے پہلے اس طرح خدا کی ''حمد'' کو عام کیا' اُسے خود اللہ نے احمد کہہ کر پکارا (61:1) یعنی بہت گہرا ''حمد'' کرنے والا اور اسی سے وہ ذات خود محمد ﷺ قرار پا گئی (48:29) یعنی جس کی مسلسل و پیہم ''حمد'' کی جائے۔ اُس کی حیاتِ طیبہ کے یہی عظیم کارنامے ہیں' جن کی بنا پر کہا گیا کہ وہ مقام محمود پر فائز ہے (17:79)۔ نبی اکرم ﷺ کے مقدس ہاتھوں سے وہ نظام قائم ہوا جسے دیکھ کر ساری دنیا پکار اٹھی کہ فی الواقع مستحقِ حمد وستائش ہے وہ خدا' جس نے ایسا انقلاب آفریں نظام عطا کیا اور اس کے بعد سزاوارِ حمد ہے وہ پیغمبرِ انقلاب' جس نے اُس نظام کو عملاً قائم کر کے دکھا دیا۔ اس نظام کا اولین نتیجہ یہ تھا کہ اس قوم کی جڑ کٹ گئی' جو کمزور انسانوں پر ظلم واستبداد روا رکھتی تھی۔ اُس کا یہ وہ نفع بخش کارنامہ تھا' جس سے حمدِ خداوندی ابھر اور نکھر کر دنیا کے سامنے آ گئی۔ اس کے پیشِ نظر کہا گیا کہ فَقُطِعَ دَابِرُ الۡقَوۡمِ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ؕ وَالۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (6:45) ظلم کرنے والی قوم کی جڑ کٹ گئی' اس طرح رب العالمین کی حمد سطحِ عالم پر منقوش ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے انقلاب کے لیے ذاتِ خداوندی کے جلالی گوشے کی نمود بھی ضروری ہو گی یعنی حسنِ تخلیق کی رعنائیوں کے ساتھ غلبہ اور قوت کا مظاہرہ بھی۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے جلال اور جمال' تحسین اور قوت' دونوں کا سرچشمہ خدا کی ذات کو قرار دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ لَہُ الۡمُلۡکُ وَلَہُ الۡحَمۡدُ (64:1) اقتدار کا سرچشمہ بھی وہی ہے اور ''حمد'' کا سرچشمہ بھی وہی ہے۔ اگر کائنات میں جمالیات کے ساتھ جلالیات کی نمود نہ ہو تو یہ نظام تباہ ہو کر رہ جائے گا۔ اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں:

حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے
اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری ❶

[ارمغانِ حجاز]

---

❶ ڈاکٹر اقبالؒ (1877-1938) نے ''ضربِ کلیم'' میں اسے یوں کہا:

فولاد کہاں رہتا ہے شمشیر کے لائق
پیدا ہو اگر اس کی طبیعت میں حریری

دوسری طرف جو قوت اقتدار حمدیت کی نذر نہ ہو وہ فرعونیت اور چنگیزیت بن کر رہ جاتی ہے یعنی......

''جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی''

قندیل آسمانی کے ساتھ شمشیر خارہ شگاف بھی

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اُس میں آسمانی رہنمائی کے ساتھ شمشیر خارہ شگاف (فولاد) بھی نازل کی ہے (57:25)۔ ان دونوں کے امتزاج سے نظامِ زندگی قائم رہ سکتا ہے۔ اقبالؒ (1938-1877) کے الفاظ میں ''اگر قوت کا نگران قرآن نہ ہو، تو وہ چنگیزیت ہو جاتی ہے اور قرآن کے پاس قوتِ نافذہ نہ ہو، تو وہ محض وعظ بن کر رہ جاتا ہے۔'' لہٰذا جماعتِ مومنین ان دونوں صفاتِ خداوندی کے بروئے کار لانے سے ''حامدون'' بنتی ہے۔

ان تصریحات سے آپ اندازہ لگا لیجیے کہ جب، ایک عبدِ مومن، ایک مسلمان الحمد للہ کہتا ہے، تو اس کا مفہوم کیا ہوتا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ ''حمدیت'' زبان سے چند الفاظ دہرانے کا نام نہیں۔ الحمد للہ، الحمد للہ کہنے سے ''حمدیت'' کا فریضہ ادا نہیں ہوتا۔ یہ ایک ایسے نظام کے بروئے کار لانے سے عبارت ہے، جس میں فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں آسمانی رہنمائی کے مطابق، نوعِ انسان کی عالم گیر ربوبیت کے لیے، عام کیا جائے اور جو قوتیں اس کی راہ میں حائل ہوں، انہیں راستے سے ہٹا دیا جائے۔ یہ ہے سورۂ فاتحہ کے پہلے دو لفظ: الحمد للہ۔ مکمل طور پر، ساری کی ساری اپنی انتہائی شکل میں جو ''حمدیت'' ہے، وہ اللہ کے لیے ہے۔ ''حمد'' کے معنی اور مفہوم تو ہم نے سمجھ لیے۔ اس میں اللہ کے لیے کہا ہے کہ یہ خدا کی ذات کا نام ہے، جس کی مختلف صفات الاسماء الحسنیٰ کے انداز میں، قرآن میں پھیلی ہوئی ہیں۔ آیئے اب ہم دیکھیں کہ اللہ کے کیا معنی ہیں۔

الحمد اللہ کے بعد لفظ اللہ کا قرآنی مفہوم

میں سمجھتا ہوں کہ اس مقام پر آپ کے دل میں یقیناً یہ سوال پیدا ہوگا کہ اللہ کا لفظ تو اتنا عام ہے، اتنا معروف ہے، اس قدر استعمال میں آتا ہے، کہ ہم ایک ایک لفظ کے بعد، ایک ایک سانس میں، اس کو بولتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ جب ہم اللہ کہتے ہیں، ہمارا اس پر ایمان ہے، وہ خدا ہے، تو اس کے مفہوم سمجھنے میں کیا دقت ہوگی اور اس کی اتنی لمبی چوڑی ضرورت کیوں پیش آئے گی لیکن جب آپ کے سامنے اس کا مفہوم آئے گا تو آپ پھر مجھ سے متفق ہوں گے کہ اتنا ہی نہیں کہ اس کی ضرورت کیوں تھی، بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کا صحیح مفہوم کیا ہے، اس کے جاننے کی اشد ضرورت ہے۔

دنیا کے سیاح اور مغربی محققین اگر کسی ایسے علاقے میں بھی پہنچے ہیں' جہاں اُن سے پہلے کسی باہر کے انسان کے نقوشِ قدم تک دکھائی نہیں دیئے اور وہاں کے باشندے تہذیب وتمدن سے قطعاً ناآشنا تھے' وہ ابتدائی دورِ زندگی یعنی ابتدائی دورِ جہالت کی زندگی' بسر کررہے ہیں تو اگرچہ وہ اپنی طرزِ بود و باش اور اندازِ معیشت ومعاشرت کے ہر گوشے میں باہر کی دنیا سے مختلف تھے' بایں ہمہ ان کے ہاں بھی کسی غیر مرئی بلند و بالا قوت کا تصور پایا گیا' جس کی وہ پرستش کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ایک اور حقیقت بھی سامنے آئی۔ وہ یہ کہ جہاں اس قسم کی ہستی کا ایک خاص مقام ہر جگہ موجود ہے مگر اس کا تصور یا تفاصیل ہر مقام پر مختلف ہیں اور یہی وہ اختلافات ہیں جہاں ہر قبیلے کا خدا دوسرے قبیلے کے خدا سے مختلف ہے اور ہر مذہب کا معبود دوسرے مذاہب کے معبود سے جداگانہ ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ رحمٰن بھی وہی اور رحیم بھی وہی ہے' یہ حقیقت سے بے خبری کی دلیل ہے اور فریب تخیل ہے' یا دانستہ ثنویت ہے۔ یہودیوں کا یہودا' عیسائیوں کا فادر' ہندودھرم کا ایشور' یا اُن کے ویدان کا پرماتما' مجوسیوں کا یزداں' یہ تمام ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں اور قرآن کا اللہ ان سب سے الگ ہے۔

ہر مذہب کا خدا دوسرے مذہب کے خدا سے مختلف کیوں؟

برادرانِ عزیز! ان مذاہب کے بانیوں نے جنہیں ہم زمرۂ انبیائے کرام ☐ میں شمار کرسکتے ہیں' دین کے بانی نہیں' بلکہ دین خداوندی کے پہنچانے والے کہا جائے گا' خدا کی وہی صفات بیان کی ہوں گی جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں لیکن بعد میں اُن میں انسانی خیالات وتصورات کی آمیزش ہوگئی اور اس طرح مختلف مذاہب کے خدا نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے مختلف ہوگئے بلکہ خدا کے حقیقی اور منزہ تصور سے بھی جداگانہ تصور کے پیکر بن گئے۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ سُبۡحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوۡنَ (6:100) یہ لوگ خدا کے متعلق جو تصور پیش کرتے ہیں' وہ اس سے بہت بلند و بالا ہے اور خدا کا تصور وہی صحیح ہوسکتا ہے' جسے اس نے خود پیش کیا ہے' اور یہ تصوراب قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے۔ بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ جب تک خدا کا کوئی تصور ہمارے سامنے نہیں آتا' اس لفظ کا مفہوم ہمارے سامنے نہیں آتا' دین کی بنیاد ہی استوار نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا یہ نہایت ضروری ہے کہ پہلے یہ دیکھا جائے کہ اللہ کے لفظ کا مفہوم کیا ہے؟

آپ کو یاد ہے کہ میں نے الحمد للہ میں کہا تھا کہ عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ جب کسی لفظ سے پہلے الف لام (ال) لگا دیا جائے تو اس کے معنی ایک تو یہ ہوتے ہیں کہ ہر قسم کی وہ صفت اسی میں پائی جاتی ہے' دوسرا یہ ہوتا ہے کہ وہ صفت بلندترین درجے کی' غایت درجے کی' انتہا درجے کی' اس کے اندر پائی جاتی ہے۔ اس کے سوا اس انداز کی صفت کسی اور میں نہیں پائی جاتی۔ اس لیے جب ہم اللہ کہتے ہیں تو یہ ہے: ال الـلـه . اس کے معنی یہ ہوں گے کہ الٰہ کوئی اور نہیں ہوسکتا' الٰہ صرف اللہ ہوسکتا ہے اور جب ہم کہتے ہیں کہ لا الہ الا اللہ' تو آپ دیکھیے کہ وہی بات ہوگئی کہ کوئی الٰہ نہیں ہوسکتا سوائے اللہ کے۔ تو آپ دیکھیے کہ الٰہ کے بنیادی معنی کیا ہیں؟ الٰہ کا مادہ ہے: ا ل ہ. اور اس میں

بنیادی طور پر متعدد معانی پائے جاتے ہیں۔ ان میں پہلا یہ ہے کہ گھبرا کر کسی کی پناہ ڈھونڈنا یا اُسے پناہ دینا' دوسرے یہ کہ متحیر ہونا ' تیسرے یہ کہ بلند مرتبہ اور نگاہوں سے پوشیدہ ہونا اور چوتھے' جو بنیادی چیز ہے' یہ کہ کسی کی غلامی یا محکومیت اختیار کرنا یعنی کسی کا غلبہ اور اقتدار تسلیم اور قبول کرنا۔ الٰہ کے معنی ہوتے ہیں: صاحبِ اقتدار' صاحبِ اختیار۔ اور اس کے معنی ہوتے ہیں ''وہ جس کی محکومیت اختیار کی جائے۔'' لہٰذا جب ہم کہیں گے کہ لا الٰہ الا اللہ تو اس کے معنی ہوں گے کہ دنیا میں' کائنات میں' کوئی صاحب اقتدار نہیں سوائے اللہ کے۔ تو اب یہ جو خصوصیت ہے' جسے آپ الوہیت کہہ لیجیے یعنی صاحبِ اقتدار ہونا' حاکم ہونا' وہ جس کی اطاعت کی جائے' وہ جس کی محکومیت اختیار کی جائے' خدا کے سوا کائنات میں کوئی اور نہیں ہے۔ تو آپ دیکھ لیجیے کہ اس میں کس قدر اتفاق پایا گیا۔ اس میں توحید کا کس قدر گہرا مقصد سامنے آ گیا اور اس سے یہ بھی بات سامنے آئی کہ ہمارا اور خدا کا تعلق کیا ہے۔

عقل انسانی ذاتِ باری تعالیٰ کا ادراک کر ہی نہیں سکتی

میں نے یہ اس لیے دوبارہ کہا ہے کہ ذاتِ خداوندی کے متعلق تو ہمارے قیاس اور خیال اور گمان اور وہم میں بھی کچھ نہیں آ سکتا۔ اس نے کہا ہے کہ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَار (6:104) انسانی بصیرت' انسانی فطرت' انسانی آنکھیں تو ایک طرف رہیں' اس کی بصیرت اور اس کی فکر بھی خدا کے متعلق صحیح طور پہ کچھ نہیں معلوم کر سکتی۔ جو کچھ خدا نے خود بتایا ہے' اس کے متعلق وہی کچھ ہم جان سکتے ہیں۔ اس کے سوا' اس کے علاوہ' کچھ نہیں جان سکتے۔ لہٰذا الٰہ کے معنی یہ ہو گئے: وہ جس کی محکومیت اختیار کی جائے۔ اللہ کے معنی ہو گئے کہ صرف اس کی محکومیت اختیار کی جائے گی' کسی اور کی محکومیت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں یہ کہا ہے کہ دنیا میں جتنے بھی مذاہب ہیں' جتنے بھی خدا کو ماننے والے ہیں یا اقرار کرنے والے ہیں کہ ہم خدا کو مانتے ہیں' اُن کا اپنے اپنے تصور کے مطابق خدا کو مان لینا ایمان نہیں کہلا سکتا' اُن کا ایمان قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے اس نے کہا ہے کہ ان سب سے خواہ وہ اہلِ کتاب ہوں' خواہ وہ کفار ہوں' خواہ وہ مشرکین ہوں' اُن سب کے متعلق کہا ہے کہ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (2:137) اگر یہ لوگ اس طرح خدا پر ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو پھر سمجھا جائے گا کہ یہ صحیح راستے پر چل رہے ہیں۔

اصل سوال اللہ تعالیٰ کے اس تصور کا ہے جسے خود قرآن پیش کرتا ہے

اب یہاں پھر سوال یہ پیدا ہوگا کہ خدا تو کسی کے سامنے نہیں آتا' ہم اُس کی آواز بھی نہیں سن سکتے' اُس کو دیکھ بھی نہیں سکتے' تو اس کی محکومیت کس طرح اختیار کی جائے گی؟ یہ چیز ہے جو اصلِ دین ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ محکومیت کسی شخص کی اختیار نہیں کی جائے گی۔ محکومیت قوانین کی اختیار کی جائے گی' احکام کی اختیار کی جائے گی' خدا کے الٰہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ انسانوں کے لیے احکام و قوانین دینا' صرف خدا کے لیے ہے۔ دنیا میں کوئی انسان کسی دوسرے کو اپنے حکم یا اپنے قانون کا محکوم نہیں بنا سکتا۔ اگر کوئی شخص اس کا دعویٰ کرتا

ہے تو وہ خدا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور اگر کوئی شخص اس دعویٰ کو مانتا ہے یا اس کی تعمیل کرتا ہے' تو وہ خدا کے ساتھ شرک کرتا ہے۔ خدا نے اسی لیے کہا ہے کہ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖ اَحَدًا (18:26) خدا نے اپنے حقِ حکومت میں کسی دوسرے کو شریک نہیں کیا' کوئی اس میں شریک نہیں ہوسکتا۔ اس کے جو آداب وقوانین ہیں' جسے ہم کہیں گے کہ وہ الوہیت کے مظہر ہیں' جو وہ قوانین ہیں' جو وہ احکام ہیں' جو وہ اقدار ہیں' وہ تمام قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں اور یہی چیز ایمان اور کفر میں خطِ امتیاز ہے' چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44) جو شخص بھی خدا کے نازل کردہ قوانین واحکام واقدار کی اطاعت نہیں کرتا' اُن کی محکومیت اختیار نہیں کرتا' اُن کے مطابق فیصلے نہیں لیتا' تو یاد رکھیے! انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔ لہٰذا مومن یا ایمان لانے والا وہ ہے' جو صرف خدا کو الٰہ مانے' یعنی صاحبِ اقتدار مانے' صرف اس کے عطا کردہ' نازل کردہ' قوانین واحکام کی محکومیت اختیار کرے۔ اس کے سوا اگر کسی اور کی بھی محکومیت اختیار کی' کسی اور کو صاحبِ اقتدار مان لیا تو وہ حقیقت میں اُسے الٰہ مان لینا ہوگا۔

اقدار باری تعالیٰ میں کسی دوسری قدر کو شامل کرنا شرک ہے

عزیزانِ من! اب اس اعتبار سے وہ اللہ (ال الٰہ) نہیں رہے گا بلکہ ہم اس کے ساتھ کسی اور کو بھی الٰہ مان لیں گے۔ اللہ کا نام جپنا یا اللہ پر ایمان کا دعویٰ رکھنا اور اس کی صفتِ الوہیت کے اندر' اس کے اقتدار کے اندر' کسی اور کو شامل کرنا' شرک ہوگا۔ یہ خدا پر ایمان نہیں ہو گا' اس کی توحید نہیں ہوگی۔ مثال کے طور پر آپ یورپ کی اقوام کو لیجیے۔ اُن میں چند ایک کے سوا ہر شخص خدا پر ایمان رکھتا ہے۔ He believes in God [1] کہا جاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ قرآنِ کریم میں ان کے اس ایمان کو ایمان ہی نہیں مانتا۔ اس لیے کہ انہوں نے اپنے ہاں نظامِ حکومت وہ رائج کر رکھا ہے جو انسانوں کا بنایا ہوا ہے' وہ انسانوں کے وضع کردہ قوانین کے تابع زندگی بسر کرتے ہیں' خواہ وہ کسی ایک فرد کا بنایا ہوا قانون ہو جسے آپ ڈکٹیٹر کہہ لیں' جسے پرانے زمانے میں بادشاہت یا ملوکیت کہا جاتا تھا اور خواہ وہ انسانوں کے کسی ایک گروہ کا بنایا ہوا قانون ہو' جسے آپ جمہوریت کہتے ہیں۔ ڈیموکریسی کہتے ہیں' مغرب ہی میں نہیں بلکہ آج تو ساری دنیا میں یہی نظام چل رہا ہے۔ یہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی محکومیت اختیار کرنا ہے۔ حقیقت میں اس نظام کو سیکولرازم کہا جاتا ہے یعنی دعویٰ یہ کرنا کہ ہم خدا کو مانتے ہیں لیکن نظامِ حکومت انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے تابع چلتا ہے اور اس باب میں بڑے فخر سے کہا جاتا ہے کہ جمہوریت بہترین نظام ہے یعنی ایک فرد کا بنایا ہوا قانون نہیں بلکہ ایک گروہ کا بنایا ہوا قانون ہے' جن کو قانون بنانے والوں میں اکثریت حاصل ہوتی ہے تو قرآن تو اس کو ایمان مانتا ہی نہیں ہے۔ وہ ایک شخص کے قوانین ہوں' اکثریت کے قوانین ہوں' بلکہ تمام

---

[1] وہ خدا پر ایمان رکھتا ہے۔

انسانوں کے مل کر متفق علیہ قوانین ہوں، وہ اس کو تو خدا پر ایمان مانتا ہی نہیں۔ [1]

خارجی کائنات میں اللہ تعالیٰ کے قانون کا اعتراف اور انسانی زندگی میں اُس کے آئین سے انکار کیوں؟

خدا پر ایمان تو اسی کا ہے جو اسے الٰہ مانتا ہے، اس کے سوا کسی اور کو الٰہ نہیں مانتا ہے اسی لیے قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پہ یہ کہا گیا ہے کہ اگر تم ان لوگوں سے پوچھو کہ کائنات کو کس نے پیدا کیا، تو یہ کہیں گے خدا نے پیدا کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان سے پوچھو کہ زمین اور اجرامِ فلکی اور شمس و قمر کس کے قوانین کے تابع سرگرمِ عمل ہیں، تو یہ کہیں گے کہ خدا ہی نے انہیں پیدا کیا ہے اور اسی کے قوانین کے تابع یہ اس طرح سرگرمِ عمل ہیں۔ پھر وہ کہتا ہے کہ اِن سے پوچھو کہ وہ کون ہے جس کے قوانین کے مطابق آسمان سے بارش ہوتی ہے، جس سے زمینِ مردہ حیاتِ نو حاصل کر لیتی ہے، تو یہ کہیں گے کہ ایسا خدا ہی کے قوانین سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے اور یہ غور طلب بات ہے کہ جب یہ خارجی کائنات میں قوانینِ خداوندی کی کارفرمائی کو تسلیم کرتے ہیں تو انسانی دنیا میں اس کے قوانین کی ضرورت سے کس طرح انکار کر سکتے ہیں، یہاں پہنچ کر انہیں کون سی بات دھوکا دے دیتی ہے! فَاَنّٰی تُسۡحَرُوۡنَ (23:84)۔

یہ اللہ تعالیٰ کی حقیقت ''الحمد'' سے انکاری ہے

ان کی عقل و فکر پر کیوں پردے پڑ جاتے ہیں (29:61) وہ کہتا ہے کہ قُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ (29:63)۔ اُن سے کہو کہ یہ الحمد صرف خدا کے لیے ہے اور اس میں پہلے لفظ حمد آیا تھا۔ تو حمد کے اندر سب سے بڑی چیز تو یہی آتی ہے کہ صاحبِ اقتدار وہی ہے، اختیارات صرف اس کے ہاتھ میں ہیں، حقِ حکومت صرف اس کے قوانین کو حاصل ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ خارجی کائنات میں جتنے Laws of Nature [2] (قوانین فطرت) ہیں، وہ تو خدا کے بنائے ہوئے ہیں، مگر انسانوں کی زندگی میں ہم اپنے وضع کردہ قوانین کے تابع زندگی بسر کریں گے، صریحاً قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن اسے خدا پر ایمان تسلیم ہی نہیں کرتا۔

---

[1] اس کی تشریح و تبیین کے لیے دیکھیے: پرویزؒ کا پمفلٹ: مقصود بالذات کون ہے؟ فرد یا مملکت۔ اس کا انگریزی ترجمہ اور تدوین پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق کے قلم سے اس نام سے چھپا ہے: What is the genuine end? The Individual or the State یہ پمفلٹ (اردو اور انگریزی) ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، 25/بی گلبرگ، لاہور، پاکستان سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

[2] قوانینِ فطرت کی سائنسی تشریح و تبیین کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2005، ص 315 (فٹ نوٹ 1)

قرآنِ حکیم کی آڑ میں نظام سرمایہ دار کی پکار

عزیزانِ من! اس مقام پر ایک بات مجھے یاد آ گئی۔ رشیا❶ نے جب اپنے ہاں وہ نظام جاری کیا تو اس کا Counter (توڑ) کرنے کے لیے سرمایہ داری نظام کو ضرورت پیش آئی کہ وہ اُن کے مقابلے میں مسلمانوں کی تائید حاصل کریں۔ آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے اس کے لیے کیا حربہ استعمال کیا تھا؟ انہوں نے پراپیگنڈہ کیا کہ روس یا کمیونسٹ یا سوشلسٹ خدا کا انکار کرتے ہیں اور مسلمان خدا کو مانتے ہیں۔ انہوں نے پروپیگنڈے میں پہلی چیز تو یہ کی کہ خدا کے انکار کرنے والوں کا خدا کے اعتراف کرنے والوں کے ساتھ کسی طرح سے کسی قسم کے کوئی مفاہمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہوں نے اگلی بات یہ کہی کہ ہم تمام اقوامِ یورپ اور مغرب' جو عام طور پہ عیسائیوں اور یہودیوں پر مشتمل ہے' خدا کو مانتے ہیں۔ مسلمان بھی خدا کو مانتے ہیں' صرف یہ کمیونسٹ خدا کو نہیں مانتے۔ اس لیے انہوں نے اتحاد کے لیے نعرہ دیا کہ:

Believers in God, unite together ❷

آؤ' خدا کے ماننے والو! ان کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنائیں۔ گویا انہوں نے بھی اپنے آپ کو خدا کا ماننے والا قرار دے کر مسلمانوں کے ساتھ ایک متحدہ محاذ بنانے کی بنیاد قائم کی۔ یہ الگ بات ہے کہ خود مسلمانوں کے ہاں بھی خدا کی الوہیت کوئی نہیں مان رہا لیکن انہوں نے تو کہا کہ ہم خدا کو ماننے والے ہیں۔

قرآنِ کریم تو ایک ایک قدم پہ یہ کہتا ہے کہ محض Laws of Nature (قوانینِ فطرت) یعنی کائنات کے قوانین کے متعلق یہ کہنا کہ وہ خدا کے ہیں اور سارا نظامِ کائنات اس کے تابع چل رہا ہے اور انسانوں کی دنیا کے اندر یہ کہنا کہ یہاں احکام اور قوانین انسان خود وضع کریں گے' بالکل غلط ہے۔ اس نے کہا ہے کہ یہ خدا پر ایمان ہے ہی نہیں۔ اسی لیے میں اسے پھر دہرا دوں جو قرآن نے کہا تھا کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44) جو خدا کے نازل کردہ قوانین کی محکومیت اختیار نہیں کرتا' وہ اس کے الٰہ ہونے کو نہیں مانتا۔ لہٰذا' عزیزانِ من! ال الہ یا اللہ کا مفہوم یہ ہے کہ حقِ حکومت صرف اسی کو حاصل ہے۔ اسی لیے اسلام کا بنیادی تصور' بنیادی ایمان لا الٰہ الا اللہ پر ہے کہ خدا کے سوا کوئی صاحب اقتدار نہیں۔

رب تعالیٰ کے اقتدار کی محسوس شکل وصورت

اب اگلی بات یہ تھی کہ خدا کا یہ اقتدار کس طرح ہمارے سامنے آئے گا' ہم کیسے اس کی محکومیت اختیار کریں گے؟ اس کے لیے یہ کہہ

---

❶ سابقہ یو ایس ایس آر (USSR)

❷ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ انبیاء' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء' ص ص 61 تا 75 بمعہ انہی صفحات کے فٹ نوٹ

دیا کہ خدا نے جو پیغامات، جو احکام، نازل کیے تھے، محمد رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملے اور وہ آج انؑ کی کتاب کے اندر محفوظ ہیں۔ یوں خدا کی الوہیت پر ایمان لایا جائے گا۔ لہٰذا ''لا الٰہ الا اللہ'' کے ساتھ ''محمد رسول اللہ'' کہہ دیا۔ اس میں دو باتیں ہیں۔ ایک تو یہ بتا دیا کہ صرف خدا کی محکومیت اختیار کرنے کا عملی طریق کیا ہے؟ اور وہ طریق ہے ''خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے قوانین کی غایت پورا کرنا'' اور اس میں دوسری چیز یہ اخذ ہوگئی کہ کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل نہیں اور تو اور دنیا میں خدا کے بعد عظیم ترین شخصیت، محمد ﷺ کی ہوسکتی ہے لیکن محمد ﷺ کی بھی پوزیشن یہ نہیں کہ وہ صاحب اقتدار اور صاحب اختیار ہیں، خدا کی شانِ الوہیت میں شامل ہیں، بالکل نہیں۔ کہا کہ محمد ﷺ بھی اللہ کے رسول ہیں، اس کے احکامات دنیا تک پہنچانے کا واسطہ ہیں، خود احکامات مرتب اور وضع کرنے والے نہیں، اپنی حکومت قائم کرنے والے نہیں، حقِ حکومت تو صرف خدا کو حاصل ہے۔ یہ ہے، عزیزانِ من! اللہ پر ایمان کے معنی۔ اس باب میں تو قرآنِ کریم اس قدر گہرائی میں گیا ہے کہ جب اُس پر انسان غور کرتا ہے تو واقعی وجد میں آ جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دوسرے انسانوں کے احکام کا اتباع تو ایک طرف رہا، ان کی محکومیت اختیار کرنا تو شرک اور کفر ہے، وہ کہتا ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ اَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰهُ (25:43). دنیا میں تم ایسے لوگوں کو دیکھو گے کہ جو کسی دوسرے شخص کے احکام کا اتباع تو شاید نہ کریں یا کریں'' لیکن وہ ہر معاملے میں خود اپنے جذبات کا اتباع کرتے ہیں یعنی وہ اپنے جذبات کو اپنا الٰہ بنا لیتے ہیں۔ اُن کی جو اپنی خواہش ہوتی ہے، وہ اس کا اتباع کرتے ہیں، اپنے جذبات کے ماتحت چلتے ہیں، انہی سے فیصلے کراتے ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ یہ تو سب سے بڑا شرک ہے اور جب یہ ایسی چیز ہے تو کہا کہ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلۡمٍ وَّ خَتَمَ عَلٰی سَمۡعِهٖ وَ قَلۡبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً (45:23) جو اپنے ہی جذبات سے مغلوب ہو گیا، اپنے ہی جذبات کو اپنا الٰہ بنا لیا، تو پھر اس کی سمجھنے سوچنے دیکھنے بھالنے کی ساری قوتیں مسلوب ہو جاتی ہیں، ان پہ پردے پڑ جاتے ہیں، جذبات غالب آ جاتے ہیں۔ اس کی ایسی کیفیت ہوتی ہے جیسی ایک شرابی کی ہو کہ اس کی عقل و فکر کچھ کام ہی نہیں دیتی۔ پھر جس کی یہ کیفیت ہو جائے تو اس کے لیے کہا کہ فَمَنۡ یَّهۡدِیۡهِ مِنۡۢ بَعۡدِ اللّٰهِ (45:23) پھر اسے کون صحیح راستے پر لا سکتا ہے!! اس سے آپ نے الا اللہ کے معنی دیکھ لیے کہ قرآنِ کریم اپنے جذبات کے اتباع کو، اپنے جذبات کی محکومیت اختیار کرنے کو بھی، شرک قرار دیتا ہے۔

جذباتی قوت کو استعمال میں لانے کا طریق

یہاں ایک نکتے کی وضاحت ضروری ہے۔ یہ نہیں ہے کہ قرآن جذبات کو فنا کر دینے کی تاکید کرتا ہے۔ قطعاً نہیں۔ جذبات تو وہ محرک قوت ہیں، جن سے انسان جتنے کام کرتا ہے، وہ اسی قوتِ محرکہ کی بنا پر کرتا ہے۔ اگر دل کے اندر ہی جذبہ پیدا نہ ہو، اگر آرزو ہی آپ کے ہاں بیدار نہ ہو، تو آپ دنیا کے اندر نہ کوئی تخلیق کر سکتے ہیں، نہ کوئی دنیا کا کام کر سکتے ہیں۔ جذبہ تو نہایت ضروری ہے لیکن جذبات کو

بے زمام چھوڑ دینا' ان پہ کوئی پابندی عائد نہ کرنا' یہ ہے ان کو الٰہ بنانا۔ اسی لیے اس نے کہا ہے وَ مَنۡ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ ہَوٰىہُ بِغَیۡرِ ہُدًى مِّنَ اللّٰہِ (28:50) ظالم وہ ہے' مشرک وہ ہے' جو اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے اور خدا کی دی ہوئی وحی کو چھوڑ رہا ہے۔ ایسی صورت میں مثال یوں لیجیے کہ اگر پانی دریا کے ساحلوں کے اندر بہتا ہوا چلا جائے تو وہ صرف تعمیری نتائج پیدا کرتا ہے' امیدِ حیات ہے لیکن اگر وہ ان ساحلوں کو توڑ دے تو سیلاب بن جاتا ہے اور سیلاب سوائے تباہی کے کچھ اور نہیں ہے۔ انسانی جذبات کو اگر خدا کی نازل کردہ اقدار' احکام اور قوانین کے ساحلوں کے اندر رکھا جائے گا تو یہ جذبات تعمیری نتائج پیدا کریں گے۔ یہ نہایت ضروری ہے اور اگر انہیں بے بہا چھوڑ دیا جائے' بے لگام چھوڑ دیا جائے' تو یہی دریا سیلاب کی شکل اختیار کرے گا جو تباہیاں ہی تباہیاں بپا کرتا چلا جائے گا۔ یعنی آپ نے اپنا اقتدار' جذبات کے اعتبار پہ' اس طرح تسلیم کیا کہ ان کے اوپر خدا کے قوانین کی حاکمیت باقی نہ رہی۔ اس لیے دنیا میں انسان کو جتنی صلاحیتیں حاصل ہیں' جتنی استعداد حاصل ہے' جو ذرائع اور وسائل حاصل ہیں' اُن سب سے فائدہ اٹھانا' انہیں کام میں لانا' نہایت ضروری ہے بشرطیکہ انہیں خدا کی نازل کردہ اقدار و قوانین کے تابع رکھا جائے۔ اگر تابع رکھا جائے تو یہ عین اسلام ہے اور اگر ان کو بے بہا بنا دیا جائے' ان کے اوپر خدا کے قوانین کا غلبہ نہ تسلیم کیا جائے' تو یہ چیز کفر بھی ہے' شرک بھی ہے' تخریب بھی ہے' دنیا میں ہر قسم کا فساد برپا کرنے والی چیز ہے۔

ارض و سما کا مالک و حاکم صرف باری تعالیٰ کی ذات ہی ہے

عزیزانِ من! دو چیزیں ہمارے سامنے آئیں۔ ایک تو یہ کہ صرف یہ سمجھنا کہ خارجی کائنات میں خدا کے قوانین چل رہے ہیں' اس نے کائنات کو پیدا کیا اور یہ جو Laws of Nature (قوانین فطرت) ہیں' یہ خدا کے مقرر کردہ ہیں' ان کے مطابق یہ نظام سرگرمِ عمل ہے لیکن ہماری انسانوں کی زندگی میں ان کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ یہ چیز بھی خدا پر ایمان لانا نہیں ہے۔ قرآنِ کریم میں واضح طور پہ کہا ہے کہ وَ ہُوَ الَّذِیۡ فِی السَّمَآءِ اِلٰہٌ وَّ فِی الۡاَرۡضِ اِلٰہٌ (43:84) خارجی کائنات میں بھی وہی الٰہ ہے اور تمہاری اپنی زندگی میں بھی' وہی الٰہ ہے۔ وہی سماء کا الٰہ ہے' وہی ارض کا الٰہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر آپ اسے ارض کا الٰہ نہیں مانتے' یعنی اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں' خواہ اس کا کوئی بھی گوشہ کیوں نہ ہو' سیاسی ہو' معاشرتی ہو' معاشی ہو' آپ خدا کو الٰہ نہیں مانتے' تو آپ خدا پر ایمان نہیں رکھ رہے ہیں۔ اسی لیے اُس نے کہا ہے کہ لَوۡ کَانَ فِیۡہِمَاۤ اٰلِہَۃٌ اِلَّا اللّٰہُ لَفَسَدَتَا (21:22) اگر خارجی کائنات اور خود اس ارضی زندگی میں خدا کے سوا اور الٰہ ہوں تو اس میں فساد برپا ہو جائے یا یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔ یعنی اس کے ایک گوشے میں خدا کے قوانین نافذ ہوں اور دوسرے گوشے میں کسی اور کے' تو کائنات کا سارا سلسلہ تہس نہس ہو جائے لہٰذا فَسُبۡحٰنَ اللّٰہِ رَبِّ الۡعَرۡشِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ (21:22) اس پوری کائنات کا مرکزی کنٹرول جس میں خود انسانوں کی زندگی بھی شامل ہے' اسی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ

ان تصورات سے بہت بلند ہے جو لوگ اس کے متعلق خیالات رکھتے ہیں۔ جو باتیں لوگ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں' وہ اس سے بہت بلند و بالا ہے۔ اُس کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں ہے۔

عزیزانِ من! اب آپ نے سمجھ لیا کہ اللہ کا مفہوم کیا ہے اور یہ بھی سمجھ لیا کہ الٰہ کا جو ترجمہ ہمارے ہاں انگریزی میں God ہے' ہندوؤں کے ہاں ایشور' پرماتما ہے' مجوسیوں کے ہاں یزداں ہے' ہمارے ہاں فارسی کا لفظ خدا ہے جو اردو میں عام مستعمل ہے' وہ اللہ کا مفہوم نہیں ادا کر سکتے۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ ان چیزوں کا واقعی ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تو اپنی ذات میں محکم ہے۔ جب یہ لفظ اسی طرح رہے گا' تو اس کا مفہوم آپ سمجھ سکتے ہیں' بیان بھی کر سکتے ہیں لیکن اس کا ترجمہ کسی ایک لفظ میں نہیں کیا جا سکتا۔ جونہی آپ نے کسی زبان میں ترجمہ کیا' وہ اس زبان والوں کا جو خدا ہے' اس کا تصور آپ کو دے گا' قرآن کے الٰہ کا تصور نہیں دے سکتا۔

خارجی کائنات میں ربِ تعالیٰ کا قانون اور ارضی زندگی میں انسانی قانون یہ حاکم اعلیٰ کی حکمرانی کے ساتھ جنگ ہے

میں پھر دہرا دوں کہ قرآن کا جو الٰہ ہے' اس کے معنی ''صاحبِ اقتدار'' ہیں اور جب ہم کہتے ہیں کہ لا الٰہ الا اللہ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ''اللہ کے سوا پوری کائنات میں کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہے''۔ پھر اگلی بات یہ ہے کہ یہی نہیں ہے کہ آپ یہ کہیں کہ خارجی کائنات میں یعنی Outer Universe میں تو اس کے قوانین ہیں' جنہیں Laws of Nature (قوانینِ فطرت) کہا جاتا ہے اور انسان کی اپنی زندگی کے اندر اس کے قوانین نہیں بلکہ اس کا نظام تو انسان کے اپنے بنائے ہوئے قوانین کے تابع چلے گا تو یہ Dualism (ثنویت) ہے کہ وہاں کا خدا کوئی اور یہاں کا الٰہ کوئی اور ہے' تو یہ کفر نہیں' بلکہ شرک ہے حتیٰ کہ انسان اگر اپنے جذبات کے تابع چلتا ہے اور انہیں بھی خدا کے احکام اور اقدار کے تابع نہیں رکھتا ہے' تو یہ خود اپنے جذبات کو الٰہ بنانے والی بات ہے۔ اس میں اللہ پر ایمان کسی طرح بھی باقی نہیں رہتا۔

عزیزانِ من! یہ ہے اللہ کے لفظ کا مفہوم۔ یہ جو سورۃ الفاتحہ کی پہلی ہی آیت الحمد للہ میں ''الفاظ حمد اور اللہ تھے۔ ہمارے سامنے آ گئے۔ اب آگے یہ بات آئے گی کہ خدا کا یہ اقتدار و اختیار حاکمیت کس مقصد کے لیے ہے۔ کیا وہ اس لیے ہے کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے کہ ہم حاکم ہیں' ہماری حکومت ہے' تم دخل دینے والے کون ہوتے ہو' اور تم سرتابی کرنے والے کون ہوتے ہو؟ اس کی غایت کیا ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ ان سب سوالات کا جواب اگلے الفاظ ''رب العالمین'' میں آئے گا۔ اس طرح اب اس کا اگلا لفظ ''رب'' ہمارے سامنے آئے گا' جسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط



تیسرا باب: سورۃ الفاتحہ: (آیات 1 تا 2)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ تعالیٰ کی ذات حمد کی مستحق کیوں ہے؟

عزیزانِ من! آج کا درس سورۃ الفاتحۃ کے تیسرے لفظ ''رب'' سے شروع ہوتا ہے۔ اس سورۃ کا آغاز ہے الحمد للہ اور اس کے بعد ہے رب العالمین۔ حمد اور اللہ کے متعلق ہم پہلے درس میں دیکھ چکے ہیں۔ اب رب العالمین میں رب کا لفظ آیا ہے۔ اس کی اہمیت تو اسی سے ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ ہر قسم کی انتہائی مکمل شکل کی حمد' اللہ کے لیے ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ وہ کیوں اس قسم کی حمدیت کا مستحق ہے؟ اس لیے کہ وہ رب العالمین ہے۔ تو گویا یہ جو اس کا ''رب'' ہونا ہے' اسے ربوبیت کہا جائے گا۔ اس کی ربوبیت وہ بنیادی علت یا Cause یا سبب ہے' جس کی وجہ سے کہا گیا ہے کہ ہر قسم کی حمدیت اسی کے لیے ہے۔ آپ اس سے اندازہ لگا لیجیے کہ یہ رب کی صفتِ خداوندی کتنی محیطِ کل ہے' کتنی وسیع ہے' کتنی گہری ہے کہ یہی بنیادی طور پر اس کی حمدیت کا باعث بنتی ہے۔ اس ربوبیت کی تفاصیل قرآنِ کریم کے مختلف مقامات پہ' مختلف انداز میں آئیں گی لیکن اس کا بنیادی نکتہ یہی ربوبیت ہی ہے۔

لفظ 'رب' کے مفہوم کی وضاحت

عزیزانِ من! مادے کے اعتبار سے رب کا مادہ ''ر ب ب'' ہے۔ اس کے بنیادی معنی ہیں: ''نشوونما دینا یعنی کسی چیز کو نئی نئی تبدیلیوں سے' اس طرح گزارنا' کہ وہ بتدریج (Gradually) نشوونما پاتی ہوئی اپنے نقطۂ آغاز سے تکمیل تک پہنچ جائے''۔ یہ طریقِ نشوونما ربوبیت کہلاتا ہے اور اس طرح نشوونما دینے والے کو رب کہا جاتا ہے۔ اس طریقِ نشوونما میں اصلاح' درستگی اور استحکام کے پہلو بھی مضمر ہوتے ہیں' پھر چونکہ نشوونما کا لازمی نتیجہ شگفتگی اور شادابی ہے' اس لیے عربوں کے ہاں ''الـرُّبَّۃُ'' ان پودوں کو کہتے تھے' جن کی سرسبزی اور تازگی' سردی اور گرمی' ہر موسم میں' یکساں رہتی ہے۔ ان تصریحات سے رب کے بنیادی معنی واضح ہو جاتے ہیں یعنی کسی شے کو نقطۂ آغاز سے نشوونما دیتے ہوئے پایۂ تکمیل تک پہنچنے والا' انتظام کرنے والا' اصلاح کرنے والا' آگے بڑھانے والا' اور اس انداز سے آگے بڑھانے والا کہ اس شے کی سرسبزی اور تازگی موسم کے تغیرات سے بھی متاثر نہ ہو اور جو کچھ اس نے بننا ہے وہ کچھ بطریقِ احسن بن جائے۔ ایسا

کرنے والا رب کہلاتا ہے۔

یہ محسوس کائنات' جو ہمارے سامنے ہے یا وہ محسوس کائنات' جو ہمارے سامنے تو نہیں ہے لیکن اس لامتنہیٰ سلسلہ کائنات میں پھیلی ہوئی ہے' کس طرح عدم سے وجود میں آ گئی' اس کا جواب فکرِ انسانی سے ممکن نہیں۔ نظامِ فطرت میں قانون علت ومعلول یعنی Law of Cause and Effect جاری وساری ہے۔ یعنی یہاں جو کچھ ظہور میں آتا ہے وہ کسی سبب (Cause) کا نتیجہ (Effect) ہوتا ہے۔ طبعی سائنس (Physical Science) ہماری علت (Effect) اور معلول Cause کی کڑیوں کے دریافت کرنے کا نام ہے۔ یہ محققین ان کڑیوں کو پیچھے لے جاتے ہیں اور اپنی اس تحقیق میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہو جاتے ہیں لیکن اس میں بالآخر ایک ایسا مقام آ جاتا ہے جہاں یہ کائنات تو موجود نظر آتی ہے' لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس طرح وجود میں آ گئی۔ یعنی وہاں Effect (معلول) ہوتا ہے' اس کے Cause (سبب) کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بڑے سے بڑا سائنسدان بھی اس مقام پر اسی طرح دانتوں میں انگلی دبائے محوِ حیرت کھڑا دکھائی دیتا ہے جس طرح ایک جاہلِ مطلق۔

عالمِ امر اور عالمِ خلق کے کائناتی سلسلہ میں عقل انسانی محوِ حیرت ہے

عزیزانِ من! ہم نے اللہ کے عنوان میں دیکھا تھا کہ الٰہ کے ایک معنیٰ ''متحیر ہو جانا'' بھی ہے۔ آغازِ کائنات وہ مقام ہے جس کا تعلق خدا کی شانِ الوہیت سے ہے۔ یعنی وہ مقام کہ جہاں پہنچ کر عقلِ انسانی محوِ حیرت ہو جاتی ہے کہ Nothingness (معدوم) سے یہ چیز کیسے وجود (Being) میں آ گئی۔ اس کے لیے قرآنِ کریم نے دو الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ایک تو اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق کہا ہے کہ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (2:117) اور دوسرے مقام پہ ہے کہ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (6:14)۔ ان دونوں لفظوں کے معنی ہوتے ہیں: ''کسی شے کو بغیر کسی سابقہ مسالے (Material) کے وجود میں لانا: علت (Cause) اور معلول (Effect) کے بغیر آغاز کائنات کرنا۔ وہ خدا کی صفت ''بدیع السمٰوٰت والارض'' یا ''فاطر السمٰوٰت والارض'' کی مرہونِ منت ہے۔ اور یہ ہم کہہ ہی نہیں سکتے کہ یہ کس طرح سے وجود میں آئی۔ ہم اس مقام پر عالمِ تحیر میں ہوتے ہیں۔ یہ جو علت ومعلول سے کوئی شے وجود میں آ جاتی ہے تو اس کے لیے عربی زبان میں لفظ ''خلق'' ہے۔ اور اس سے پہلا جو اس کا مقام ہوتا ہے' وہ مراحل ہوتے ہیں' جو اس کے وہ عالمِ امر کہلاتا ہے۔ ایک یورپین مفکر پٹیسن [1] نے کہا ہے کہ عربی زبان ہمارے مقابلے میں بڑی Advantgeous (افادی) پوزیشن میں ہے کہ اس کے ہاں

---

[1] Pringle-Pattison (1856-1931) پرنگل پٹیسن کے اپنے الفاظ اور تخلیق اور امر کے مفہوم کی مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 29 (مکمل) ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006ء' ص ص 446 تا 448' نیز ص 446 کا فٹ نوٹ 1' نیز: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ الانبیاء' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء' ص ص 142 تا 145

Creation (تخلیق) کے لیے دو الفاظ ہیں: ایک امر اور دوسرا خلق لیکن ہمارے ہاں اس کے لیے صرف ایک ہی لفظ Creation (تخلیق) ہے' حالانکہ Creation (تخلیق) وہاں آئے گا جہاں کوئی شے محسوس طور پر سامنے آ جائے لیکن اس کے محسوس طور پر سامنے آنے سے پہلے جو مراحل ہیں' ان کے لیے ہماری زبان میں کوئی لفظ ہے ہی نہیں۔ یہ عربی زبان کی خصوصیت ہے کہ اس میں اس کے لیے بھی ایک لفظ موجود ہے۔ یہ قرآنِ کریم کی خصوصیت ہے کہ اس نے عالمِ امر اور عالمِ خلق دو الگ الگ عالم بتائے ہیں۔

عالمِ امر کے متعلق یوں سمجھیے کہ جیسے کسی ایجاد کرنے والے کے ذہن میں پہلے ایک تصور آتا ہے' ایک نقشہ آتا ہے' وہ شے ابھی محسوس طور پہ وجود میں نہیں آئی ہوتی لیکن اس کے متعلق وہ ڈیزائن (Design)' وہ ڈائریکٹنگ (Directing)' وہ ساری چیزیں' آتی ہیں۔ ❶ لفظ امر کے معنی ہی ڈائریکشن (Direction) کے ہیں۔ چنانچہ اس کے متعلق انگریزی زبان میں سمجھانے کے لیے Direction کہا جاتا ہے' جہاں یہ الفاظ تو ہم انسان کے ذہن کے ہی کہہ سکتے ہیں' جہاں وہ اپنے ذہن میں' اپنے تصور میں' شے کا نقشہ مرتب کرتا ہے ابھی وہ شے اصل میں وجود میں نہیں آتی۔ لیکن جب وہ شے اس نقشے کے مطابق وجود میں آتی ہے تو وہاں سے عالمِ خلق شروع ہوتا ہے۔ خلق کے معنی ہوتے ہیں: جو چیزیں مسالے (Material) کے طور پہ موجود ہوں' اُن میں مناسب نشو و نما سے' صحیح صحیح

---

❶ 1934ء میں ایک کتاب شائع ہوئی تھی۔ اس کا نام ہے The Great Design۔ اس کے مدیر F.Mason نے دنیا بھر کے ائمہ فکر و نظر کو دعوت دی تھی کہ وہ اپنے اپنے شعبہ علم کی تحقیقات کو سامنے رکھ کر غیر جانبدارانہ طور پر یہ بتائیں کہ ان کے نزدیک اس کائنات میں کوئی نظم و ربط ہے یا یہ سلسلہ یونہی اندھا دھند چلے جا رہا ہے۔ چنانچہ اس کی دعوت پر مختلف علوم و فنون کے ماہرین نے الگ الگ مقالے لکھے جو اس کتاب میں جمع کر دیئے گئے۔ نباتات' حیوانات' انسانیات' طبیعات' حیاتیات' نفسیات' فلکیات وغیرہ تمام شعبوں کے ماہرین کے مقالات۔ ان میں سے ہر مقالہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ سائنس کی تحقیقات اس حقیقت کو دن بدن بے نقاب کیے جا رہی ہیں کہ یہ تمام سلسلہ کائنات' عجیب و غریب نظم و ضبط کے ماتحت جاری و ساری ہے۔ یہ سب کچھ حیرت انگیز ڈیزائن (Design) سے ہو رہا ہے جس میں کوئی سقم نہیں' کوئی جھول نہیں' کوئی دراڑ نہیں' کوئی سلوٹ نہیں۔ ایک Design اور Plan کے تحت یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کائنات کی ابتدا کے بارے میں بحث کرتے ہوئے (Lick Observatory, California)(کیلفونیا کی لک مشاہدہ گاہ) کے ڈائریکٹر ڈاکٹر ایٹکن (Dr. Aitken) نے برملا اس بات کا اظہار کیا کہ:

"The origin of the universe and its ultimate fate, we know practically nothing" (The Great Design, p.35)

یعنی ''کائنات کی ابتدا اور اس کی انتہائی کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے۔'' شین (Sheen) نے تو فلسفہ مذہب (Philosophy of Religion) کے صفحہ 156 پر سلیوان (Sulivan) کے یہ الفاظ Quote کیے ہیں کہ ''سائنس' کتاب فطرت کو پڑھتی ہے اسے لکھتی نہیں لیکن اس کتاب فطرت کے مطالعہ کرنے والوں کا اعتراف ہے کہ سائنس محض سطح کائنات کی کتاب خوانی ہے' اس کی کنہ و حقیقت کا علم اس کے اندر ہے ہی نہیں۔ نہ ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ریڈنگ یونیورسٹی کا طبیعات کا پروفیسر ڈاکٹر جیمز آرنلڈ کروتھر لکھتا ہے کہ ''نظامِ فطرت اپنی گہری بنیادی سادگی میں اس قدر تحیر انگیز ہے کہ دنیائے سائنس میں کسی موضوع پر حرفِ آخر انسان کے لیے ہی چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ (The Great Design, p. 52)

Proportion (تناسب) سے نئی نئی چیزیں بناتے چلے جانا۔ اسی لفظ ''خلق'' سے لفظ اخلاق ہے جس کے معنی صحیح Proportion (تناسب) کے ہیں یعنی انسانی صلاحیتوں کا انسانی استعداد کا صحیح صحیح Proportion (تناسب) میں ہونا۔ یہ جو صحیح ترین Proportion (تناسب) کے اندر ہوتا ہے آپ کو معلوم ہے کہ وہ Personality (شخصیت) کے لیے یہ لفظ آیا ہے کیونکہ اس میں Proportion (تناسب) بالکل صحیح ہوتی ہے۔ لہٰذا خلق کے معنی ہوتے ہیں: پہلے سے موجود شے میں نئی نئی Proportion (تناسب) سے نئی نئی چیزیں وجود میں لاتے چلے جانا۔ یہ چیز ہے جس کے لیے ابتدا میں آپ یوں کہیے کہ اس شے کا صرف میٹریل موجود ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ نے کمہار کو دیکھا ہوگا اس کا چاک بھی دیکھا ہوگا اس کے پاس مسالہ (Material) کیا ہوتا ہے: گوندھی ہوئی مٹی ہوتی ہے لیکن اس مٹی سے اس نے بنانا کیا ہے کس قالب میں ڈھالنا ہے کیا چیز تیار کرنی ہوتی ہے۔ وہ اس کے ذہن میں ہوتی ہے۔ وہ اس مٹی کو چاک پر رکھتا ہے اور پھر اس میں صحیح تناسب پیدا کر کے کبھی پیالہ بنا دیتا ہے کبھی صراحی بنا دیتا ہے کبھی چینک بنا دیتا ہے۔ عجیب عجیب چیزیں اس میں سے نکلتی چلی جاتی ہیں۔ وہی جو کسی چیز کے بنانے کے لیے مٹی کا تودہ سا رکھا ہوا تھا تو اس کے ذہن میں کسی چیز کے بنانے کا ایک نقشہ یا تصور ہے۔ اس کے مطابق وہ اس میٹریل سے یہ نئی نئی چیزیں بنائے چلے جاتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ وہ بت یا معبود جس کی پرستش ہندو کرتا ہے وہ پتھر کی چٹان کے اندر چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔ یہ سنگ تراش کا ذہن ہے جو پہلے اس شے کا نقشہ مرتب کرتا ہے اور پھر اس پتھر سے حشو زوائد کو الگ کرتے ہوئے اس میں سے وہ حسین و جمیل ایک ایسی شے تراش دیتا ہے جس کے سامنے یہ یوں کہیے کہ اس یہ کچھ کرنے والے کا سرنیاز جھک جاتا ہے۔ وہ تو اقبالؒ (1877-1938) نے کہا تھا کہ

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

قرآنی الفاظ 'الباری' اور 'المصور' کا مفہوم

وہ اس شے کو جو ابھی Creator (خالق) کے Mind (ذہن) میں ہوتی ہے معاف رکھیے خدا کے لیے اب ہم یہی لفظ استعمال کر سکتے ہیں اب ہم کیا کریں ہماری زبان کی بلکہ فہم کی ادراک کی شعور کی مجبوری ہے ہمارا ذہن محدود (Finite) ہے اور خدا تو (Infinite) (لامحدود) ہے۔ Infinite (لامحدود) کے لیے جب Finite (محدود) کے الفاظ استعمال کریں گے تو وہ صحیح صحیح معنوں میں صحیح صحیح انداز میں اس کا مفہوم ادا نہیں کریں گے لیکن ہم کیا کریں اس کے بغیر چارہ بھی تو نہیں ہے۔ بنتی نہیں ہے بادۂ وساغر کہے بغیر۔ تو اس مٹی کے تودے کے اندر جو کچھ بننے کے امکانات ہوتے ہیں اس کمہار کا ہاتھ اس اپنے پہلے سے ذہن میں رکھے ہوئے نقشے کے مطابق اسے بنائے چلا جاتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کی دو صفات ہیں: الباری اور المصور۔ باری کے معنی

ہوتے ہیں "کسی شے میں جو زائد چیزیں ہوں' ان کو الگ الگ کرتے چلے جانا' اور پھر اُن کو اس تصویر کے مطابق بنا دینا' جو اس کے ذہن میں ہوتی ہے"۔ کائنات جس شکل میں ہمیں نظر آتی ہے' اس کا نقطہ آغاز اسی قسم کا نہیں ہے۔ یعنی جو شے جس شکل میں ہمیں آج نظر آتی ہے' وہ شروع میں ہی اسی قسم کی نہیں تھی۔ یہ نہیں تھا کہ ہر شے اسی شکل میں اللہ تعالیٰ نے کسی طرح پیدا کر دی جس طرح آج نظر آتی ہے۔

انسانی زندگی کے ارتقائی مراحل

مثلاً انسان جس شکل میں آج موجود ہے' یہ بات نہیں تھی کہ پہلا انسان خدا نے اسی قسم کا بنا دیا۔ وہ جو آدم کی تخلیق کے متعلق ہمارے ہاں عام طور پر روایتیں اور قصے مشہور ہیں' وہ حقیقت نہیں ہیں۔ وہ تراش کے دیئے ہوئے قصے ہیں۔ قرآن کے نہیں ہیں۔ قرآن اسے نہیں مانتا کہ پہلے سے' اسی طرح سے' ایک انسان کا پتلا بنا دیا۔ پھر اس کی پسلیچیر کر اس میں سے ایک حوا' اس کی بیوی' نکال دی۔ یہ نہیں ہے۔ مثلاً انسان ہی کو آپ لیجیے یا Life (زندگی) کو لیجیے۔ کسی بھی زندہ چیز کا آغاز ایک لائف سیل سے ہوتا ہے جو Naked (خالی آنکھ) سے دیکھا بھی نہیں جا سکتا۔ اس قسم کا وہ سیل (خلیہ) ہوتا ہے Microscopically (خوردبین سے) اس کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اس سیل (خلیے) کے اندر جیتا جاگتا انسان بننے کے مضمرات ہوتے ہیں' صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ اب اُس سے' اس زندگی کو مختلف مراحل میں سے گزارتے ہوئے 'گردشیں دیتے ہوئے' اس مقام تک لے آنا کہ وہ جیتا جاگتا انسان بن جائے' یہ ہے جسے خدا کی ربوبیت کا مظہر کہا جائے گا۔

نظریہ ارتقاء کے متعلق قرآنِ حکیم کی تعلیم

ہمارے دور میں Theory of Evolution (نظریہ ارتقا) کو سائنس کا معرکہ آراء کارنامہ قرار دیا جاتا ہے اور یہ واقعی ہے بھی بہت بڑا کارنامہ۔ لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ یہ بات ہمارے اس دور میں ایجاد نہیں ہوئی۔ یوں کہہ لیجیے کہ اس کا انکشاف (Discover) ہوا ہے۔ یہ درحقیقت قرآنِ کریم میں موجود تھا۔ قرآنِ کریم کی سورۃ السجدہ میں غور کیجیے کہ کس انداز سے اس بات کو کہا گیا ہے۔ کہا کہ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ (32:5) اللہ تعالیٰ اپنے امر' اپنے ارادے' اپنے 'ڈیزائن' کی ابتدا پست ترین درجے سے شروع کرتا ہے۔ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْہِ (32:5) پھر وہ امر آہستہ آہستہ ارتقائی منازل طے کرتا ہوا اوپر اٹھتا چلا جاتا ہے۔ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗۤ اَلْفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (32:5) ایک ایک دور میں' ایک ایک مرحلے میں سے گزرتے ہوئے' جو کہ تمہارے حساب وشمار سے ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ دوسری جگہ کہا ہے کہ وہ پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے (70:4) پچاس پچاس ہزار سال کے ایک ایک مرحلے سے آہستہ آہستہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس کے آگے ہے کہ وَ الشَّھَادَۃِ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ [1] (32:6)۔

---

[1] یہ سلسلہ تخلیق وارتقا اس خدا کی طرف سے کارفرما ہے جو ہر شے کی مضمر ممکنات سے بھی واقف ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ ان میں سے کیا کچھ مشہود ہو چکا ہے (اور کتنا کچھ ہور باقی ہے) یہ سب کچھ اس قانونِ خداوندی سے ہوتا ہے جو تمام اسکیموں کو مناسب نشوونما دے کر انہیں تکمیل تک پہنچانے کی قدرت رکھتا ہے۔

عالم الغیب اور عالم الشہادۃ کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی صفت 'عزیز' اور 'رحیم' کا مفہوم

سبحان اللہ یہ ہے وہ خدا! وہاں دو الفاظ آئے: عالم الغیب اور **الشہادۃ**. ''غیب' تخلیق کی وہ منزل ہے' وہ مراحل ہیں' جب وہ شے ابھی کنکریٹ (محسوس) شکل میں سامنے نہیں آتی اور ''شہادت'' اس کی اگلی منزل ہے جب وہ تخلیقی شکل کے اندر انسان کے سامنے آتی ہے۔ کہا یہ ہے کہ یہ چیز خدا کی دو صفات کی مظہر ہے: ایک تو ''عزیز'' ہے اور دوسری ''رحیم'' ہے۔ عزیز کے معنی ہوتا ہے جسے کسی شے کے اوپر غلبہ اور قوت حاصل ہو اور ''رحیم'' کے معنی ہوتا ہے جو نشوونما دیتا ہوا اس کو آگے لے جائے۔ یہ کہنے کے بعد پھر پہلے یہ کلیہ بیان کیا' یہ اصول بیان کیا کہ الَّذِیٓ اَحۡسَنَ کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقَهٗ (32:7) جس نے ہر شے کی نہایت متناسب اور حسین ترین انداز میں ابتدا کی۔ وَبَدَاَ خَلۡقَ الۡاِنۡسَانِ مِنۡ طِیۡنٍ (32:7) اور اسی طرح سے انسان کی تخلیق کی ابتدا ایک بے جان مادے (Inorganic Matter) سے کی۔ دوسرے مقام پہ ہے کہ اس بے جان مادے (Inorganic Matter) میں' مٹی میں' پانی کی آمیزش ہوئی تو لائف (زندگی) کا پہلا جرم یا جرثومہ (Life-Cell) وجود میں آ گیا اور وہ پھر اس کے بعد مختلف منازل طے کرتا ہوا' اس عالمِ بشریت کے اندر پہنچا۔ یہ تمام Processess (عمل) جو گزارے ہیں' یہ سارا خدا کی صفتِ ربوبیت کی بنا پر ہے اور پھر ربوبیت اس انداز کی کہ یہ نہیں کہ ایک شے جس حالت میں موجود ہے وہ اسی میں موجود ہے اور اسے اسی قسم کا سامانِ نشوونما چاہیے۔ وہ کہتا ہے کہ کُلَّ یَوۡمٍ هُوَ فِیۡ شَاۡنٍ (55:29) ہر شے مختلف مراحل میں سے گزرتی ہے اور ہر مرحلے میں اس کے لیے مختلف قسم کا سامانِ نشوونما چاہیے۔ رحم مادر کے اندر نشوونما کی اور کیفیت ہوتی ہے۔ اس کی تفصیل ذرا آگے چل کر آئے گی۔ اس دنیا میں جب وہ پہلا ہی سانس لیتا ہے تو یہاں ہوا کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے بعد فوراً ہی اس کو پرورش کے لیے جس غذا کی ضرورت ہوتی ہے' اس غذا کے چشمے' اس کی پیدائش کے ساتھ ہی پھوٹ نکلتے ہیں اور اس کو وہ غذا ملتی ہے اور اس انداز سے ملتی ہے کہ جوں جوں یہ بڑھتا چلا جاتا ہے' ماں کا دودھ گاڑھا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اگر پہلے دن اس کا دودھ اتنا زیادہ گاڑھا ہو جتنا آخر میں ہوتا ہے تو بچے کا معدہ اسے ہضم نہیں کر سکتا۔ اس میں پانی کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے غذائیت بڑی کم ہوتی ہے۔ جوں جوں وہ بڑھتا چلا جاتا ہے پانی کی مقدار کم ہوتی چلی جاتی ہے' غذائیت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ آخر میں جا کر جب وہ اناج وغیرہ کھانے کے قابل ہو جاتا ہے تو دودھ کے یہ سرچشمے سوکھ جاتے ہیں اور پھر وہ زمینی غذا کے اوپر آ جاتا ہے۔

مغرب کے سائنٹسٹ اور مردِ مومن کے نظریہ ارتقا کا تقابلی جائزہ

عزیزانِ من! مغرب کے ایک سائنٹسٹ اور مردِ مومن کے نظریہ ارتقا کے تصور میں ایک بڑا بنیادی فرق ہے۔ مغرب کے سائنسدان انسان کی موجودہ شکل کو اس Evolution (ارتقا) کی آخری کڑی مانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس کے بعد جب جسمِ انسانی کی مشینری چلنے سے بند ہو جائے گی تو انسان کا خاتمہ ہو جائے گا' نظریہ ارتقا ختم ہو جائے گا لیکن قرآن کہتا ہے کہ نہیں' یہ جو تم انسان دیکھتے ہو'

یہ اس کی طبعی زندگی کا ہے۔اس کے اندر ایک شے اور بھی ہے۔اگر اس کی نشوونما ہوتی چلی جائے تو انسان کے جسم کی موت کے ساتھ وہ شے مر نہیں جاتی۔ [1] زندگی یا وہ شے جسے انسان کی ذات یا Personality یا خودی یا نفسِ انسانی کہا جاتا ہے' انسان کے جسم کے مر جانے کے بعد بھی زندہ رہتی ہے' آگے چلتی ہے اور اس نے آگے مزید ارتقائی مراحل طے کرنے ہوتے ہیں۔ [2] لہٰذا انسان کی موجودہ ہیئت یا اس کی زندگی کا یہ موجودہ مرحلہ تو ابھی ابتدا کی بات ہے۔

زندگی کی یہ موجودہ ہیئت تو جہانِ فردا کی زندگی کا دیباچہ ہے

اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں کہ یہ دنیاوی زندگی' تو ہمارے افسانہ کا ابھی دیباچہ ہے' اصل کتاب تو اس کے بعد شروع ہونی ہے۔اس کے لیے اقبالؒ نے بڑے ہی لطیف پیرائے میں دو شعروں میں بات کہی ہے۔واضح رہے کہ اقبالؒ کو اللہ نے یہ خصوصی نعمت عطا کی تھی کہ وہ قرآنِ کریم کے حقائق پہ گہری نظر رکھتے تھے اور اس کے بیان کرنے کے لیے اتنا حسین انداز انہیں عطا کیا تھا کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔شریعت کے بھی انتہا پہ پہنچتے تھے اور وہ شریعت محض شاعری نہیں ہوتی تھی بلکہ قرآنی حقائق کو نہایت حسین انداز میں پیش کرنے کا انداز ہوتا تھا۔ذرا اسی چیز کو لیجیے کہ یہ جو موجودہ انسان کی ہیئت ہے' یہ اس کی مکمل ترین آخری شکل نہیں ہے بلکہ خدا کے عالمِ امر یا اس کے تصور یا اس کے ڈیزائن میں جس قسم کا یہ انسان تھا' ابھی تو یہ اس میں پہلو بدل رہا ہے۔ذرا شعر سنیے لیکن میری مشکل یہ ہے کہ اس کے زیادہ اشعار فارسی میں ہوتے ہیں اور فارسی تو ایک طرف' اب تو ہمارا دور ایسا آ گیا ہے کہ اردو زبان کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ اشعار کا Translation (ترجمہ) نہیں کیا جا سکتا۔بہر حال شعر تو اپنی زبان میں شعر ہوتا ہے۔کہتے ہیں کہ

یکے در معنی آدم نگر از ما چہ می پرسی

یعنی ذرا لفظ آدم کے معنوں پر غور کرو۔مجھ سے تم کیا پوچھتے ہو؟ آدم کے ایک معنی ہوتے ہیں: گوندھی ہوئی مٹی۔یہ وہی مٹی ہے جو کمہار کے چاک کے پاس رکھی ہوئی ہوتی ہے۔کہا کہ ذرا اس اعتبار سے دیکھو یہ تو ابھی گوندھی ہوئی مٹی ہے۔

ہنوز اندر طبیعت می ہلد موضوع شود روزے

---

[1] موت کے متعلق باردیو (bardyeau) لکھتا ہے کہ ''موت انسان کا خاتمہ نہیں کرتی' وہ صرف خارجی دنیا کے وجود کا خاتمہ کرتی ہے۔''

[2] لارڈ بلفورڈ (Lord Belford) نفسِ انسانی کی ماہیت کے متعلق کہتا ہے کہ:

An "I" must have character quite apart from the experiences, active and passive, which fill his conscious life. He must have (or be) a soul a soul, which is something more than an organized collection of capacities or a procession of physical status, a soul, which is not only merely substance but has an individuality, which is unique and indescribable (Theism and Thonghts)

ابھی تو یہ خالق کائنات یا انسان کا جو خالق ہے' خدا ہے' رب ہے' یہ ابھی تو اس کے تصور میں' اس کے قلب کے اندر' پہلو بدل رہا ہے' ابھی یہ موزوں مصرعہ نہیں ہوا۔ اس میں ایک چیز اور قابل غور ہے۔ شاعر کے ذہن میں ایک خیال آتا ہے' ایک مضمون آتا ہے۔ وہ مضمون اس کے ذہن میں' اس کے قلب میں' اس کے دل میں جسے کہتے ہیں پہلو بدل رہا ہوتا ہے اور جب پہلو بدلنے کے بعد الفاظ کی شکل میں آتا ہے تو اسے مصرعہ موزوں کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ''ہنوز اندر طبیعت می خلد''۔ یہ موجودہ پیکرِ انسانی جو ہے یہ تو خالقِ کائنات کے قلب کے اندر ابھی پہلو بدل رہا ہے۔ ''موزوں شود روزے''۔ کسی ایک دن جب یہ مصرعہ موزوں بنا تو اس کے بعد' عزیزانِ من! جو کچھ کہا ہے' وہ اقبالؒ ہی کہہ سکتا تھا۔ کہا ہے کہ ''موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے''۔ اس وقت یہ مضمون تو پیش پا افتادہ نظر آتا ہے' کچھ اہلیت ہی نہیں۔ جب یہ ذرا' ایک دن موزوں ہو گیا' تو اس کے بعد کیا ہوگا۔ کہا

کہ یزداں را دل از تاثیر او پر خوں شود روزے

کہ اور تو اور خود اس کے خالق کا دل بھی اس کی تاثیر سے خون ہو کے رہ جائے گا۔ اس نے تو وہاں پہنچنا ہے صاحب!

کائنات میں ربوبیت کا یک نہ ختم ہونے والا سلسلہ

یہ ہے' عزیزانِ من! ربوبیت' یہاں تک اس نے انسان کو پہنچانا ہے: اوّلیں جرثومہ حیات سے' لائف سیل سے' لے کر پیکر بشریت تک۔ اور ارتقائے انسان کے اس مرحلے میں آکر اس نے ایک نئی چیز دی' جسے ذاتِ انسانی کہتے ہیں۔ اس کا اضافہ کیا۔ جسم کے ختم ہو جانے پر انسانی ذات نے ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جانا ہے۔ آگے کہاں تک بڑھتے چلے جانا ہے' ہم اس شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ بھی نہیں سکتے۔ اس لیے قرآن نے اس کی زیادہ تفصیل نہیں دی' بات وہاں جا کے سمجھ میں آئے گی لیکن ایک مسلمان کے لیے' ایک مومن کے لیے' اس بات پر ایمان نہایت ضروری ہے کہ اس موت کے ساتھ انسان کا خاتمہ نہیں ہو جاتا' انسان کی زندگی آگے بھی چلتی ہے اور اس نے اگلے مراحل بھی طے کرنے ہیں۔

قرآنی الفاظ کے مفہوم اور انگریزی زبان کی اختیار کردہ اصطلاحات میں بنیادی فرق ہے

عزیزانِ من! لفظ ''رب'' کے اس مفہوم کو سامنے رکھیے اور پھر سوچیے کہ کیا اس کا ترجمہ دنیا کی کسی زبان میں بھی ہو سکتا ہے۔ انگریزی کا کوئی سا ترجمہ قرآن آپ اٹھا لیجیے۔ اس کے لیے لفظ Lord استعمال ہوا ہے۔ آپ سوچیے کہ کیا Lord کا لفظ ''رب'' کے مفہوم کو ادا کر دیتا ہے۔ مفہوم ادا کرنا تو ایک طرف رہا' معاف فرمائیے' وہ تو اس سے کچھ اور الٹ جاتا ہے۔ ''رب'' تو وہ ہے جو اولیں نقطہ حیات سے حیات یعنی زندگی کو نشو و نما دیتا ہوا اوپر لیے چلے جاتا ہے اور Lord کے اندر تو بات ہی کچھ تسلط کی آ جاتی ہے۔ اصل تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں یہ تمام اصطلاحات جو انگریزی ترجمے میں استعمال ہوتی ہیں' یہ بائبل کے الفاظ ہیں' Christianity (عیسائیت) کے

تصورات ہیں۔ انہی تصورات کی رو سے ہمارے ہاں ان الفاظ کا انگریزی میں ترجمہ کیا جاتا ہے خواہ وہ مغرب کے ترجمہ کرنے والے ہوں یا ہمارے ہاں کے کرنے والے کیونکہ زبان تو ان کے ہاں بھی وہی ہوتی ہے جو مغرب میں استعمال ہوتی ہے۔ اس لیے جب اس زبان میں ترجمہ کیا جائے گا تو Christianity (عیسائیت) کے تصورات تو آ جائیں گے۔ اللہ کے لیے God (گاڈ) کہا جائے گا تو وہ بات نہیں بنے گی۔ وہ اس کے لیے فادر (Father) کہتے ہیں۔ آپ دیکھیے کہ بات کہاں چلی گئی۔ رب کے لیے وہ Lord (لارڈ) کہتے ہیں' خدا کے لیے لارڈ کا تصور یہاں نہیں آئے گا ''رب'' کہنے سے تو بات ہی کچھ اور ہو جائے گی۔

عزیزانِ من! اسی طرح ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ قرآنِ کریم کے جتنے تصورات یا Concept ہیں' جب بھی آپ انہیں انگریزی زبان میں منتقل کریں گے تو وہ پھول کی پتی کو مسل کے رکھ دیں گے۔ اس لیے یہ لارڈ نہیں ہے بلکہ یہ تو ''رب'' ہے' ربوبیت کی شان کو لیے ہوئے اور ساری کائنات اس کی شانِ ربوبیت کی مظہر ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم میں اس کے لیے جو نظام آیا ہے' میں نے اپنے ہاں اس کے لیے نظامِ ربوبیت کی اصطلاح استعمال کی ہے اور وہ حقیقت میں یہی چیز ہے جیسے کہ آگے چل کے ہم دیکھیں گے کہ خدا کے لیے' وہ جو میں نے کہا تھا کہ اللہ کے اندر اس کا اقتدار تسلیم کرنا ہے' اشیا کے اوپر وہ اقتدار لیے ہے۔ اس نے اس لیے اپنا اقتدار رکھا ہوا ہے کہ وہ کائنات کی ہر شے کی نشوونما کرتا ہوا چلا جائے۔ وسائلِ زندگی پر اس کا اتنا کنٹرول ہونا چاہیے کہ وہ اپنے پروگرام کے مطابق ان اشیا کی نشوونما کرتا چلا جائے گا۔ کن اشیاء کی نشوونما؟ اس کے لیے کہا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (1:1) اور پھر ''رب'' کے بعد یہ لفظ عالمین آیا۔

عالمین کے کیا معنی ہیں؟ یہ بھی بہت غور سے سننے کی بات ہے کہ اسی سے حمدیت کا پورا تصور ذہن میں آئے گا۔ یہ ربوبیت ہے اور ربوبیت بھی' ربوبیت عالمینی ہے۔

عالمین کا مادہ ''ع ل م'' ہے جس کے معنی ہیں: ''جاننا' پہچاننا''۔ چنانچہ عالم' ل کے زیر کے ساتھ' صاحبِ علم کو کہتے ہیں یعنی ''کسی بات کا جاننے والا' پہچاننے والا'' لیکن یہ تو عربی زبان ہے۔ ل کے اوپر جب زبر آ جائے اور عالم کہا جائے تو اس کے معنی ہوتے ہیں: ''وہ چیز جس کے ذریعے کسی کی پہچان ہو سکے'' یعنی کسی شے کی علامت یا نشانی جیسے علم جھنڈے کو کہتے ہیں کیونکہ وہ فوج کی نشانی ہوتا ہے' علامت ہوتا ہے۔ جھنڈے سے معلوم ہوتا ہے کہ فوج ہے اور یہ بھی کہ کون سی فوج ہے۔ آپ رات کے وقت کسی بیابان یا جنگل سے گزر رہے ہوں' جہاں کسی انسان کا سراغ تک نہ مل سکتا ہو' کہ اتنے میں دُور سے آپ کو ایک ٹمٹماتا ہوا دیا نظر آئے' اس سے آپ پہچان جائیں گے کہ وہاں کوئی انسان رہتا ہے۔ وہ دیا کسی انسان کی موجودگی کی ''علامت یا علم'' بن جائے گا۔

یہ کائنات انسانی زندگی کے مقام بلند کو متعین کرنے کا ذریعہ ہے

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی ماہیت و حقیقت انسان کے حیطہ ادراک میں نہیں آ سکتی لیکن اس کائنات کا وجود اس امر کی علامت ہے کہ اس کا کوئی خالق ہے۔ لہٰذا یہ محسوس کائنات' خدائے غیر مرئی و غیر محسوس کے پہچاننے کی علامت یا ذریعہ کہلائے گی۔ اس سے ایک بلیغ نکتہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ قرآنِ مجید میں کائنات کو ''عالم'' کہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ کائنات کا وجود مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ یہ فقط ذریعہ ہے کسی کے پہچاننے کا' خود انسان کے مقام کے پہچاننے کا' اور اس سے آگے بڑھ کر اس امر کے جاننے پہچاننے کا' کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے' جس کی عظیم القدر اسکیم کے تابع یہ سارا نظام سرگرمِ عمل ہے۔ لہٰذا یہ محسوس کائنات مقصود بالذات نہیں بلکہ کسی بلند و بالا مقصد کے حصول کا ذریعہ قرار پاتی ہے۔

مغرب کا ایک سائنٹسٹ بھی کائنات کے اوپر تحقیق و تفتیش کرتا ہے اور وہ اس کے نظام کو جانتا ہے' پہچانتا ہے۔ اس کے نزدیک وہ عالم ہے اس کائنات کا لیکن وہ کائنات کو مقصودِ بالذات سمجھتا ہے' اس سے آگے نہیں۔ لیکن ایک مردِ مومن' ایک مسلمان سائنٹسٹ جب کسی کائنات کے اوپر تحقیق و تفتیش کرتا ہے اور وہ کسی نتیجے پہ پہنچتا ہے تو وہ یہ کہتا ہے کہ یہ جو کچھ میں نے منتخب اور محسوس کیا ہے' یہ مقصود بالذات نہیں ہے' بلکہ یہ اس سے ایک بلند اور بالا مقصد کے جاننے' پہچاننے کا ذریعہ ہے اس لیے یہ کائنات ایک مردِ مومن کے لیے مقصود بالذات نہیں ہو سکتی۔ علامہ اقبالؒ (1877-1938) نے بڑے خوبصورت انداز میں یہ بات کہی ہے کہ

مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن
نہ سیرِ گل کے لیے ہے' نہ آشیاں کے لیے

یہ تو فقط علامت ہے' نشانی ہے کسی بلند و بالا مقصد کے لیے۔ وہ مقصد کیا ہے' آگے چل کر سامنے آئے گا۔ یہاں لفظ عالمین آیا ہے یعنی رب العالمین' جو عالم کی جمع ہے۔ لہٰذا اس کے معنی ہوئے کائناتیں۔ ہم تو اپنی اسی دنیا کو کائنات سمجھتے ہیں لیکن نہ معلوم خدا کی پیدا کردہ کتنی کائناتیں ہیں۔ اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں:

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی' آشیاں اور بھی ہیں

(بالِ جبریل)

اس سے آگے ایک بڑا خوبصورت شعر ہے کہ

اگر کھو گیا اِک نشیمن تو کیا غم

مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

(بالِ جبریل)

قرآن حکیم اور وسیع ہوتی ہوئی کائناتیں

یہ تو ہوا عالمین کہ ایک کائنات نہیں، بہت سی کائناتیں ہیں لیکن یہ جو، ہم The Entire Universe ایک کائنات بھی کہیں گے تو اس Universe (کائنات) کا کوئی کنارہ نہیں ہے، یہ لامتناہی سی ہے۔ یہ عجیب چیز ہے کہ Finite (محدود) ہے لیکن اس کی کوئی حد نہیں ہے۔ علم الافلاک کے ماہرین یعنی Astranomy (علم الافلاک) کے جاننے والے یہ بتاتے ہیں کہ اس کا کوئی کنارہ اور حد نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ان کے ہاں The Expandig Universe ایک ٹرم ہے۔ اس کی حد کوئی نہیں لیکن Expand ہوتی جاتی ہے۔ ان کا یہ انکشاف آج کی نئی چیز نہیں ہے۔ قرآنِ کریم نے تو بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ (35:1) اللہ تعالیٰ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق اپنی مخلوق میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ کیا معلوم کتنی نئی نئی کائناتیں، نت نئے دن، وجود میں آتی رہتی ہیں۔ مخلوقِ خداوندی تو اس تحیر انگیز وسعت کو پیش نظر رکھیے اور پھر اس حقیقت پر غور کرے کہ اس نے اپنے آپ کو رب العالمین کہا ہے یعنی تمام کائناتوں کی ربوبیت کا ذمے دار۔ یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ سے تو غالب[1] کا وہ شعر یاد آجاتا ہے کہ

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز

پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

اس تخلیق، اس مخلوق، ان کائناتوں، میں نت نئے اضافے ہوتے رہتے ہیں۔ ان عربوں کے ہاں پھر ایک اور خصوصیت بھی تھی۔ وہ تو قوم ہی عجیب تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ مٹی اور پتھر یعنی جامد چیزوں (Inorganic Matter) میں نشوونما نہیں ہوتی، اس لیے وہ ''عالم'' کا لفظ صرف جاندار یا ذی شعور چیزوں کے لیے بولتے تھے، جن کی نشوونما ان کی سمجھ میں آتی تھی۔ آج تو بہر حال سائنٹسٹ اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ جنہیں ہم جامد یا بے جان چیزیں (Inorganic Things) کہتے ہیں، درحقیقت ان میں بھی نشوونما ہوتی رہتی ہے لیکن عرب یہاں تک نہیں پہنچے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ جو مٹی اور پتھر کی چیزیں ہیں، وہ عالم کے زمرے میں نہیں آتیں، ان کے لیے وہ عالم کا لفظ بولتے ہی نہیں تھے۔ اسی نہج سے وہ عالمین سے مراد ''دنیا کی مختلف قومیں'' لیتے تھے۔ اگر ہم عربوں کے قدیم تصور کے مطابق اس لفظ کو ''جاندار

---

[1] مرزا اسد اللہ خاں غالب (1797-1869)

اشیاء'' تک ہی محدود سمجھیں تو بھی قرآنِ کریم کی رو سے جاندار اشیاء اسی کرۂ ارض تک محدود نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ فضائے آسمانی میں پھیلے ہوئے کرّوں میں بھی ایسے ہیں جن میں جاندار مخلوق موجود ہے۔

سموات میں بھی کروں کے اندر زندگی کا وجود

عزیزانِ من! ذرا سوچیے کہ چودہ سوسال پہلے یہ چیز خدائے خبیر وعلیم کے سوا کون کہہ سکتا تھا۔ وہ کہتا یہ ہے کہ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ (42:29) آیاتِ خداوندی میں سے یہ بھی ہے کہ اُس نے ارض وسماء کو پیدا کیا اور ان دونوں میں جاندار مخلوق کو پھیلا دیا۔ آج اس کرۂ فضائی میں تیرنے والے کرّوں کے متعلق اس نکتے پر تحقیقات ہو رہی ہیں' کہ اگر ان میں کہیں نمی نظر آجائے' یا محسوس ہو جائے کہ ان میں نمی ہے' تو اس سے یہ نظر آجائے گا کہ ان میں جاندار مخلوق ہے کیونکہ جان یا زندگی کا تعلق نمی یا پانی سے ہے۔ قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ ارض اور سموٰات یہی کرۂ ارض نہیں بلکہ سموٰات میں بھی ایسے کرّے ہیں' جہاں تمہیں جاندار مخلوق ملے گی۔

عزیزانِ من! اب اگلا ٹکڑا' سنیے اور فرانس کے اس نامور محقق ڈاکٹر مورس بکائے [1] کے الفاظ پہ غور کیجیے۔ وہ دنیا بھر کے سائنٹسٹوں سے کہتا ہے کہ بتاؤ چودہ سوسال پہلے یہ بات کون کہہ سکتا تھا کہ وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ (42:29) جاندار مخلوق تمہارے کرۂ ارض سے ہی نہیں ہے۔ اس اجرام سماوی میں سے بھی ایسے ہیں کہ جن میں ذی حیات (چلنے پھرنے والی مخلوق) ہے اور خدا اس بات پر قادر ہے کہ جب اس کے قانونِ مشیت کا تقاضا ہو تو وہ تمہیں اور اُن کو آپس میں جمع کردے۔ آج یہ جو چاند اور مریخ پر پہنچنے کی کوششیں ہو رہی ہیں' [2] عزیزانِ من! یہ وہی کچھ ہے' جسے قرآن نے چودہ سوسال پہلے کہہ دیا تھا لیکن اگر ہم لفظ عالمین کے مفہوم کو سمٹا کر' اس دنیا کے انسانوں تک محدود کر دیں' تو اس کا مفہوم عالمگیر انسانیت یا جملہ اقوامِ عالم ہو جائے گا۔ قرآنِ کریم میں اس لفظ کو ان معانی میں بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً خود قرآن کو ذکر للعالمین کہا ہے اور دیگر مقامات پر اسے بصائر للناس کہا ہے' یا ہدی للناس کہا ہے۔ اسی طرح اس نے

---

[1] Dr. Maurice Bucaille of France (1911-1989) (Ref. website Islamdawn, Shabbir Ahmed, M.D, Florida: Some Quranic vioces, Subject: No. 2: Analysis of Criticism Against Quran Upholders (Questions/ Anlswers), Sent Date: Saturday, April 01,2006. 6:03 pm) His book is the Bible, The Quran and Science.

[2] ان نکات کی تفصیل کے لیے یہ دو کتب دیکھیے: (ا) پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ الانبیاء' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص 92 تا 110۔ (ب) پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان' پارہ 29 (مکمل)' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006ء ص ص 166 اور 235۔

حضور نبی اکرم ﷺ کو رحمت للعالمین قرار دیا ہے اور دیگر مقامات میں حضور کی بعثت کافۃ للناس کے لیے ہوئی ہے۔ اس اعتبار سے رب العالمین کے معنی ہوں گے: ''تمام نوعِ انسان کی نشو ونما کا ذمے دار''۔ میں عام طور پر اس کے لیے عالمگیر نظام ربوبیت کی اصطلاح استعمال کیا کرتا ہوں چنانچہ قرآنی معیشت پر میری کتاب کا نام ہی ''نظامِ ربوبیت ہے۔''

انسانیت کے لیے عالمگیر نظام ربوبیت کا ضابطہ حیات

عالمگیر انسانیت کی ربوبیت سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ خدائے حقیقی' جس کا تصور قرآن نے دیا ہے' کسی خاص قبیلہ' خاص نسل' خاص قوم' بلکہ کسی خاص اہل مذہب کا رب نہیں' وہ عالمگیر انسانیت کا رب ہے اور اسی سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی جب خدا پر ایمان رکھنے والی امت' امت مسلمہ یا جماعت مومنین کے ہاتھوں' وہ نظام متشکل ہوگا جس کی رو سے خدا کی صفت رب العالمینی محسوس طور پر سامنے آئے گی تو اس کا عملی نتیجہ کیا ہوگا۔ یہ نظام تمام نوعِ انسان کو سامانِ نشو ونما بہم پہنچانے کی ذمے داری اپنے سر لے گا۔ قرآنِ کریم میں کہا گیا ہے کہ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:6) کرۂ ارض پر کوئی جاندار ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمے داری خدا نے اپنے اوپر نہ لے رکھی ہو۔ رزق کے خزانے تو خدا نے مہیا کر رکھے ہیں لیکن ان کی پیدائش اور تقسیم انسانوں کے ہاتھوں سے ہوتی ہے۔ یہ امت سامانِ زیست زیادہ سے زیادہ پیدا کرے گی اور اس کے بعد اس کی تقسیم اس انداز سے کرے گی کہ کوئی انسان اس سے محروم نہ رہنے پائے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کے مستحق حمد وستائش ہونے کی اوّلین وجہ اس کی رب العالمینی بتائی گئی ہے۔ اسے ایک محسوس مثال کے ذریعے سمجھیے۔ ایک بچہ شاہی محل میں پیدا ہوتا ہے' ایک جھونپڑی میں بھی' غریب کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے۔ خدا نے دونوں کی ربوبیت کا ذمہ اپنے اوپر لیا۔ دونوں کے ہاں جو یہ بچے پیدا ہوتے ہیں' دونوں ماؤں کی چھاتیوں میں دودھ کے چشمے یکساں طور پر جاری ہو جاتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ محل کے اندر رہنے والی شہزادی' رئیس زادی' امیر آدمی کی بیوی' کے ہاں تو اس کے بچے کو دودھ ملے اور غریب کے ہاں پیدا ہونے والے بچے کو نہیں۔

لفظ 'رحیم' کے مفہوم کی وسعت

خود اپنے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں کہا ہے کہ ہماری رحمت تمام اشیاء پہ محیط ہے۔ یہاں پر اگلی ہی آیت میں دو الفاظ ہیں' ان سے یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ وہ الفاظ ہیں: رحمٰن اور رحیم۔ ان دونوں الفاظ کا مادہ ایک ہی ہے ''ر ح م'' اور یہیں سے رحمِ مادر آپ کے ذہن میں آ جائے گا۔ رحم کے لیے بھی یہی لفظ ہے۔ بنیادی طور پر بظاہر اس کا تعلق ربوبیت سے نظر نہیں آتا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہی وہ مقامات ہیں یا ایسے ہی وہ مقام ہیں' جہاں سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ عرب اپنی زبان کے اعتبار سے کتنی بلندیوں پر پہنچے ہوئے تھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک قوم اور وہ بھی ایسی کہ زمانہ نزولِ قرآنِ کریم میں مکہ کے اندر' جو اس پورے ملک کا مرکزی شہر تھا'

بڑا ہی مشہور اور اہم مقام تھا' صرف سترہ آدمی ایسے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اعلیٰ تعلیم تو ایک طرف رہی' وہ صرف لکھنا پڑھنا ہی جانتے تھے۔ اس قسم کی قوم نے زبان میں اس قدر وسعتوں گہرائیوں' لطافتوں اور نزاکتوں کو لیے ہوئے' تصوارت وتخیلات دیئے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ باتیں انہیں کیسے مل گئی تھیں۔ بہر حال آپ دیکھیے کہ ان دونوں کا تعلق کیا ہے۔

عربوں کے سامنے جب ربوبیت کا تصور آیا تو اس کو محسوس طور پر سمجھنے اور سمجھانے کے لیے انہوں نے ''رحم'' کے تصور کو سامنے رکھا۔ غور فرمایئے کہ اس رحم کے ایک تصور نے بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ رحم مادر میں جنین کی ابتدا کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ مرد اور عورت کے جنسی اختلاط سے ایک ابتدائی لائف سیل کا استقرار رحم (Womb) میں ہوتا ہے یہ غیر مرئی جرثومہ Naked Eye (خالی آنکھ) سے نظر نہیں آتا لیکن اس جرثومے کے اندر ایک مکمل انسان بننے کی تمام ممکنات مضمر ہوتی ہیں: انسانی پیکر کی بھی اور انسانی صلاحیتوں کی بھی۔ اب اس جرثومے کو نشو ونما دی جاتی ہے کہ جس سے وہ اپنے اس نقطۂ آغاز سے اپنے نقطۂ تکمیل تک پہنچ جائے اور جنین ایک جیتا جاگتا بچہ' انسانی صلاحیتوں کو لیے ہوئے دنیا میں آئے۔ اب یہاں ربوبیت (نشو ونما) کی جو پہلی نئی چیز ہے کہ اس میں (نشو ونما) کی یہ کیفیت پیدا ہو' اس کے لیے رحم مادر کے تصور سے زیادہ کسی اور بہتر موضوع کا تصور ہو نہیں سکتا۔ اب اس کے بعد آپ دیکھیے کہ رحم کے اندر جو پرورش ہوتی ہے' اس کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ وہاں جس قدر سامانِ نشو ونما ملتا ہے' وہ پہلے دن سے آخری وقت تک' بچے کے بدلتے ہوئے حالات' تقاضوں اور ضروریات کے مطابق ملتا ہے یعنی ضرورت کے مطابق سامانِ نشو ونما۔ پھر اگلی چیز یہ ہے کہ رحم میں اس قدر لوچ اور لچک ہوتی ہے کہ بچہ جوں جوں بڑھتا پھولتا ہے' اس کے مطابق اس خول کے اندر بھی وسعت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے اور وہ اتنا نرم ہوتا ہے کہ بچے کو کروٹ تک لینے میں بھی کسی قسم کی کوئی زحمت' کوئی تکلیف' کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ یعنی نشو ونما اس انداز سے ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور پھر اگلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ سب کچھ بچے کو بلا مزد و معاوضہ ملتا ہے' اس کا کوئی صلہ (معاوضہ) اسے نہیں دینا پڑتا۔ یہ اس کی بڑی خصوصیت ہے' حتیٰ کہ وہ ماں جو اپنے خونِ جگر سے اس بچے کی پرورش کرتی ہے یوں کہیے کہ وہ خود اپنے جسم کا ایک حصہ اس کی طرف منتقل کر دیتی ہے' وہ بھی اس کے سر پر کوئی احسان نہیں دھرتی۔ نشو ونما کے اس پورے تصور کو' ان تمام خصوصیات کے ساتھ' سامنے رکھیے تو اس سے بات سمجھ میں آئے گی کہ خدا نے ربوبیت عالمینی کے بعد اپنی اس قسم کی رحمت کا ذکر کیوں کیا۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی اس صفتِ رحمت کے نمود وظہور کے لیے ''رحمٰن اور رحیم'' کے دو الفاظ کیوں آئے حالانکہ دونوں کا مادہ ایک ہی ہے۔

مولانا مودودیؒ کے نزدیک 'الرحمٰن' اور 'الرحیم' کا مفہوم

عزیزانِ من! جیسا کہ میں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ذکر میں کہا تھا کہ اس کا عام طور پہ ترجمہ کیا جاتا ہے: رحم کرنے والا' بہت

مہربان، بہت رحم کرنے والا، بہت مہربان، اور انگریزی زبان میں اگر آپ دیکھیں تو ترجمے ہوتے ہیں: Merciful, Beneficent۔ آپ سوچیے کہ کیا مہربان، بہت مہربان، Merciful, Beneficent کے ان معانی سے کوئی خاص خصوصیت، تصور، مفہوم آپ کے ذہن میں آتا ہے؟ اگر نہیں، تو یہ بات کیا ہوئی؟ قرآن اس کے لیے یہ دو الفاظ کیوں لایا ہے؟ ایک بات تو مجھے کچھ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتی ہے کہ ہمارے اس دور کے مفسرین اس سے بھی کچھ آگے چلے گئے۔ مجھے ان میں سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم (1903-1979ء) کا نام لینا پڑ گیا۔ جب میں یہ ریکارڈ کر رہا ہوں تو انہیں وفات پائے چند ہی دن گزرے ہیں تو معاذ اللہ میرا مقصد ان کی ذات کے خلاف کچھ کہنا نہیں ہے لیکن ان کی قرآنِ کریم کی تفسیر تو ان کی وفات کے بعد بھی موجود ہے اور رہے گی۔ اس لیے میں ان کی تفسیر سے ہی ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب کسی بات میں زور پیدا کرنا ہو تو یونہی ایک لفظ کا اضافہ کر دیتے ہیں مثلاً درازیٔ قد کے ذکر میں جب لمبا کہنے سے تسلی نہیں ہوتی تو اس لفظ لمبا کے بعد تڑنگا بھی کہتے ہیں تو گویا معاذ اللہ، اللہ تعالیٰ نے یہ جو ''رحمٰن و رحیم'' کے دو الفاظ استعمال کیے ہیں، اس لیے کہ یہ جو ایک لفظ کہنے سے جب تسلی نہیں ہوئی تو اس کے ساتھ یونہی ایک دوسرا لفظ کہہ دیا جیسے لمبا تڑنگا۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ اس قسم کے الفاظ ہوتے ہیں مثلاً یہ لمبا تڑنگا، ننگا دھڑنگا، روٹی ووٹی، تو ان میں یہ تڑنگا، دھڑنگا اور ووٹی مہمل کہلاتے ہیں۔ ان الفاظ میں زور پیدا کرنے کے لیے ان کے ساتھ مہمل الفاظ دیئے گئے ہیں۔ معاذ اللہ یہاں ''رحمٰن و رحیم'' میں ایسا نہیں ہے۔ اب آپ دیکھیے کہ یہ دو الفاظ کیوں آئے ہیں؟ یہ بڑی ہی اہم بات ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اسے تو مغرب کے سائنٹسٹ ہی Appreciate (سراہ) کر سکیں گے۔

لغت کے لحاظ سے 'رحیم' اور 'رحمٰن' کی خصوصیات میں فرق

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ عربی زبان کے ایک تو Root (مادے) کے اندر کچھ معانی ہوتے ہیں اور ایک اس کے ہاں مختلف ابواب ہوتے ہیں اور ہر باب میں وہی Root (مادہ) آتا ہے، اس کی ایک خصوصیت ہوتی ہے۔ [1] رحیم کا لفظ ''فعیل'' کے وزن پر ہے، جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس صفت کا ظہور التزاماً بتدریج مسلسل ہوتا چلا جاتا ہے یعنی جب ہم خدا کو ''رحیم'' کہیں گے تو اس کے معنی ہیں ''اس کی صفتِ رحمت کی نمود اور اس کا ظہور مسلسل التزاماً ایک تدریج کے ساتھ ہوتا چلا جاتا ہے''۔ اس کے برعکس ''رحمٰن'' کا وزن ''فعلان'' پر ہے اور اس باب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اس صفت کا ظہور اسی شدت سے ہوتا ہے مگر اس شدت کے ساتھ وہ

---

[1] مادہ (Root)، اوزان افعال، مشتقاق اور ابواب کے ان نکات کی تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ الانبیاء، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2005، ص ص 20 تا 21 بمع انہی 2 صفحات کے فٹ نوٹ

صفت ہنگامی طور پر' برجستہ اچانک نمودار ہوتی ہے تو گویا ''رحیم'' التزاماً بتدریج ہے اور ''رحمٰن'' میں وہی صفت رحمت' برجستہ ہنگامی طور پر' شدت کے ساتھ' اچانک نمودار ہوتی ہے۔ ان دونوں مفاہیم میں یہ فرق بڑے گہرے غور وفکر کا متقاضی ہے جیسا کہ میں نے پہلے بھی بتایا ہے کہ مغرب کے سائنس کے محققین' اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اشیائے کائنات میں نشو ونما ارتقائی طریق سے ہو رہی ہے یعنی وہ اپنے نقطہ آغاز سے بتدریج نشو ونما پاتے ہوئے آگے بڑھتی چلی آتی ہیں تا آنکہ وہ منزل تکمیل تک پہنچ جاتی ہیں۔ یہ ارتقائی مراحل کڑی در کڑی' مسلسل' تدریجاً' التزاماً طے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ تو یہ جو ''فعیل'' کے وزن پر ''رحیم'' کا لفظ ہے' وہ اس مفہوم کو ادا کرتا ہے۔

الرحمٰن کی صفت کے سلسلہ میں مغرب کے سائنسدانوں کی ریسرچ

مغرب کے سائنسدانوں (Scientist) کی ایک تحقیق اب یہ بھی ہے کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ شے ایک ہی جست میں مختلف کڑیاں پھاند کر' ایک نئی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اسے ان کی اصطلاح میں Emergent Evolution (فجائی ارتقا) کہتے ہیں۔ اس کا ترجمہ ہمارے ہاں فجائی ارتقا کی اصطلاح سے ہوتا ہے۔ Emergent Evolution (فجائی ارتقا) کے متعلق یہ سائنسدان کچھ نہیں بتاتے۔ چنانچہ اس نظریئے کا امام C.L. Morgan [1] اپنی کتاب Emergent Evolution, (Edition 1923) (فجائی ارتقا) میں لکھتا ہے کہ ''اگر یہ پوچھا جائے کہ جس چیز کو تم Emergent (فجائی) کہتے ہو' وہ بالآخر ہے کیا؟ تو اس کا مختصر جواب فقط اتنا ہے کہ یہ ایک نئی قسم کا رابطہ ہوتا ہے [2] اور اگر یہ پوچھا جائے کہ یہ روابط کس اعتبار سے نئے ہوتے ہیں؟ تو اس کا جواب اتنا ہی ہے کہ ان کی خصوصیات کے متعلق ان کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے کچھ نہیں کہا جا سکتا'' اسی لیے ہم اسے Emergent Evolution (فجائی ارتقا) سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی باب میں Viscount Samuel نے کہا ہے کہ ''علت ومعلول کی زنجیر میں بعض اوقات ایسے مستثنیات آتے ہیں جنہیں صرف دستِ قدرت ہی ظہور میں لا سکتا ہے''۔ اس کی کتاب کا نام Belief and Action ہے۔ اس میں اس نے یہ چیز کہی ہے۔ ضمناً یہ کہہ دوں کہ عصر حاضر کا یہ نظریہ اتفاقی نہیں ہے۔ ہمارے متقدمین حکماء کے ہاں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً ابن مسکویہ' ابوعلی احمد (المتوفی 421ھ) ہمارے ہاں کا اپنے دور کا ایک سائنٹسٹ گزرا ہے۔ اس نے اپنی تصنیف [3] ''الفوز الاصغر'' میں

---

[1] C.L. Morgan اپنے اس فجائی ارتقا میں Creative and Directive power of god ''خدا تعالیٰ کی قوتِ تخلیق و ہدایت'' کے لیے استعمال کرتا ہے۔

[2] نابغہ (Genius) کی نشو ونما یک طرفہ (Lop- sided) ہوتی ہے۔

[3] یہ حکیم ابن مسکویہ (المتوفی 421ھ) کا مشہور رسالہ ''الفوز الاصغر'' ہے۔ اس نے اس نظریہ پر خصوصیت سے بحث کی ہے۔ نباتات کے تدریجی ارتقائی مراحل کا ذکر کرتے ہوئے یہ حکیم لکھتا ہے کہ ''اب یہی تدریجی ترقی کر کے خرما کے درخت میں بغایت شرف ظہور کرتا ہے اور نباتات کو مرتبہ اعلیٰ پر پہنچاتا ہے کہ اگر اس مرتبہ سے ذرا سا بھی آگے بڑھے تو حد نباتاتی سے نکل جائے اور صورتِ حیوانی اختیار کر لے۔ [باقی اگلے صفحے پر]

اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ ان متقدمین کے ہاں بھی Emergent (فجائی) کی رو سے پیدا ہونے والے خلا یا جست کو ''طفرہ'' کہا جاتا ہے۔ بہر حال کہنا یہ مقصود تھا کہ ایک تو ارتقا کا سلسلہ تدریجاً، مسلسل، التزاماً چلا آتا ہے اور اس میں کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ جو انتظام کی کڑیاں ہیں، وہ بیچ اٹھتی ہیں اور وہ جو سلسلہ ارتقا کا ہے، وہ جست کے ساتھ پھاند کر، ہنگامی طور پر، آگے کی منزل میں، جا پہنچتا ہے۔

اب اس سے آپ دیکھیے کہ اشیائے کائنات کو ان کی نشوونما کے لیے جو سامانِ رحمت ملتا ہے، اس کی عمومی شکل تو یہی ہے کہ وہ التزاماً، مسلسل، کڑی در کڑی ملتا جاتا ہے۔ اس کے لیے قرآنِ کریم نے خدا کو ''الرحیم'' کہہ کر پکارا ہے لیکن جب اس کی نمود ہنگامی طور پر، فجائی ارتقا کی شکل میں ہو تو اس کے لیے اس نے خدا کو ''الرحمٰن'' کہا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ صرف ''اوزان یا ابواب'' کے فرق سے بات کہاں سے کہاں جا پہنچی اور یہ بات اس طرح سمجھ میں آ گئی کہ قرآن نے ایک ہی مادہ کے دو الفاظ کیوں استعمال کیے ہیں۔

انسانی تخلیق اور رحمانیت و رحیمیت

جہاں تک تخلیق انسانی کا تعلق ہے، قرآنِ کریم کی ایک ہی آیت میں ان دونوں صفات کی نمود بڑے بصیرت افروز اور حقیقت کشا انداز میں کی گئی ہے۔ سورۃ المؤمنون تیئیسویں سورۃ میں یہ کہا گیا ہے کہ تخلیق انسانی کی ابتدا جامد مادہ سے ہوئی، پھر رحم مادر میں حمل قرار پایا تو نطفہ تولید نے نشوونما پانا شروع کیا۔ پہلے اس نے جونک کی سی شکل اختیار کی، پھر وہ گوشت کا لوتھڑا سا بن گیا۔ پھر اس میں ہڈیوں کا ڈھانچہ ابھرا، پھر ان ہڈیوں پر گوشت کی تہہ چڑھا دی گئی (23:12-14)۔ یہاں تک طریقِ تولید و نشوونما عام حیوانوں اور انسانوں کے جنین کی صورت میں یکساں ہوتا ہے اور بتدریج عمل میں آتا ہے۔ یہ خدا کی صفت رحیمیت کی رو سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد انسان اور حیوان میں ایک ایسا بنیادی فرق پیدا ہوتا ہے، جو سابقہ کڑیوں کے ارتقا کا طبعی نتیجہ (Physical Result) نہیں ہوتا۔ وہاں یک لخت ایک تبدیلی ظہور میں آتی ہے۔ اس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ (23:14) پھر خدا نے اسے ایک نئی قسم کی مخلوق بنا دیا۔ یہ التزاماً بتدریج ارتقا کا سلسلہ تھا۔ یہ فجائی ارتقا (Emerggent Evlution) کا نتیجہ تھا۔ اس خلق جدید کی رو سے انسان کو اس کی ''ذات'' عطا کر دی جاتی ہے جس کی بنیادی خصوصیت اختیار و ارادہ ہے اور جس کی نشوونما سے یہ مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ اس فجائی ارتقا کے لیے ''الرحمٰن'' کا لفظ آیا ہے۔ ''رحیم'' کا لفظ جو بتدریج نشوونما ہوتی تھی، اس کے لیے آیا تھا۔

-------------------------[گزشتہ سے پیوستہ]

خرما کے درخت میں نفس کا اثر اس درجہ قوی اور زیادہ ہوتا ہے کہ حیوان سے کثیر مشابہت اور قوی نسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک تو مثل حیوان سے اس میں نر اور مادہ ہوتے ہیں اور بار آور ہونے کے لیے نر کو مادہ سے ملانا ضروری ہوتا ہے۔ اس ملانے کو تلقیح کہتے ہیں جو حیوانات کے جماع کے مثل ہے۔ پھر خرما کے درخت میں علاوہ جڑ اور رگوں کے ایک چیز مثل دماغ حیوانات کے ہوتی ہے۔ یہ اس کے لیے ایسی ضروری ہے کہ اگر اس کو کوئی آفت لاحق ہو جائے تو درختِ خرما ضائع ہو جاتا ہے۔ (حوالہ پرویزؒ: ابلیس و آدم: ادارہ طلوعِ اسلام، لاہور، 1983، ص۔ 14)

پیکرِ انسانی کے اندر پنہاں ذاتِ انسانی کی نشوونما کے لیے اصول واقدار

اس کے بعد آگے چلیے۔یہیں سے انسان کے جسم کی نشوونما تو متعدد ذرائع سے اسباب سے ہوتی ہے کھانے پینے سے غذا سے ہوا سے لیکن اس کی ذات کی نشوونما ان اقدار اور احکام کی پابندی سے ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی دیئے جاتے ہیں۔جب خدا نے اپنے متعلق کہا تھا کہ کَتَبَ رَبُّکُمْ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَةَ (6:54) خدا نے سامانِ نشوونما یعنی رحمت کا عطا کرنا اپنے اوپر فرض قرار دے رکھا ہے تو اس رحمت میں انسان کی طبعی زندگی کی نشوونما کے سامان کے علاوہ اس کی ذات کی نشوونما بھی شامل کی۔یہاں ہمارے سامنے ایک اور گوشہ آتا ہے جو اس کی صفت رحمانیت کا خصوصی مظہر ہے۔انسان کے متعلق ایک تو ظاہر ہے اور جیسا قرآنِ کریم نے بھی کہا ہے کہ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ (96:5) انسان کے اندر علم حاصل کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔یہ علم مختلف طریقوں سے حاصل ہوتا ہے: مشاہدات تجربات مطالعہ تعلیم درس وتدریس وغیرہ۔ان طریقوں سے علم بتدریج حاصل کیا جاتا ہے۔بچہ ABC (ا ب ج) سے ایم۔اے تک پہنچتا ہے اور جو انسان بھی چاہے علم حاصل کر سکتا ہے۔بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ اس گوشے میں خدا کی صفتِ رحیمیت کارفرما ہوتی ہے لیکن علم کی ایک اور قسم بھی ہے جو مندرجہ بالا طریقوں میں سے کسی طریق سے حاصل نہیں ہو سکتی نہ ہی اس میں انسان کی اپنی کوشش یا کسب وہنر ہی داخل ہو سکتا ہے۔یہ خدا کی طرف سے اس کے برگزیدہ انسانوں کو براہِ راست ملتا تھا۔اسے وحی کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔یہ وہ علم ہے جس کے لیے کہا گیا کہ وَاللّٰهُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَآءُ (2:105) اللہ اپنی مشیت کے پروگرام کے مطابق جسے چاہتا ہے اس رحمت کے لیے مختص کر لیتا ہے۔یہ حقیقت ہے کہ حصولِ وحی میں انسان کے اپنے کسب وہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔اس حقیقت سے واضح ہے کہ جس برگزیدہ ہستی کو اس کے لیے منتخب اور مختص کیا جاتا تھا اسے وحی ملنے کے ذرا بھی پہلے اس بات کا علم واحساس تک نہیں ہوتا تھا کہ اسے یہ علم عطا ہونے والا ہے چنانچہ خود نبی اکرم ﷺ کے متعلق فرمایا کہ مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ (42:52) اس سے پہلے تو جانتا ہی نہیں تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں اور ایمان کیا ہوتا ہے۔اس سے ظاہر ہے کہ وحی کے عطا ہونے میں خدا کی صفت رحمانیت کا ظہور ہوتا تھا۔اسی لیے اس کے متعلق کہہ دیا کہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ (55:1-2) قرآن کا علم رحمٰن نے عطا کیا ہے۔یہ اس کی صفت رحیمیت کی بنا پہ بتدریج حاصل نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس میں وہ چیز ہے جسے اس نے Emergent (فجائی) کہہ کر پکارا ہے برجستہ طور پر یک لخت کسی کو عطا ہوتا ہے اور یہاں خدا کی صفتِ رحمانیت کا ظہور ہوتا ہے۔

نبی اکرمؐ کے لیے قرآنِ حکیم کی تعلیم اور صفت رحمانیت

عزیزانِ من! اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کے متعلق کہا ہے کہ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ❶ (17:82)۔ اسے رحمت کہا گیا اور جیسا کہ ابھی میں نے کہا کہ یہ صفت رحمانیت کا تقاضا تھا جس کی بنا پہ حضور کو یہ وحی عطا ہوئی اور اب اس رحمت کے دروازے تمام مومنوں کے لیے کھول دیئے گئے' مومنین کے لیے ہی نہیں بلکہ اسے دنیا کا کوئی بھی انسان' جو اسے حاصل کرنا چاہے' اس سے فائدہ اٹھانا چاہے' وہ اس کے لیے رحمت بن جاتا ہے اور چونکہ یہ قرآن حضور نبی اکرم ﷺ کی وساطت سے ملا تھا' اس لیے حضور کو بھی رحمۃ للعالمین کہا گیا (21:107) یعنی تمام عالمین کے لیے رحمت۔

قرآنِ حکیم کے پیش کردہ رحم کے مفہوم کے برعکس عیسائیت کے نزدیک رحم کا تصور

آگے بڑھنے سے پہلے ایک اور بنیادی نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ خدا کی صفتِ رحیمیت کے اندر ''رحم'' کا مفہوم بھی شامل ہے لیکن قرآن کے' رحم کے قرآنی مفہوم اور دنیا میں رائج مفہوم میں بنیادی فرق ہے۔ اس مروّجہ مفہوم کو عیسائیت نے عام کیا اور اسی سے وہ غلط فہمیاں پیدا ہوئیں جن کا شکار خود مسلمان بھی ہو گئے۔ ان کے ہاں یہ تصور تصوف (Mysticism) کے ذریعے زیادہ پھیلا ہے۔ عیسائیت کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ اپنے اوّلیں ماں باپ' آدم وحوا' کے گناہ کی آلائش میں گناہ گار پیدا ہوتا ہے۔ اسے Original Sin (اوّلین گناہ) کہا جاتا ہے۔ انسان کے لیے گناہ کی اس آلائش سے پاک اور صاف ہونا کسی طرح ممکن نہیں۔ اس کا منطقی اور فکری نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی انسان جنت میں جانے کے قابل ہی نہیں رہتا۔ عیسائیت میں نظریہ یہ ہے کہ جب خدا نے بیچارے انسانوں کی اس حالت پر غور کیا' تو اُسے معاذ اللہ بڑا افسوس ہوا۔ اسے ان پر ترس آیا اور اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کو دنیا میں بھیجا تاکہ مخالفین اسے صلیب دے دیں اور یوں اس کا خون انسانوں کے گناہوں کا کفارہ بن جائے۔ اس سے عیسائیت کا یہ عقیدہ عام ہوا کہ نجات کا مدار انسانی اعمال پر نہیں بلکہ خدا کے رحم پر ہے' جو اس نے اپنے بیٹے کو قربان کر کے' صلیب پر چڑھا کے' نوعِ انسانی پر کیا اور یہ رحم ان لوگوں کو نصیب ہوتا ہے جو حضرت مسیح ◆ کے کفارہ پر ایمان لائیں' یعنی اس بات پر ایمان لائیں کہ ان کے گناہوں کے کفارہ میں انہوں نے اپنی جان دے دی۔ عہد نامہ جدید میں سینٹ پال کے خطوط پڑھیے۔ ان میں اس عقیدے کو عام کیا گیا ہے۔ ایک نے کہا ہے کہ تم کو ایمان کے نتیجے ہی سے نجات ملتی ہے اور یہ تمہاری طرف سے نہیں' خدا کی بخشش ہے اور نہ اعمال کے سبب سے ہے۔ ایک اور خط میں اس نے لکھا ہے کہ ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسان شریعت کے اعمال کی رو سے نہیں بلکہ ایمان یعنی Faith کی رو سے راست باز ٹھہرتا ہے۔ یہی

---

❶ یہ سب کچھ' اس قرآن کی رو سے ہوگا جس کی تعلیم' جماعتِ مومنین کے دل کے تمام روگ مٹا دے گی۔ ان کی نفسیاتی کمزوریاں اور داخلی کشمکش دور ہو جائے گی' اور مثبت طور پر' ان کی صلاحیتوں کی نہایت عمدگی سے نشوونما ہو جائے گی۔ (مفہوم القرآن از پرویزؒ)

وہ نظریہ ہے جس کی رو سے خدا کے متعلق عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے: God is Mercy یا God is Love یعنی خدا محبت یا رحم کا مجسمہ ہے اور یہی ہے وہ تصور جس کی رو سے قرآنِ مجید کے انگریزی تراجم میں رحمٰن اور رحیم کے لیے Beneficient اور Merciful کے الفاظ آتے ہیں یعنی رحم کرنے والا' ترس کرنے والا۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم کی عمارت مکافاتِ عمل کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے

عیسائیت کے اس نظریئے کے خلاف قرآنِ کریم کی تعلیم کی ساری عمارت قانونِ مکافاتِ عمل (Law of Respite or Law of Requital) کی بنیاد پر استوار ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے ہر انفرادی یا اجتماعی عمل کا نتیجہ اس قانون کے مطابق مرتب ہوتا ہے جو خدا نے اس کے لیے مقرر کیا ہے۔ مثلاً سنکھیا کھانے کا نتیجہ ہلاکت ہے' صاف اور مصفا پانی ممدِ حیات ہے۔ یہی قانون طبعی کائنات میں اور خود انسان کی طبعی زندگی سے آگے بڑھ کر اس کی انسانی زندگی میں بھی کارفرما ہے۔ یعنی انسان کا ہر غلط کام' ایک تخریبی نتیجہ پیدا کرتا ہے اور صحیح کام یعنی جو کام خدا کے بتائے ہوئے پروگرام اور اقدار کے مطابق ہوگا' وہ تعمیری نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ اسے خدا کے نظامِ عدل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ خدا کا یہ نظام غیر متبدل اور اٹل ہے اور ظاہر ہے کہ عدل میں تو رحم کا کوئی تصور ہی نہیں آ سکتا۔ اگر اس میں رحم کی بنیاد پر کچھ کیا جائے گا تو عدل کے منافی ہو جائے گا۔

عدل کے ساتھ رحم کا قرآنی تصور

لیکن ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ خدا کی صفتِ رحیمیت میں عدل کا تصور بھی شامل ہے تو اس سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہ عدل اور رحم بظاہر دو متضاد تصورات ہیں' ان دونوں میں مطابقت کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ رحم کے قرآنی مفہوم کی رو سے تضاد باقی نہیں رہتا۔ اس میں عدل بھی رہتا ہے اور رحم بھی۔ اسے ایک مثال کی رو سے سمجھیے۔ ایک آدمی آگ میں انگلی ڈالتا ہے' انگلی جل جاتی ہے' اس سے شدت کی تکلیف ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ خدا کے قانونِ عدل کی رو سے ہوتا ہے' جس میں رحم کا کوئی شائبہ نہیں۔ جو شخص بھی آگ میں انگلی ڈالے گا' انگلی جلے گی تو پھر درد ہوگا' تکلیف ہوگی' لیکن جس خدا نے یہ قانون بنایا ہے کہ آگ سے انگلی جل جاتی ہے' اسی خدا نے ایسی دوائیاں بھی پیدا کر دی ہیں جن کے استعمال سے یہ الم انگیز تکلیف بھی ختم ہو جاتی ہے اور انگلی کی از سر نو نشو و نما کا انتظام بھی ہوتا ہے۔ اس قسم کے اسبابِ مدافعت یا علاج کی تخلیق' خدا کی رحمت یا اس کا رحم ہے۔

نبی اکرمؐ کے لیے قرآنِ حکیم کی مستقل اقدار

آپ نے دیکھا کہ رحم کے اس تصور میں قانون کا تصور کارفرما ہے یعنی جس طرح خدا کا یہ قانونِ عدل ہے کہ آگ میں انگلی ڈالنے سے انگلی جل جاتی ہے' اسی طرح خدا کا یہ بھی قانون ہے کہ فلاں قسم کی دوائی لگانے سے انگلی اچھی ہو جاتی ہے۔ پہلا قانونِ عدل بھی ہر

انسان کے لیے ہے، ہر زمانے کے لیے ہے، ہر قوم کے لیے ہے، ہر ملک کے لیے ہے اور یہ دوسرا قانون جسے آپ قانونِ رحمت کہہ لیجیے یعنی اس پہلے غلط کام کی وجہ سے جو تخریبی نتیجہ مرتب ہوا ہے، اس کے ازالے کے لیے جو تجویز، تدبیر خدا نے عطا فرمائی ہے، وہ بھی تمام دنیا کے انسانوں کے لیے، ہر قوم کے لیے، ہر شخص کے لیے، ہر زمانے کے لیے، ہر ملک میں انسانوں کے لیے، یکساں طور پر آتی ہے تو جب کوئی شے جس کا اطلاق اس طرح سے ہر زمانے میں، ہر طلب پر یکساں طور پر ہو تو اسے قانون کہا جاتا ہے۔ لہٰذا عدل بھی خدا کا قانون ہے اور اس کی رو سے انسان کے اعمال کے جو بھی نتائج مرتب ہوتے ہیں، ان کے تخریبی نتائج کے ازالے کے لیے بھی خدا کا قانون مقرر ہے۔ اس طرح اس قانون کے مقرر کرنے والے خدا کی صفت رحمانیت اور رحیمیت کارفرما ہے: رحیمیت عام تدریجی طور پر اور رحمانیت جو قرآن نے اس کے لیے طریق بتایا ہے اس کی بنا پر۔ تو یہ ہے قرآن کا فلہٰذا دین کا مفہوم۔

توبہ کا قرآنی مفہوم اور یہودیوں نیز عیسائیوں کے عقائد

اب توبہ کا سوال آتا ہے۔ اگر انسانی زندگی میں اسے پیدا کر لیا گیا تو پھر توبہ کا کیا فائدہ؟ یہ ہے سوال۔ اس کا قرآنی مفہوم بھی ایک مثال سے سمجھ میں آ سکے گا۔ آپ نے کسی خاص گاؤں جانا ہے، کسی دوراہے پر آپ کا قدم غلط سمت کی طرف اٹھ گیا۔ یہ گمراہی ہے، لغزش ہے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد آپ کو کسی نے بتایا یا علاماتِ راہ سے آپ نے محسوس کیا کہ میں غلط راستے پر چل رہا ہوں۔ اس کے بعد آپ اسی راستے پر آگے قدم نہیں بڑھائیں گے۔ آپ کو پھر لامحالہ اس دوراہے پر واپس آنا ہوگا، جہاں سے آپ اس غلط راستے کی طرف بھول گئے تھے۔ یہ اس صحیح دوراہے پر آنے کے لیے واپس مڑ آنا جو ہے، اسے عربی زبان اور قرآنِ کریم کی اصطلاح میں توبہ کہا جاتا ہے لیکن محض اس دوراہے پر واپس آ جانے سے تو اس نقصان کی تلافی نہیں ہو سکتی جو غلط راستے پر چلنے سے ہوئی تھی۔ آپ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ آپ تو صرف اس دوراہے پر آئے۔ اب اس دوراہے سے صحیح راستے پر گامزن ہونا بھی ضروری ہے۔ اسے عمل صالح کہا جاتا ہے۔ اس طرح انسانی لغزش کے پیدا ہونے والے نقصان کی تلافی ہو جاتی ہے۔ انسانی زندگی میں اس طرح کی تلافی مافات اور بازآفرینی کے لیے خدا کے قوانین مقرر ہیں۔ ضابطہ حیات میں اس قسم کے قوانین کا رکھ دینا قرآنی اصطلاح میں خدا کا رحم کہلاتا ہے۔ خدا انہی معنوں میں رحیم ہے۔ ان امور کی تفصیل میں آگے چل کر بیان کروں گا جہاں توبہ سے متعلق آیات کی تشریح کی جائے گی۔

عزیزانِ من! یہودیوں کے ہاں توبہ کا تصور ہی نہیں۔ ان کے ہاں جو لغزش ہو گئی، وہ ناقابلِ تلافی ہے۔ اسی طرح عیسائیت میں بھی اعمال کے ذریعے گناہ کی آلائش کو الگ کر دینے کا امکان نہیں۔ وہ صرف مسیح ◆ کے کفارے پر ہی ایمان لانے سے ہو سکتی ہے۔ ہندو دھرم کی رو سے انسان اپنے سابقہ جنم کے کرموں یعنی اعمال کے نتیجے میں جس جنم میں آ گیا، چوہا، کتا، سور، وغیرہ موجودہ جنم میں، اس کا بدل لینا ناممکن ہے۔

بازآفرینی سے مایوسی کفر ہے

ان اہلِ مذاہب کے ہاں قرآنی مفہوم کے مطابق خدا کی رحمت یعنی بازآفرینی کے امکان سے انکار کیا جاتا ہے۔ اسے قرآن کفر سے تعبیر کرتا ہے اسی لیے وہ کہتا ہے کہ اِنَّهٗ لَا يَايْــَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (12:87) اس سے صرف وہ لوگ مایوس ہوتے ہیں جو اس کے قانون پر یقین نہیں رکھتے کہ سعی و عمل اگر صحیح خطوط پر ہوں تو ان کے نتائج بھی صحیح نکلیں گے۔ اس لیے اللہ اپنے رسول کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ (39:53) اے رسول! میرے ان بندوں کو جو اپنے آپ پر زیادتی کر بیٹھے ہوں، زندگی کے دوراہے کے غلط راستے کی طرف مڑ گئے ہوں، تو ان سے کہہ دو کہ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (39:53) وہ خدا کے قانونِ رحمت سے ناامید نہ ہوں۔ اس کے نظامِ عدل میں غلطیوں کے نقصانات کے ازالے کا انتظام بھی موجود ہے۔ تم میں جب بھی یہ احساس پیدا ہو کہ تمہارا قدم غیر خداوندی راستے کی طرف اٹھ گیا ہے تو وَ اَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ (39:54) تم اپنے نشوونما دینے والے کے قوانین کی طرف رجوع کرو۔ وَ اَسْلِمُوْا لَهٗ (39:54) اور اس کے قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کرو۔ اس سے تم اپنی لغزش سے پیدا ہونے والے نقصانات سے بچ جاؤ گے لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ تم اس سے پہلے کہ اس لغزش کے تخریبی نتائج تمہارے سامنے آئیں، قوانین خداوندی کی طرف رجوع کر لو۔ اگر اس میں تاخیر کر دی تو پھر ان کا ازالہ ممکن نہیں ہوگا۔ اس طریق سے غلط کاموں کے تخریبی نتائج کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ اسے قرآن میں چار الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا گیا کہا کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (11:114) غلط اقدامات کے تخریبی نتائج کے ازالہ کی صورت یہ ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ تعمیری کام سرانجام دو، برائیوں کے نتائج کو بھلائیوں سے دور کرو۔ یہ ہے خدا کے رحم کے بروئے کار آنے کی صورت۔ غلط کوشیوں سے اگر بے زار ہو گئے ہو تو خدا نے علاج کے لیے دوائیاں بھی پیدا کر دی ہیں۔ وہ علاج کرو، اس علاج سے بیماری رفع ہو جائے گی اور اس کے بعد پھر مزید تعمیری کام کرو جس سے تمہاری وہ توانائی، وہ صحت جو اس سے پہلے غلط طریق کار کی وجہ سے ضائع ہو گئی تھی، لوٹ کر آ جائے۔ یہ ہے عزیزانِ من! قرآنِ کریم کا تصورِ عدل اور تصورِ رحمت۔

ہمارے نظریات، تعلیم اور زندگی پر عیسائیت کے عقائد کے اثرات

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے ہمارے ہاں بھی عیسائیت کے اثر سے رحم کا وہی تصور آیا جو ان لوگوں کے ہاں تھا۔ یہاں بھی یہ کہا جانے لگا کہ عدل سے کچھ نہیں بنتا، اعمال سے کچھ نہیں ہوتا، سب کچھ خدا کے فضل سے ہونا ہے، سب اس کی بخشش کے طفیل زندہ ہیں، انسان جو جی میں آئے کر لے، کچھ نہیں بن سکتا۔ عزیزانِ من! پھر اس قسم کی چیزیں آپ نے قوالوں کے ہاں سنی ہوں گی کہ "کی پرواہ اے راقب! او تھے بے پروائیاں۔ پھڑ لے عملاں والیاں نوں، تے چھڈ دے اوگن ہارنوں" [1] اندازہ لگائیے کہ اس طرح خدا کے نظامِ

---

[1] اسے راقب! وہاں کوئی تصورِ عدل نہیں ہے۔ وہ ذات "بے پرواہ" ہے۔ وہاں تو یہ ہے کہ وہ عمل کرنے والوں کو گرفتارِ بلا کر دے اور بے عملوں کو معاف کر دے۔

عدل اور قرآن کے تصورِ رحم میں کتنا فرق ہے اور اسے کس قدر غلط معنی پہنائے گئے ہیں۔ یہاں اجازت دیجیے کہ میں تصوف کی ایک کہانی آپ کو سناؤں۔

عدل اور فضل کے متعلق تصوف کی تعلیم

آپ کو شاید یاد ہے کہ میں نے تو اپنی آدھی عمر انہی وادیوں میں گزاری ہے۔ یہ سب چیزیں ہمیں پڑھائی جاتی تھیں۔ کہا یہ جاتا تھا کہ ایک بزرگ تھے، وہ اللہ کے مقرب بننا چاہتے تھے۔ انہوں نے بارہ برس تک ایک جنگل میں، ایک پتھر کے اوپر بیٹھ کر، خدا کی عبادت کی۔ بارہ سال کے بعد آواز آئی کہ تمہاری عبادت قبول ہوگئی ہے، مانگ کیا مانگتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آئے کہ میں کیا مانگوں۔ بارہ برس کی محنت ہے۔ اُوہ خدا کہتا ہے کہ جو مانگو گے ملے گا۔ ایک بزرگ صورت سامنے تشریف لائے۔ انہوں نے کہا کہ تو کس کشمکش میں گرفتار ہے، ہم نے باتیں سن لی ہیں، جو تم سے ہوئیں، کشمکش کاہے کی۔ بات آسان ہے، تم نے بارہ سال تک خدا کی عبادت کی، اس سے کہو کہ میں عدل مانگتا ہوں۔ اس نے کہا کہ بات ٹھیک ہے، اس کا معاوضہ تو بہت بڑا ہوگا۔ اس نے کہا کہ ''میں عدل مانگتا ہوں''۔ اللہ کی طرف سے آواز آئی کہ بہت اچھا، ہم تجھے عدل دیتے ہیں، تم بارہ برس تک اس پتھر کے اوپر بیٹھے رہے ہو، اب بارہ برس یہ پتھر تمہارے سر پر بیٹھے گا۔ یہ ہے عدل۔ اسے سن کر آپ ہنسیے نہیں، عزیزانِ من! آپ دیکھیے کہ عدل کی کیسی Definition (تعریف) ہے!! وہ تو راضی برضا رہنے والے بزرگ تھے۔ انہوں نے اس پتھر کو اٹھایا اور اپنے سر پر رکھ لیا اور بارہ برس پھر اس کے نیچے اسی طرح سے عبادت کرتے رہے۔ پھر اسی طرح بارہ برس عبادت کرنے کے بعد آواز آئی کہ مانگ کیا مانگتا ہے۔ پہلے عدل مانگ کے تو جو نتیجہ بھگتا تھا، وہ یاد تھا۔ کہا کہ مولا! میں تیرا فضل مانگتا ہوں، مجھے کہیں عدل نہ دے دینا، پہلے ہی میرا کچومر نکل گیا ہے۔

عزیزانِ من! آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کی تعلیم کے الرغم، اس تعلیم کے خلاف، کس کس قسم کے تصورات، ہمارے ہاں آئے ہوئے ہیں اور یہ اس ایک بزرگ کی کہانی پر منحصر نہیں۔ ہمارے ہاں عام طور پہ آپ دیکھیں گے کہ ہر جگہ خدا کے رحم کا یہی تصور ہے، ہر جگہ اسی کی طرف سے بخشش کی التجا ہے کہ ہر چیز اس کے کرم سے ہوتی ہے، ہر کام اس کی رحمت سے ہوتا ہے، انسان اپنی محنت سے کچھ نہیں کر سکتا اس کے اعمال کوئی نتیجہ نہیں پیدا کرتے، ان کے زیرِ نظریہ کچھ ہوتا ہے۔ قوم کے رگ و پے میں یہ چیز سرائیت کر گئی ہے حالانکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کی رو سے خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل کس قدر اٹل ہے اور اس میں جو رحم کا تصور ہے، وہ بھی ایک قانون کا تصور ہے۔ اس قانون کے اوپر عمل کرنا ہوگا تو اس سے اس غلط کام کے نتیجے میں جو نقصان ہوا ہوگا، اس کا ازالہ بھی ہو جائے گا اور مزید باز آفرینی کے نشانات بھی مرتب ہو جائیں گے۔ یہ ہے خدا کے Merciful ہونے کا تصور لیکن میں لفظ Mercy کا استعمال نہیں کروں گا کیونکہ اس سے پھر وہی عیسائیت کی Mercy ہمارے سامنے آ جائے گی۔ یہ خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ہے اور اسے توبہ کہا جائے گا۔ توبہ کے معنی

ہوں گے "لوٹ کے، پلٹ کے، وہاں آ جانا جہاں سے قدم غلط راستے کی طرف اٹھے ہوں"۔

سابقہ دروس پر ایک طائرانہ نظر

عزیزانِ من! پہلے تو آپ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں جو یہ دو الفاظ آئے ہیں، ان کے متعلق دہرا لیجیے جو میں نے کہا تھا کہ "ب" کا معنی ہوتا ہے "اس غرض اور مقصد کے لیے"۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ قرآن میں جب یہ چیز آئے گی تو یہ ہوگا کہ "جو کچھ اس کے بعد کہا گیا ہے اس کا مقصد اور اس کی غایت خدا کی صفتِ رحمانیت اور رحیمیت کا ظہور ہونا ہے" اور جب ایک مردِ مومن، ایک مسلمان، جو کوئی کام بھی شروع کرنے والا ہے، اس سے پہلے کہتا ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، تو وہ یہ اعلان کرتا ہے کہ جو کچھ میں کرنے والا ہوں، اس سے میرا کوئی اپنا ذاتی مقصد نہیں، تخریبی مقصد نہیں، اس کا مقصد یہ ہے کہ خدا کی صفت رحمانیت اور رحیمیت کا ظہور ہو جائے۔

اس کے بعد اب آ جائیے سورۃ الفاتحۃ کی طرف کہ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ o الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ o (1:1-2) سزاوارِ حمدیت، پوری کی پوری مکمل شکل کے اندر حمدیت، اس ذات کے لیے ہے جو ہر طرح کے اقتدار کا مالک ہے اور اس کا اقتدار تخریب کے لیے نہیں ہے، ربوبیت کے لیے ہے۔ اور اس کی ربوبیت کسی ایک فرد، ایک خاندان، ایک قوم، ایک ملک کے لیے نہیں، عالمین کے لیے ہے، پوری کائنات کے لیے ہے، تمام نوعِ انسانی کے لیے ہے اور اس کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں رحمانیت ہے، رحیمیت ہے، بلا مزد و معاوضہ ملتی ہے۔ جس چیز کی جس وقت ضرورت ہوتی ہے، اس انداز سے اس وقت ملتی ہے، نہایت لطافت اور رحمت اور محبت سے یہ چیز ملتی ہے اور اگر کبھی ہنگامی حالات ایسے آ جائیں کہ اس کی فوری ضرورت پڑے تو اس کی صفتِ رحمانیت کا ظہور ہو جاتا ہے۔ قرآن اس کی صفتِ رحمانیت کا ظہور ہے۔ قرآن ذکر للعالمین ہے۔ خدا رب العالمین ہے۔ اس کا رسول رحمۃ للعالمین ہے۔ اور خدا نے یہ کہا ہے کہ میری رحمت تمام کائنات کو محیط ہے اور اسی کے اندر نوعِ انسان بھی آ جاتی ہے بشرطیکہ نوعِ انسانی خدا کی اس رحمت کے پروگرام کو جو قرآنِ کریم کے اندر ہے، اپنا لے۔ اب رہی یہ بات کہ خدا کا یہ قانون عدل ہے، خدا کا قانونِ مکافات ہے، جو اٹل ہے، اس کے تصور کے لیے اب ہمارے سامنے اگلے الفاظ آتے ہیں کہ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ (1:3)۔ اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ؕ



چوتھا باب: سورۃ الفاتحۃ (آیت 3)



عزیزانِ گرامی قدر! اس درس میں سورۃ الفاتحۃ کی تیسری آیت ہمارے سامنے آتی ہے یعنی مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ (1:3)۔ اس سے پہلے ہمارے سامنے خدا کی صفاتِ ربوبیت، رحمانیت، اور رحیمیت آ چکی ہیں اور ان میں بنیادی نکتہ جو بیان ہوا وہ نشوونما دینے کا تھا۔ کسی شے کے نقطۂ آغاز سے اسے اس کے تکمیل تک بتدریج پہنچائے چلے جانا اور عندالضرورت ایمرجنسی کے طور پر، فجائی طور پر، ہنگامی طور پر، یہ سامان مہیا کرنا۔ بہرحال ان میں بات نشوونما کی تھی اور یہ ظاہر ہے کہ نشوونما وہی دے سکتا ہے، جس کا سامانِ نشوونما پر کنٹرول ہو۔ جس کا اقتدار ہو، جس کی اتھارٹی ہو، وہی سامانِ نشوونما مہیا کر سکتا ہے۔ اس کے لیے اب اگلا لفظ ہمارے پاس آتا ہے: مالک۔

''مالک'' کا مفہوم

لفظ مالک کا مادہ ''م ل ک'' ''م'' کی تینوں حرکات کے ساتھ آتا ہے یعنی زبر، زیر، پیش تینوں کے ساتھ: مَــلِکُ، مِــلْک، مُــلْک. اور اس سے آگے بات ملکوت کی چلی جائے گی اور پھر مالک کے ساتھ ملکیت بھی ہے۔ بہرحال اس کا مادہ ان تین حرفوں کے ساتھ آتا ہے اور ''م'' پر زبر، زیر، پیش کی تینوں حرکتوں کے ساتھ آتا ہے۔ اس مادہ کے بنیادی معنی ہوتے ہیں: ''کسی چیز پر قادر اور مستولی ہو جانا''۔ ملکیت کے لیے قبضے کا ہونا اسی لیے ضروری ہوتا ہے کہ اگر کسی شے کے اوپر قبضہ نہ ہو تو اسے کسی بھی قسم کی قدرت، طاقت حاصل نہیں ہوتی تو کسی چیز پر قادر اور مستولی ہونے کے لیے بنیادی طور پر یہ لفظ یا یہ مادہ آتا ہے۔ اس کے دوسرے معنی ہوتے ہیں کہ ''اختیار اور ارادہ یا اتھارٹی۔''

درحقیقت یہ بھی آپ دیکھیے کہ وہی قادر اور مستولی ہونے کے جو معنی ہیں، انہی میں یہ چیز آئے گی کہ اختیار بھی ہوگا، ارادہ بھی ہوگا۔ اتھارٹی کا لفظ اس کے لیے بڑا جامع ہوتا ہے لیکن جب یہ اختیار اور ارادہ کا لفظ خدا کی طرف منسوب ہوگا تو اس میں اس کی دو خصوصیتیں اور بھی آئیں گی اور یہی وہ خصوصیتیں ہیں جن کی وجہ سے جب ہم خدا کو مالک کہیں گے، اس کا ''ملک''، اس کی ملک کہیں گے تو وہ انسانوں کی ملک یا ملکیت کے تصور سے الگ ہوگا، ان کے تصورِ مملکت اور تصورِ ملک سے بھی مختلف ہوگا، جب ہم اسے خدا کی طرف منسوب کریں

گے۔ تیسرے اس کے بنیادی معنی غور سے سنیے: ''وہ سہارا جس پر کوئی چیز قائم ہو' وہ بنیاد جس پر کوئی عمارت استوار ہو''۔ خدا اگر اس کائنات کا مالک ہے' جیسا اس کے لیے کہا گیا ہے کہ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (9:16) اور مَلَكُوْتُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (6:75) تو اس کا ترجمہ تو ہم یہی کریں گے کہ کائنات کی ملکیت اس کی ملک' اس کی ملکوت' خدا کے لیے ہے۔ یہاں اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اس پر پورا اختیار و ارادہ اسی کا ہے' یہ اسی کے قبضہ کے اندر ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ معنی بھی ہوں گے کہ ''اس کا یہ اختیار اور ارادہ' اس کی یہ اتھارٹی' اس لیے ہے کہ وہ اشیائے کائنات کی زندگی اور نشو ونما کا سہارا بنتا ہے''۔

اب آپ دیکھیے کہ بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ مالک ہونے کے اندر صرف اقتدار کا پہلو ہی تھا لیکن قرآنِ کریم نے اس لفظ کے بنیادی معنی کے اعتبار سے ''جب خدا کا مالک ہونا ہوگا' تو انسانوں کا اقتدار یا استبداد یا جبر کا پہلو اس میں نہیں ہوگا' بلکہ وہ اشیائے کائنات کی نشو ونما کا سہارا بنتا ہے''۔ پھر اس مادہ میں ایک اور خصوصیت بھی ہے وہ یہ ہے کہ ''یہ وہ ذریعہ ہے جس سے دو چیزوں میں جوڑ پیدا ہو' وہ ذریعہ ہے' جس سے کوئی معاملہ درست ہو جائے اور کمال کو پہنچ جائے''۔ اسی لیے عربوں کے ہاں ''ملاک'' گارے کو کہتے تھے۔ آج کل اس کے لیے سیمنٹ کا لفظ بول لیجیے۔ یہ اس لیے کہ اس سے اینٹ اور پتھر آپس میں جڑ کر ایک دوسرے کی قوت کا سہارا بنتے ہیں اور یوں دیوار تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔ اس لیے اس میں معاملے کی درستگی' اس کا تکمیل تک پہنچ جانا' اور دو چیزوں کے درمیان تقویت کا موجب بن جانا ہے۔ اب آپ غور کیجیے کہ جب ہم خدا کے متعلق یہ کہیں گے کہ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (2:107) تو اس کے معنی یہی ہوں گے کہ ساری کائنات میں اقتدار اور اتھارٹی اسی کی ہے لیکن اس میں یہ بنیادی مفہوم بھی مضمر ہوگا کہ اس کا یہ اقتدار اشیائے کائنات کی زندگی اور نشو ونما کا سہارا ہے بلکہ یہ وہ اقتدار ہے' جس سے اجزائے کائنات ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ گویا وہ ایک وحدت بن گئے ہیں اور ان کا یہی وہ باہمی امتزاج اور وحدت ہے' جس پہ نظامِ کائنات اس حسن وخوبی سے سرگرمِ عمل ہے۔ یعنی کائنات کے ذرات میں باہمی کشش وجذب خدا کی اسی صفت کی رو سے پیدا ہوتی ہے اور اسی سے وہ اس کی نشو ونما کا ذریعہ بنتا ہے' اسی سے وہ ان کے ارتقائی منازل طے کر کے تکمیل تک پہنچاتا ہے۔

انسان کی ایک انگلی کی حرکت کہکشاں کے ایک ایک کرے کو متاثر کرتی ہے

عزیزانِ گرامیٔ قدر! جہاں جہاں خدا کی اس صفت مالکیت کا ذکر آئے گا' وہاں یہ دیکھنا ہوگا کہ ان معانی میں سے کون سا معنی سیاق وسباق کے اعتبار سے زیادہ موزوں ہے۔ یعنی یہ سارے معانی ہمارے سامنے ہوں گے اور جس مقام پر یہ لفظ آئے گا' اس موضوع کے اعتبار سے' سیاق وسباق کے اعتبار سے' دیکھا جائے گا کہ وہاں کون سا مفہوم لینا زیادہ موزوں ہے۔ یہ جو اشیائے کائنات میں خدا کی صفتِ ملکیت' ملوکیت یا مالک ہونا ہے' وہ اُن کو باہمی جوڑنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس کو تو آج کے سائنٹسٹ ہی بیان کر سکتے تھے۔ ان کی

تحقیق یہ ہے کہ یوں تو کائنات کی تمام چیزیں ہمیں ایک دوسرے سے الگ الگ نظر آتی ہیں' یوں جیسے ریت کے ذرے ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتے ہیں' لیکن وہ کہتے ہیں کہ ان کے اندر اس قسم کی وحدت ہے کہ ''لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں''۔ علم الاخلاقیات کا ہمارے اس دور میں جو سب سے بڑا ماہر اور امام مانا جاتا ہے اس کی ایک کتاب ہے۔ غالباً اسی کے اندر اس نے یہ لکھا ہے کہ کائنات کی وحدت کی تو یہ کیفیت ہے کہ میں اگر یہاں اپنی انگلی ہلاؤں تو کہکشاں کے ایک ایک کرّے کے اوپر بھی اس کی جنبش کا اثر جا کر پڑتا ہے۔ کائنات کے کسی ایک ذرے کی نقل و حرکت اس کی ذات تک محدود نہیں رہتی بلکہ وہ پوری کی پوری کائنات کو متاثر کرتی ہے اس لیے کہ ساری کائنات ایک ناقابلِ تقسیم وحدت (Indivisible Whole) ہے' اسی لیے اس کو Universe کہتے ہیں۔ اس کے اندر یہ وحدت ہوتی ہے اور یہ وحدت' خدا کی صفتِ مالکیت ہے' یہ اس کا مالک ہونا ہے۔ اس میں اتھارٹی کس مقصد کے لیے ہے؟ اس مقصد کے لیے کہ وہ سامانِ نشو و نما بہم پہنچائے اور پوری کائنات کی اس وحدت کو قائم رکھے۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے لیے یہ لفظ مالک خدا کے لیے آتا ہے۔

''یوم'' کا مفہوم

اس کے بعد اگلا لفظ ہے ''یوم''۔ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ (1:3)۔ اس لفظ کا ترجمہ عام طور پر دن کیا جاتا ہے یعنی وہ دن جو چوبیس گھنٹے پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ عربی زبان میں یہ لفظ ان معانی میں بھی آتا ہے لیکن اس کا مفہوم اس سے کہیں وسیع ہے۔ یہ وہ ہے جسے ہم کسی چیز کا دور (Period) یا زمانہ (Age) یا مرحلہ (Stage) وغیرہ کہتے ہیں۔ آپ دیکھیں کہ جب آپ Stone Age (پتھر کا زمانہ) کہتے ہیں تو اس سے کیا مراد ہوتی ہے۔ اس کا مطلب عمر نہیں ہوتا' تاریخ کا ایک دور ہوتا ہے۔ تاریخ کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے: مثلاً فلاں خاندان کا دورِ حکومت۔ اس کے معنی ہیں' وہ پورا زمانہ جس میں ان کی حکومت تھی۔ یا مثلاً یہ مسئلہ' یہ معاملہ' مختلف ادوار میں سے گزر کر یہاں پہنچا ہے۔ یہ جتنے مفہوم ہیں' یہ دور' زمانہ' پیریڈ' منازل' مراحل' ان سب کے لیے عربی زبان میں ''یوم'' کا لفظ آتا ہے۔ اسی لیے ایک طرف تو قرآن نے ہمارے دن اور رات کی گردش سے جو یوم ہوتا ہے اسے بھی ''یوم'' ہی کہا ہے اور دوسری طرف یہ بھی کہا ہے کہ خدا کا ایک ایک ''یوم'' تمہارے حساب و شمار کی رو سے ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے' دوسری جگہ کہا ہے کہ پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے۔ اس طرح یہ یوم چوبیس گھنٹے کا تو نہیں ہے۔ اس کے تو معنی ہی یہی ہیں کہ وہ پیریڈ' وہ مراحل' وہ منازل جن میں سے یہ اشیائے کائنات اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے' ان میں سے ایک ایک کو ''یوم'' کہا گیا ہے۔ قرآن میں اُن کے مراحل کو' اُن کے ادوار کو' اس کے زمانے کو' ان کی Age کو یوم کہہ کر پکارا گیا ہے۔ لہٰذا یہاں بھی جب یہ ''مالک یوم الدین'' کہا جائے گا تو اس کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ یہ الدین کا' کوئی چوبیس گھنٹے کا دن ہے' وہ اس کا مالک ہے' بلکہ اس کے معنی ہوں گے ''وہ دور' وہ مرحلہ' وہ منزل کہ

جس میں الدین کا نفاذ ہوگا' یوں کہہ لیجیے الدین کا دورِ حکومت ہوگا'' اور اگر دورِ حکومت خداوندی کہہ دیا جائے تو الدین کے معنی سمجھ میں آ گئے۔ جب الدین کے معنی ہمارے سامنے آئیں گے تو اس وقت یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہاں ''یوم'' کے معنی چوبیس گھنٹے کا دن نہیں' بلکہ ایک پیریڈ (زمانہ) ہے' جس میں الدین اپنی محفوظ شکل میں نافذ ہوگا یا آپ جو کچھ بھی دین کے معنی کریں گے اُس دین کا جو پیریڈ (زمانہ) ہے اُس کے لیے یوم کا لفظ ہے۔ یہ معنی یہاں تک ہو گئے کہ الدین کے دور میں اتھارٹی یعنی اقتدار' خدا کے لیے ہوگا اور وہ اس لیے ہوگا کہ وہ اشیائے کائنات کی نشوونما اور ارتقا کے سامان و ذرائع پر کنٹرول رکھے' اور کنٹرول اس لیے رکھے کہ وہ ان کی درستگی کا انتظام کرے' تکمیل کا انتظام کرے' باہمی نظم و ضبط رکھے' وحدت پیدا کرے' امتزاج پیدا کرے۔ اس کے لیے اس نے یہ کہا ہے۔

''الدین'' کا قرآنی مفہوم

اس کے بعد جو لفظ ہمارے سامنے آئے گا وہ ہے الدین۔ اور یہ الدین وہ لفظ ہے جو پورے کے پورے اسلام کی' قرآن کی' تعلیم کا نقطہ ماسکہ (Focal) ہے۔ دین ہی تو ساری چیز ہے جس کے لیے یہ کہا گیا ہے اور پھر الدین تو صرف خالص وہی دین ہے جو خدا کا دیا ہوا ہے اور جس کے تابع یہ نظامِ کائنات چل رہا ہے' جس کے تابع انسانی زندگی کا نظام چلنا چاہیے: اس زندگی کا بھی اور آنے والی زندگی کا بھی۔ پہلے آپ دیکھیے کہ الدین یا دین کے معنی کیا ہیں؟ اس کا مادہ بڑا وسیع المعنی ہے۔ بعض اوقات عربوں کے ہاں ایک مادے کے اندر متضاد معانی بھی ہوتے ہیں۔ آپ یوں نہ کہیے کہ یہ کیسے ہوا؟ ایک ہی مادے میں متضاد معانی ہوتے ہیں۔ وہ میں آگے چل کر بیان کروں گا۔ اُسی ایک مادے یا اس سے بنے ہوئے لفظ کی نسبت ایک طرف کی جائے تو ایک معنی ہوتے ہیں' وہی نسبت دوسری طرف کی جائے وہ تو اس سے دوسرے یا الٹ یا متضاد معانی ہوتے ہیں۔ الدین کا یہ لفظ ان میں سے بھی ہے۔

اب سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ الدین کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ ''اس کے معنی ہوتے ہیں غلبہ' اقتدار' حکومت' مملکت' آئین' قانون' نظم و نسق' فیصلہ' ٹھوس نتیجہ' جزا و سزا' مکافاتِ عمل وغیرہ''۔ ایک طرف تو یہ معانی ہیں اور دوسرے طرف اس کے معنی ہوتے ہیں: ''کتاب' فرماں پذیری' محکومیت''۔ یعنی جب اس کی نسبت خدا کی طرف کی جائے گی' تو اس کے وہ پہلے معنی ہوں گے جو میں نے ابھی عرض کیے: یعنی ''غلبہ اور اقتدار' خدا کا مملکت اور حکومت' خدا کا آئین اور قانون'' خدا کا ضابطہ اور جب اس کی نسبت انسانوں کی طرف کی جائے گی تو اس کے معنی ہوں گے: ''خدا کے قوانین و آئین و نظم و نسق کی فرماں پذیری' خدا کی اطاعت و محکومیت' دین خداوندی کی اطاعت' محکومیت یا فرماں پذیری''۔ اور جب اس کی نسبت خدا اور انسان دونوں کی طرف جامع طور پہ ہوگی تو اس کے معنی ہوں گے: قوانینِ خداوندی کی اطاعت' جس کا نتیجہ خدا کے متعین کردہ قوانین کے مطابق ظہور میں آتا ہے کیونکہ دین کے معنی جزا و سزا اور مکافاتِ عمل کے بھی ہیں۔ اس میں دونوں نسبتیں بھی آ جاتی ہیں' دونوں معانی بھی آ جاتے ہیں۔

میں نے اس مادے کے یہ جو معانی بیان کیے ہیں' ان کی تائید میں قرآنِ کریم کی متعدد آیات پیش کی جاسکتی ہیں۔ قرآن کے اس قدر کثیر مقامات میں یہ لفظ آیا ہے اور جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہ تو ساری تعلیم کا' پورے اسلام کا' قرآنِ کریم کی بنیاد ہے' اصل ہے' نکتہ ماسکہ ہے' تو اس لیے اس کا تو متعدد مقامات میں استعمال ہونا ضروری تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کی چنداں ضرورت نہیں کہ میں اتنی زیادہ تعداد میں اس کے لیے مثالیں پیش کروں۔ اگر بڑی تفصیل سے' مثالوں سے' قرآن کی آیات کی سند اور حوالوں سے' اس کا یہی مفہوم سمجھنا ہو تو پھر میری ''لغات القرآن'' کی طرف جانا چاہیے۔ اس میں یہ چیز بڑی ہی وضاحت سے آئی ہے۔ یہاں میں سمجھتا ہوں کہ دو تین آیات ایسی پیش کی جانی کافی ہوں گی' جن سے یہ مفہوم نمایاں طور پر سمجھ میں آجائے۔ سورۃ یوسف کا وہ مقام سامنے لایئے جس میں کہا گیا ہے کہ اُن کے بھائی نے شاہی کٹورہ بن یامین کی بوری میں رکھ دیا۔ فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَ فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ (12:76) تب شاہی کارندوں نے بوریوں کی تلاشی لینی شروع کی۔ پہلے اور بھائیوں کی بوریاں دیکھیں (تو ان میں کٹورہ نہ ملا) آخر میں یوسف کے بھائی کی بوری دیکھی تو اس میں سے کٹورہ نکل آیا (دیکھو! بات کیسے تھی اور رکی کہاں جا کر! اس سوتیلے بھائی نے بن یامین کی بوری میں کٹورہ کس نیت سے رکھا تھا' لیکن اس کا یہ فعل' یوسف ◆ کے لیے بن یامین کو اپنے پاس روک لینے کا موجب بن گیا)۔ اس طرح ہم نے یوسف ◆ کے لیے بن یامین کو روک لینے کی تدبیر پیدا کر دی' شاہِ مصر کے قانون کے مطابق' وہ اپنے بھائی کو اپنے پاس نہیں روک سکتا تھا۔ اس کے لیے مشیت ہی کوئی تدبیر کر سکتی تھی (جس سے یوسف ◆ کی دلی آرزو بھی پوری جائے اور اسے کوئی ایسی بات بھی نہ کرنی پڑے جس سے وہ اپنے مقام بلند سے گر جائے) یوں ہم اپنے قانونِ مشیت کے مطابق بلند مدارج عطا کر دیتے ہیں۔ یاد رکھو! خدا کا علم' ہر صاحب علم کی علمی سطح سے بلند ہوتا ہے۔

قرآنِ حکیم میں ''دین الملک'' اور ''دین'' کے الفاظ کا استعمال

عزیزانِ من! اس میں دیکھیے کہ ''دین الملک'' کے الفاظ آئے ہیں یعنی شاہِ مصر کے قانون کے مطابق۔ اب دوسرا مقام دیکھیے۔ سورۃ النور میں جہاں زانی اور زانیہ کی سزا کا ذکر ہے کہ انہیں سو سو کوڑے لگائے جائیں' وہاں کہا گیا ہے کہ وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ (24:2) دین اللہ کے معاملے میں تم نرمی مت برتو۔ اب یہاں واضح ہے کہ دین اللہ کے معنی خدا کا نظام عدل ہے' خدا کا نظامِ قانون ہے۔ یعنی خدا کے قانون کو نافذ کرنے میں تم نرمی سے کام نہ لو' نرمی نہ برتو۔ یہاں بھی دین کے معنی بالکل واضح ہو جاتے ہیں۔ سورۃ التوبہ کی ایک آیت میں ایک طرف تو اس نظامِ خداوندی کے لیے یہ لفظ دین آیا ہے' جو خارجی کائنات میں کارفرما ہے اور اسی کے ساتھ ہی ان پابندیوں کے لیے بھی آیا ہے' جو اس سلسلے میں انسانوں کے اوپر عائد کی گئی ہیں' جماعتِ مومنین پر عائد کی گئی ہیں۔ یہ دونوں

نظاموں یعنی خارجی کائنات کا نظام اور انسانوں کی زندگی کے اندر جو نظامِ تمدن' معاشرتی یا سیاسی نظام ہے' ان دونوں کے لیے' ایک ہی لفظ دین استعمال کیا گیا ہے۔ کہا یہ ہے کہ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ط ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (9:36) یعنی سال کے مہینے بارہ ہیں اور یہ وہ بارہ مہینے ہیں' یعنی پورے سال کو بارہ پہ تقسیم کرنا ہے' جو تخلیقِ ارض وسما کے وقت سے اللہ کے قانون کے مطابق تھے۔ یہاں قانون کے لیے کتاب کا لفظ آیا ہے اور میرا یہ خیال ہے کہ یہ پہلے بھی ایک درس میں آ چکا ہے' جہاں میں نے اس کے معنی یہ بیان کیے تھے۔ یہ تو ہو گیا وہ نظام' جو خارجی کائنات میں کار فرما ہے اور اس میں انسانوں پہ یہ پابندی لگائی کہ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ (9:36) ان میں چار مہینے ایسے ہیں جن میں جنگ کی ممانعت ہے۔ یہ انسانی زندگی کے متعلق ایک قانون آیا تو کہا ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (9:36) یہ دین قیم ہے' محکم الدین ہے۔ آپ دیکھیے کہ یہاں دین دونوں معانی کے اندر آ گیا ہے: نظامِ کائنات کے اندر خداوندی قوانین کی کارفرمائی اور انسانوں کی دنیا کے اندر خدا کے قوانین کی پابندی۔ سورۃ آل عمران میں دیکھیے کہ اسی حقیقت کو کس طرح دیگر الفاظ میں اس سے زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ آل عمران کی آیت 82 کہا ہے کہ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ (3:82) کیا یہ لوگ خدا کے دین کے سوا کوئی اور دین اختیار کرنا چاہتے ہیں' کیا انہیں کسی اور دین کی تلاش ہے؟ اب یہ دیکھیے کہ یہ جو دین خداوندی یا دین اللہ یہاں کہا گیا ہے' اس کے بعد اس کی تشریح کن الفاظ میں کی گئی کہ کیا یہ کسی اور دین کی تلاش کر رہے ہیں؟ اور پھر کہا جا رہا ہے کہ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (3:82) حالانکہ یہ دیکھتے نہیں کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو چیز ہے' وہ طوعاً و کرہاً اس کے قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہے۔ یہ ہے وہ دین جو پوری خارجی کائنات کو محیط ہے یعنی وہ نظامِ خداوندی جس کے مطابق یہ کارگاہِ کائنات سرگرمِ عمل ہے۔ اس سے دین کا مفہوم واضح ہو گیا۔ یعنی وہ نظام جو قوانین خداوندی کے مطابق قائم ہو اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا جائے۔ اس کے بعد یہ کہا کہ تم بھی اس کا اعلان کر دو کہ ہم خدا ہی کے قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں اور یہ وہ قوانین ہیں جو حضرات انبیائے کرام ☐ کی وساطت سے نوعِ انسان کو ملتے چلے آ رہے ہیں اور اب قرآنِ کریم میں دیئے گئے ہیں۔ کہا کہ اب اعلان کر دو کہ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (3:83) ہم قوانین خداوندی کے سامنے جھکے ہوئے ہیں۔ اسی کا نام اسلام ہے یعنی دین خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا' نظامِ خداوندی کے تابع زندگی بسر کرنا۔

قرآنِ حکیم کے ارشاد کے مطابق اسلام کے علاوہ کوئی دین قبول نہیں ہو گا

اسے پھر دہرا دوں کہ پہلے اشیائے کائنات کے متعلق بھی یہی لفظ استعمال کیا یعنی یہ کہ وہ اسلام پر ہیں: وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (3:82) کائنات کی ہر شے اسلام پر ہے یعنی قوانین خداوندی کے تابع زندگی بسر کرتی ہے' اس کے سامنے سرِ تسلیم

خم کیے ہوئے ہے‘اس کی اطاعت اختیار کیے ہوئے ہے‘اس کے خلاف کہیں نہیں جاتی ‘اورتم بھی اے جماعت مومنین ! کہہ دو کہ **وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ** (3:83) ہم بھی اسی کے سامنے سرِتسلیم خم کرتے ہیں۔یہ ہوا اسلام۔اوراس سے اگلی آیت میں ہے کہ **وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ** (3:84) جوشخص بھی الاسلام کے سوا‘ جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے‘ کوئی اور دین اختیار کرے گا‘ تو وہ خدا کے ہاں قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ایسے لوگ آخرالامر دیکھ لیں گے کہ وہ کس قدر خسارے میں رہے۔یہاں اسلام کامفہوم بھی واضح ہوگیا اور دین کا مفہوم بھی بالکل واضح ہوگیا۔دین نظامِ خداوندی‘ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرنا الاسلام ہے۔کائنات میں بھی یہی نظام کارفرما ہے اور کائنات کی ہر شے اسلام سے چل رہی ہے‘ قوانین خداوندی کی اطاعت کررہی ہے۔انسانوں کی زندگی میں بھی یہی ہونا چاہیے کہ وہ قوانین خداوندی‘ نظام خداوندی کی محکومیت اوراطاعت اختیار کریں۔

جماعت مومنین کے لیے اپنی آزاد مملکت کی ضرورت کیوں لازم ہے؟

ان آیات سے واضح ہے کہ دین نام ہے اس نظام کا جسے قوانین خداوندی کے مطابق متشکل کیا جائے‘ جس میں ہر فرد خدا اور صرف خدا کی محکومیت اختیار کرے‘ جس میں قانون صرف خدا کا نافذ ہو۔سوال یہ ہے کہ اس قانون کی اطاعت سے کیا ہوگا؟ جواباً کہا کہ انسان کے ہرعمل کا صحیح صحیح نتیجہ مرتب ہوتا چلا جائے گا۔اب یہ ظاہر ہے کہ ایسا نظام جس میں اطاعت اور محکومیت صرف قوانین خداوندی کی اختیار کی جائے‘ اسی صورت میں ممکن ہے کہ امت مسلمہ‘ جماعت مومنین‘ کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں وہ ان قوانین کو نافذ کرنے کا پورا پورا اختیار واقتدار رکھے‘ جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے نازل کیا ہے‘ اوراب قرآن کے اندر محفوظ کردیا ہے۔بہ الفاظ دیگر دین کے تمکن کے لیے مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت کا وجود ناگزیر ہے۔اس کے بغیر الدین یا الاسلام کے مطابق زندگی بسر کرنا ممکن ہی نہیں۔یہ مملکت قوت کے زور پر دوسروں سے چھینی نہیں جاتی‘ غصب نہیں کی جاتی‘ اس میں سلب ونہب نہیں ہوتا۔یہ مملکت نتیجہ ہوتی ہے جماعت مومنین کے ایمان اوراعمالِ صالحہ کا۔اس کا مقصد ہوتا ہے دین کا تمکن ۔دیکھیے سورۃ النور کی اس آیت میں اس حقیقت کو کیسے واضح اور بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔یہاں کہا گیا ہے کہ **وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ** (24:55) وہ لوگ جو قوانین خداوندی کی صداقت پر یقین رکھیں اوران کے مطابق ایسے کام کریں جو ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشو ونما اور نمود وظہور کا باعث ہوں‘ اُن سے خدا نے یہ وعدہ کررکھا ہے کہ وہ انہیں اس دنیا میں حکومت اورمملکت عطا کرے گا۔آپ غور فرمائیے کہ اس میں استخلاف فی الارض کا کتنا حتمی اوریقینی وعدہ کیا گیا ہے۔دو چیزیں یہاں سے واضح ہو جاتی ہیں: ایمان اوراعمال صالحہ کے متعلق اگر یہ پرکھنا ہو‘ کہ وہ واقعی ہمارا ایمان خدا کے معیار کے مطابق ہے اور ہمارے اعمال اعمالِ صالحہ ہیں تو اس کا دیکھنے کا ٹیسٹ یہ ہوگا کہ یہ دیکھا جائے کہ اس دنیا میں استخلاف فی الارض یعنی حکومت‘ مملکت حاصل ہوتی ہے یا نہیں۔یہ خدا کا وعدہ ہے اور خدا اپنے وعدے کی کبھی

خلاف ورزی نہیں کرتا۔ وعدے کے معنی قانون کے ہیں، وعدے کے معنی سنۃ اللہ کے ہیں کہ یہ اللہ کی سنت ہے، یہ اللہ کا قانون ہے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہے۔

تصوف میں تو مملکت کی ضرورت ہی نہیں ہوئی

عزیزانِ من! میں آگے چل کر بیان کروں گا کہ جب دین مذہب میں بدل گیا تو پھر ان آیات کے معنی بھی کچھ سے کچھ ہو گئے، خلافت فی الارض کے معنی بھی کچھ اور لے لیے گئے۔ کہا گیا کہ اس سے مراد روحانی خلافت ہے۔ آپ کو شاید یہ علم نہ ہو کہ یہ جو ہمارے ہاں کے مذہبی پیرانِ طریقت ہوتے ہیں، جن کے لوگ مرید ہوتے ہیں اور ان میں سے جو زیادہ مقرب ہوتے ہیں، انہیں ان کا خلیفہ کہا جاتا ہے، انہیں خلافت عطا ہوتی ہے، تو اب یہ وہ خلافت ہے جس کے لیے مملکت کی، حکومت کی، زمین کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ یہ روحانیت کی خلافت ہوتی ہے اور کہا یہ جاتا ہے کہ یہ اس دنیاوی خلافت سے بہت بلند و بالا چیز ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے تو یہاں لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (24:55) کہا تھا اور پھر ارض کہا تو اس کے معنی کر دیئے گئے ارض الجنۃ یعنی جنت کی زمین میں جا کر یہ استخلاف ملے گا، یہاں نہیں لیکن یہ تو، عزیزانِ من! قرآن کریم ہے۔ یہ تو انسان کو کہیں بھاگنے نہیں دیتا، وہ خود فریبی میں مبتلا ہونے نہیں دیتا، وہ مغالطہ آفرینی کے نشانات کو ختم کر دیتا ہے۔ یہاں یہ کہا کہ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِي الْاَرْضِ (24:55) اس کے ساتھ کہا كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (24:55) جیسا کہ ان سے پہلی اقوام کو اس دنیا میں حکومت عطا ہوئی تھی۔ اب یہ جو حکومت ہے، جو اقوامِ سابقہ کو عطا ہوئی تھی، وہ تو بہرحال اسی زمین پر ہوئی تھی۔ حکومت اس کو کہا جائے گا، مملکت اسے کہا جائے گا۔ اس کے سوا تو اس کے دوسرے معنی کیے ہی نہیں جاسکتے۔ یہ ہیں معنی استخلاف کے یعنی اسی زمین پر اپنی مملکت کا قائم ہونا۔

استخلاف فی الارض اپنے اندر ایک متمیز پروگرام لیے ہوتا ہے

اب اس استخلاف فی الارض کے لیے مقصد کیا ہے، کیوں یہ مملکت دی جاتی ہے؟ یہ ہے وہ مقصد، عزیزانِ من! جو اس مملکت کو، اس حکومت کو دنیا کی مملکتوں اور حکومتوں سے منفرد کر دیتی ہے، مختص کر دیتی ہے، متمیز کر دیتی ہے اور یہیں پہ ساری حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کیا ہے اور اس کے مطابق زندگی کیسے بسر کی جائے گی۔ کہا کہ یہ استخلاف فی الارض، یہ حکومت، یہ مملکت اس لیے عطا کی جاتی ہے کہ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا (24:55) مقصد اس سے یہ ہے کہ وہ دین، وہ نظامِ خداوندی جسے خدا نے ان کے لیے منتخب کیا ہے، اس کا تمکن ہو جائے، وہ عملاً قائم ہو جائے، نافذ ہو جائے، Establish (ثبت) ہو جائے۔ وہ مملکت جو ایمان اور اعمالِ صالحہ کے نتیجے میں خدا کی طرف سے ملتی ہے، اس کا مقصد ہوتا ہے: ''دین کا تمکن''۔ نظر آ گیا کہ دین نافذ اور قائم اور جاری و ساری ہی اپنی آزاد مملکت کے اندر ہو سکتا ہے۔

دین کے تمکن ہونے کا نتیجہ زندگی کے ایک عظیم مقصد کا حصول ہے

اب اس تمکن دین کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ کہا کہ وَ لَیُبَدِّلَنَّھُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِھِمۡ اَمۡنًا (24:55) اس سے پہلے اگر یہ خوف میں رہتے تھے تو اب یہ ہر قسم کے خوف اور حزن سے محفوظ ہو کر امن واطمینان کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ امن اور اطمینان کی زندگی تو زندگی کے Negative (منفیانہ) پہلو ہیں' خطرات سے محفوظ ہونا ہے۔ اس میں کوئی Achievement (فوز) نہیں ہوتی' کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ایک پرندہ قفس کے اندر بالکل محفوظ و مامون ہوتا ہے لیکن صرف امن نصیب ہو جانا تو زندگی کا مقصد نہیں ہے۔ امن کسی مقصد کے حصول کے لیے نصیب ہوتا ہے تاکہ انسان اطمینانِ خاطر سے اپنے اس مقصد کو حاصل کر سکے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ مقصد کیا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِکُوۡنَ بِیۡ شَیۡئًا (24:55) اب یہاں یعبدوننی کا ترجمہ آپ کو قرآنِ کریم کے تراجم میں جہاں بھی آپ دیکھیں گے ملے گا ''تاکہ وہ ہماری پرستش کر سکیں اور اس میں شرک نہ کریں''۔ تو اب یہاں پھر وہ بات واضح ہو گئی کہ پرستش کے لیے تو اپنی مملکت کی ضرورت ہی نہیں ہے' پرستش تو ہر قسم کی حکومت کے اندر کی جا سکتی ہے۔ ہم ہندوستان میں تقسیم سے پہلے بھی انگریزوں کی مملکت میں' اس کے بعد بھی جو حکومت قائم ہوئی' اس میں پوری کی پوری نمازیں پڑھنے کی' روزے رکھنے کی' جتنے بھی دین کے ارکان کہے جاتے ہیں ان پر عمل پیرا ہونے کی پوری پوری آزادی تھی اور اجازت تھی حالاں کہ وہ حکومت غیروں کی تھی۔ تو سورۃ الفاتحۃ میں آگے چل کر بیان کروں گا۔ اس میں اس کے لیے اگلا ہی لفظ ''نعبد'' آئے گا۔ اس نعبد کے معنی کیا ہیں؟ اس کا معنی ہوتا ہے: محکومیت اختیار کرنا۔ کہا کہ اس مملکت کے تمکن کا' Estbalish (قائم) ہونے کا' مقصد یہ ہے کہ تم ہر خوف اور خطر سے مامون اور محفوظ ہو کر صرف ہمارے قوانین کی محکومیت اختیار کرو اور اس میں کسی انسان کے حقِ حکومت کا کوئی دخل نہ ہو' اس کا کوئی اقتدار نہ ہو' اس کا کوئی اختیار نہ ہو۔ یہ وہ چیز ہے جسے توحید کہا جائے گا۔ یہ قوانین خداوندی کی اطاعت ہے۔ یہ الدین یا الاسلام ہے اور اس کے بعد کہا کہ وَ مَنۡ کَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ (24:55) دین کا مفہوم اس قدر واضح طور پر سامنے آ جانے کے بعد' جو اس سے انکار کرے گا' یا سرکشی برتے گا' تو سمجھ لیجیے کہ وہ صحیح راستہ چھوڑ کر غلط راستے پر گامزن ہو گیا۔

استخلاف فی الارض کے بعد حصولِ مقصد کی عملی شکل

جیسا کہ آگے چل کر' اس کے مناسب مقام پر' بتایا جائے گا کہ الدین کے دو اہم گوشے ہیں: اقامت الصلوٰۃ اور ایتاء الزکوٰۃ۔ چنانچہ مذکورہ بالا آیت کے بعد جو ابھی میں نے پیش کی ہے' آپ کے سامنے یہ کہا کہ وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ (24:56)۔ یعنی استخلاف فی الارض سے مقصد یہ ہے کہ الدین کا تمکن ہو جائے۔ اس سے تم اس قابل ہو جاؤ گے کہ اقامتِ الصلوٰۃ اور ایتائے الزکوٰۃ کا فریضہ ادا کر سکو۔ اور اپنے معاشرے کو ان خطوط پر متشکل کرو جن سے نوعِ انسانی کو زیادہ

سے زیادہ سامانِ نشو ونما ملتا جائے۔ یہ چیز انفرادی نہیں، اجتماعی ہے۔ یہ سب کچھ ایک نظم وضبط کے تابع ہوگا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تم اپنے اجتماعی نظام کے مرکز، رسول کی اطاعت کرو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم پر نوازشاتِ خداوندی کی بارش ہوگی۔ غور فرمایا آپ نے کہ کہا یہ گیا ہے کہ جسے آپ نماز پڑھنا یا زکوٰۃ دینا کہتے ہیں، اس کے لیے اقامت الصلوٰۃ اور ایتائے الزکوٰۃ کے الفاظ ہیں۔ کہا کہ یہ فریضہ ادا ہو سکتا ہے اپنی آزاد مملکت کے اندر، جہاں دین کا تمکن ہو، جہاں قوانینِ خداوندی کا تمکن نہ ہو، جہاں خدا کے قوانین، خدا کا نظام قائم نہ ہو، وہاں اقامت الصلوٰۃ اور ایتائے الزکوٰۃ ہو نہیں سکتی۔ دوسروں کی محکومیت میں، دوسروں کی نہیں بلکہ خود اپنی مملکت میں بھی، اگر قوانینِ خداوندی نافذ نہیں ہیں، الدین کا نظام قائم نہیں ہے، تو وہاں بھی نہ صلوٰۃ قائم ہوسکتی ہے نہ، ایتائے الزکوٰۃ ہوسکتی ہے۔

عزیزانِ گرامئ قدر! اس کا مفہوم ذرا آگے چل کر آئے گا لیکن قرآنِ کریم نے سورۃ الحج میں اسے اور واضح الفاظ میں بیان [1] کر دیا، جہاں مومنین کے متعلق یہ کہا ہے کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (22:41) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں زمین میں تمکن حاصل ہوگا، ان کی اپنی مملکت قائم ہو گی، تو یہ اقامت الصلوٰۃ اور ایتائے الزکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں گے، ان تمام احکامات کو نافذ کریں گے جنہیں یہ نظام قوانین خداوندی کی رو سے صحیح تسلیم کرے گا اور ان امور سے قانوناً روکیں گے جو ان احکام کی رو سے قابل تسلیم نہ ہوں گے، غرضیکہ اس میں تمام امور کے فیصلے آخرالامر قوانین خداوندی کے مطابق طے ہوں گے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (12:40) اور اس حکومت خداوندی کے متعلق پھر اگلی وضاحت یہ کردی کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے، تو خدا تو ہمارے سامنے نہیں آتا، وہ تو نظر نہیں آتا، وہ تو براہِ راست کوئی حکم نہیں دیتا، اس کی تو ہم بات ہی نہیں سن سکتے، تو پھر اس کی حکومت کیسے قائم ہوگی، اس چیز کا کیا ذریعہ ہے کہ ہم خدا کی اطاعت کر رہے ہیں، خدا کی محکومیت اختیار کر رہے ہیں؟ اس کے لیے اس نے کہا کہ ہم اپنی اطاعت اور محکومیت ایک ڈکٹیٹر کی طرح نہیں بلکہ قانون کے ذریعے کرانا چاہتے ہیں اور وہ قانون ہم نے اپنی کتاب کے اندر غیر متبدل، مکمل اور محفوظ شکل میں دے دیا ہے۔ لہٰذا الدین کے معنی ہوں گے: وہ نظامِ زندگی جس میں خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم کی جائے اور یہی قرآنِ کریم کی رو سے ایمان اور کفر میں خطِ امتیاز ہے۔ آپ غور کیجیے کہ سورۃ المائدۃ کی آیت 44 میں کیسے واضح الفاظ میں کہا گیا کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44) یاد رکھو! جو لوگ کتاب خداوندی کے مطابق حکومت قائم نہیں کریں گے انہی کو کافر کہا جائے گا۔ خود نبی اکرم ﷺ سے بھی ارشاد فرمایا کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (5:48) اے رسول! تم ان کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کرو۔ یہ ہے عزیزانِ من! الدین کا مفہوم یعنی وہ نظامِ زندگی جس

---

[1] اس کی مزید تشریح وتبیین کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ حج، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2005ء، ص ص۔ 163-132

میں حق حکومت خدا کو حاصل ہو، اسی کے احکام نافذ ہوں، اسی کے قوانین جاری و ساری ہوں، اور دوسری طرف انسان ان قوانین کی اطاعت اور محکومیت اختیار کریں تا کہ ان کے نتائج خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق مرتب اور برآمد ہوں۔ یہ وہ نقشہ ہے، وہ زندگی کا نظام ہے، جسے الدین کہا جاتا ہے، جسے دین خداوندی کہتے ہیں۔ اس الدین کو قائم کرنے والے اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے والے، یہ مسلم ہیں، یہ نظامِ حیات اسلام کہلاتا ہے اور یہ ہے وہ چیز جو اس آیت کے اندر آئی جو ہمارے سامنے ہے۔ یعنی مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ (1:3)

یوم الدین کی کیفیت

اب اس کے معنی پھر سوچ لیجیے، یا سن لیجیے، یا سمجھ لیجیے کہ اس یوم الدین کے اندر جو کہا ہے کہ اس میں اقتدار خدا ہی کا ہوگا۔ یہ وہ دور ہوگا جس میں نظامِ خداوندی قائم ہوگا، اس میں پورا اقتدار خدا کو حاصل ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ یہ یوم الدین کیا ہے، اس کی خصوصیت کیا ہے، اس میں کیا ہوگا؟ عزیزانِ من! قرآن کریم کے الفاظ میں سنیے اور جھوم جھوم جایئے۔ کہا کہ جس خطہ ارض میں الدین کا نظام قائم ہو جو دور، جو زمانہ، جو پیریڈ ایسا ہو، جسے آپ الدین کا نظام کہتے ہیں، سنیے! اس کے لیے قرآن کیا کہتا ہے؟ پہلے سوال کے انداز میں کہا گیا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ الدین کیا ہوتا ہے یا یوم الدین کسے [1] کہتے ہیں؟ پھر کہا کہ وَمَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ (82:17) تمہیں خدا کے سوا کون بتا سکتا ہے کہ یوم الدین کیا ہے، اس دور کی کیفیت کیا ہوگی۔ ثُمَّ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ (82:18) پھر بتاؤ، پھر کہو، خدا کے سوا تمہیں کون بتا سکتا ہے کہ یوم الدین کیا ہوتا ہے، اور اس میں کیا ہوگا؟

حکمرانی صرف اللہ تعالیٰ کے قانون کی ہوگی

سنیے، عزیزانِ من! کہ انسان کے بنائے ہوئے نظام میں کیا ہوتا ہے، حکومت کی شکل خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو، اور اس کا نام خواہ کچھ بھی کیوں نہ رکھ لیا جائے، وہ دورِ قدیم کی بادشاہت یا آمرّیت ہو یا عہد حاضر کی ڈیموکریسی (جمہوریت)، ان نظاموں میں حتیٰ کہ ڈیموکریسی کے نظام میں بھی قوانین سازی کے اختیارات انسانوں کے ہاتھ میں رہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جو قانون بنانے والا گروہ ہوگا اگر وہ ایک فرد ہے، بادشاہ کی حیثیت میں یا آمر کی حیثیت میں، یا وہ افراد کا گروہ ہے جسے خواہ ایک کی بھی اکثریت کیوں نہ حاصل ہو، تو یہ انسان جو قانون بھی بنائیں گے، دوسرے انسانوں کے اوپر ان کا اطلاق ہوگا اور اقتدار اور اختیار ان لوگوں کے ہاتھ میں رہے گا جو قانون بنائیں گے۔ اس لیے، اربابِ حکومت، خواہ ان کی کوئی بھی شکل کیوں نہ ہو، وہ دین کے نظام کی مخالفت کریں گے۔ انہیں یہ نظام گوارا ہی نہیں ہوگا، وہ اسے برداشت ہی نہیں کر سکیں گے۔ یہ مفاد پرستوں کا طبقہ، سرمایہ داروں کا طبقہ اس کی سخت مخالفت کرے گا۔

---

[1] اس کی مزید تشریح و تبیین کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ نمبر تیس، سورہ الانفطار، ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2006

قرآنی نظام کی سب سے زیادہ مخالفت آمروں، سرمایہ داروں اور مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ہوگی

عزیزانِ من! یہ مفاد پرستوں کا طبقہ، سرمایہ داروں کا طبقہ، دوسرا گروہ ہے جو دولت کے زور پر، محتاجوں اور محنت کشوں کو اپنے زیر اقتدار رکھتا ہے۔ ان کا یہ اقتدار جس قسم کا ہوتا ہے، اس کے متعلق کسی تفصیل میں جانے کی ضرورت ہی نہیں۔ جنگل کے جانوروں میں شیر کو سب سے زیادہ قوت کا مالک سمجھا جاتا ہے اور ہے بھی یہی کیفیت، لیکن اسی شیر کو بھوکا رکھ کر ایسا بنا دیا جاتا ہے کہ وہ سرکس کے رنگ ماسٹر کے اشارے پر بھیڑوں اور بکریوں سے بھی زیادہ بزدل نظر آتا ہے۔ بھوک انسان سے یہ کچھ کراتی ہے۔ تو آمروں کے بعد سرمایہ داروں کا یہ دوسرا گروہ ہوتا ہے جو دین کی مخالفت کرتا ہے اور تیسرا گروہ مذہبی پیشوائیت کا ہوتا ہے۔ اس کے اقتدارِ اختیار کی کیفیت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ یہ خدا کے نام پر اپنی من مانیاں کرتا ہے۔ بادشاہ، حاکم، قانون ساز، حکمران طبقہ لوگوں کے جسم پر اقتدار اور اختیار رکھتا ہے لیکن مذہبی پیشوائیت تو ان کے دل و دماغ پر تسلط جماتا ہے۔ وہ خدا کے نائب یا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے دوسرے انسانوں کو تگنی کے ناچ نچواتا ہے، ہر قسم کی اطاعت ان سے کراتا ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ یہ گروہ، سرمایہ داری سے بھی بدترین قسم کے نمائندہ کا ہوتا ہے۔ سرمایہ دار کو تو کچھ نہ کچھ سرمایہ Invest (لگا کر) کر کے دوسروں کی محنت کو غصب کرنا ہوتا ہے لیکن یہ ایسا گروہ ہے کہ ایک پائی بھی سرمائے کے طور پر Invest (لگانا) نہیں کرتا اور محنت کش، کام کرنے والا طبقہ اپنی محنت کی کمائی کا بہترین حصہ ان کی خدمت میں لا کر پیش کرتا ہے۔ انہیں وہ دیتا بھی ہے ان کے پاؤں بھی چومتا ہے اور ہر وقت ان سے ڈرتا اور کانپتا رہتا ہے، انہیں کسی فوج یا پولیس کے رکھنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ انہوں نے خدا کے نام سے ان کو اس قدر خائف کر رکھا ہوتا ہے کہ حرکت تو ایک طرف، اگر دل کی گہرائیوں میں بھی ان کے خلاف کبھی کوئی خیال گزرتا ہے، تو وہ کانپتا ہے، ڈرتا ہے، گھبراتا ہے۔ خواہ وہ اربابِ شریعت ہوں یا اربابِ طریقت ہوں، ان سب کی حکومت انسانوں کے دلوں کے اوپر ہوتی ہے۔ تو یہ طبقہ پہلے دونوں طبقوں سے بھی زیادہ خطرناک اور دین کا سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے۔

جھوٹ سچ کے لبادے میں

حضراتِ انبیائے کرام ☐ خدا کے دین کو لے کر آتے تھے اور اسی دین یعنی اس نظام کا قائم کرنا ان کا دینی فریضہ ہوتا تھا۔ وہ ان مفاد پرست گروہوں کی انتہائی مخالفت کے علی الرغم اس نظام کو قائم کر دیتے تھے لیکن ان کے تشریف لے جانے کے بعد یہ گروہ پھر سے سر نکالتے اور اسے درہم برہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے یہ تینوں گروہ آپس میں گٹھ جوڑ کر لیتے تھے اور مذہبی پیشوائیت ان میں آگے آگے ہوتی تھی۔ اس کی خاص وجہ تھی اور وہ وجہ یہ تھی کہ جھوٹ اپنی اصلی شکل میں سامنے آ کر کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا وہ سچ کا لباس اوڑھ کر آتا ہے تو دوسروں کو دھوکا دے سکتا ہے۔ یہ شخص آپ کے پاس آ کر گھنٹہ بھر تک آپ سے نہایت بلند قسم کی آپ کے مقصد

کی' آپ کے مطلب کی' باتیں کرتا ہے۔ اس انداز میں کرتا ہے کہ اس میں نظر ہی نہیں آتا کہ اس کا اپنا بھی کوئی مقصد ہوگا یا اس میں کوئی شائبہ بھی مکاریت یا فریب کا ہوگا۔ اس طریق سے آپ Convince ہو جاتے ہیں' آپ مطمئن ہو جاتے ہیں اور اس سے وعدہ کر لیتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہتا ہے' آپ اسی طرح سے کریں گے لیکن اگر وہ شخص اٹھتے وقت یہ کہے کہ بھائی صاحب! میں نے اس گھنٹہ بھر میں جو کچھ آپ سے کہا ہے اس میں ایک لفظ بھی سچا نہیں ہے وہ سب جھوٹ ہے تو کہیے اس کے بعد بھی آپ وہی کچھ کریں گے جو کچھ وہ آپ کو کہہ گیا تھا۔ اس شخص کی کامیابی کا راز اس میں تھا کہ وہ جھوٹ کو سچ کے لبادہ میں پیش کرے اور آخر تک یہی کہے کہ یہی سچ ہے۔ چنانچہ یہ مذہبی پیشوائیت جو کچھ کرتی تھی' ان کی ٹکنیک یہ تھی کہ وہ دین کی اصطلاحات کو اسی طرح سے باقی رکھتی تھی لیکن ان کے معنی اور مفہوم کو بدل دیتی تھی۔ دین کے نظام کے جوارکان' شعائر جس انداز میں وہ محسوس طور پر سامنے آتا ہے' اس کی وہ شکلیں وہ تمام کی تمام' اسی طرح سے برقرار رکھتے تھے لیکن ان کا مقصد بدل دیتے تھے' بلکہ ان کو مقصود بالذات بنا دیتے تھے یعنی رسمی طور پر اگر وہ کچھ کرتے چلے جایئے تو وہ کہتے تھے کہ یہ صحیح بات ہے' یہ خدا کی منشا کے مطابق ہے' یہ دین کا مقصد پورا کر دیتی ہے۔ تو یہ محض (Formalism) جسے (رسماً) یعنی بظاہر رسمی طور پر ان چیزوں کو ادا کیے جانا ہے۔ وہ قوم کو اس میں الجھا کے' اس فریب میں مبتلا رکھتی تھی کہ دین کا منشا پورا ہو رہا ہے' خدا اور اس کا رسول تم سے بے حد راضی ہیں یا کہا جاتا ہے کہ دنیا میں تو اس کا کوئی نتیجہ سامنے آتا نہیں تو وہ کہتے کہ صاحب! یہ دنیا دارالعمل ہے' دارالجزا تو اس کے بعد کی دنیا ہے' اس کا نتیجہ آخرت میں جا کے آپ کو ملے گا' یہ کچھ کر کے آپ کو ثواب حاصل ہوتا ہے اور ثواب کے نتیجے میں جو جنت ملتی ہے' وہ آخرت میں جا کر ملتی ہے۔ اس طرح سے یہ مذہبی پیشوائیت کا طبقہ' عوام کو جھوٹی تسلیوں میں' افیون دے دے کر' تھپکیاں دے دے کر' سلائے رکھتا تھا اور ملوکیت یعنی اربابِ حکومت اور سرمایہ دار طبقہ اپنی من مانی کیے چلا جاتا تھا۔ مذہبی پیشوائیت کا طبقہ جو یہ انداز اختیار کرتا تھا' وہ دین کو اس شکل میں بدل دیتا تھا' جس کا نام مذہب ہے۔

قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں مذہب کا لفظ ہی استعمال نہیں کیا

مذہب کا لفظ قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ یہ غیر قرآنی لفظ ہے اور پھر اسی لفظ مذہب کا ترجمہ انگریزی میں Religion ہوا۔ اب آپ دیکھیں گے اسلام کو بھی مذہب کہا جاتا ہے۔ اب اسے زیادہ سے زیادہ مذہب اسلام کہا جاتا ہے کہ یہ مذاہب عالم میں سب سے بلند مذہب اور افضل ہے۔ ہمارے مناظرے' ہمارے مباحثے' سارے اس بات کے لیے ہوتے تھے کہ اسلام کو باقی مذاہب کے مقابلے میں سب سے افضل ثابت کر دیا جائے یعنی ان چیزوں کے مقابلے میں افضل کہ جن میں یہ تو ہے ہی نہیں۔ اسلام کا مقابلہ کرنا ہو تو زندگی کے جو نظام ہیں' ان سے مقابلہ کیا جائے گا۔ قرآن نے اس کے متعلق کہا تھا لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (9:33) دنیا کے جو یہ تمام نظام ہیں' ان کے اوپر غالب آئے گا۔ اس نے یہ کہیں نہیں کہا تھا کہ یہ مذاہب کے مقابلے میں غالب آ جائے گا۔ یہ مذہب تو ہے ہی نہیں' یہ تو

دین تھا لیکن مذہب پرست طبقے یا مذہبی پیشوائیت کی پوری کوشش یہ ہے کہ دین کو مذہب کی شکل میں باقی رکھا جائے، قائم رکھا جائے اور وہ اس کو دیتے چلے جائیں اور زیادہ شدت کے ساتھ رکھا جائے کہ جتنا زیادہ یہ شدت اختیار کرتا چلا جائے گا اتنا ہی دین دور ہوتا چلا جائے گا۔

حضرت شعیب ◆ کی اپنی قوم کے ساتھ مخالفت کی وجہ نظام صلوٰۃ کی تشکیل تھی

دین کو مذہب میں بدلنے کی دو ایک نمایاں سی مثالیں پیش کرتا ہوں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ حضراتِ انبیائے کرام □ تو خدا کا دین لاتے تھے اور اس کو قائم رکھتے تھے۔ قرآنِ کریم نے داستانِ حضرت شعیب ◆ [1] میں کہا ہے کہ وہ قوم سرمایہ پرستی میں ڈوبی ہوئی تھی اور مذہب پرست طبقہ انہیں مطمئن رکھتا تھا کہ یہی خدا کا منشا ہے اور اسی کے مطابق یہ سارا نظام قائم ہے۔ حضرت شعیب ◆ اس قوم میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے سرمایہ

```
ERROR: syntaxerror
OFFENDING COMMAND: %ztokenexec_continue

STACK:

-filestream-
-mark-
/sfnts
```

پانچواں باب: سورۃ الفاتحۃ (آیت 4:ایاک نعبد)



نگاہِ بازگشت

عزیزانِ من! اب ہم سورۃ الفاتحۃ کی چوتھی آیت اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) پر آ گئے ہیں۔ پہلے درسوں میں آپ نے یہ دیکھا کہ اس عظیم سورۃ کے پہلے ہی کچھ الفاظ ہیں، جو عمدگی سے دین کے پورے نظام کو مربوط شکل میں سامنے لاتے چلے گئے ہیں۔ یعنی حمدیت اپنی مکمل شکل میں تماماً اور اکملاً صرف اللہ کے لیے ہے اور اللہ وہ ہے جو مکمل ترین اقتدار کا مالک ہے اور اس کی حمدیت اس لیے ہے کہ وہ رب العالمین ہے، یعنی پوری کی پوری کائنات، بلکہ کائناتوں کا ہی نہیں، انسانوں کا، تمام اقوامِ عالم کا، پوری نوعِ انسانی کا، ہر ذی حیات کا، وہ رب ہے۔ ان کو اس طرح نشوونما دیئے چلا جاتا ہے کہ وہ اپنے نقطۂ آغاز سے بتدریج، ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی، نقطۂ تکمیل تک جا پہنچتی ہیں اور اس کی اس نشوونما دینے کا ایک پروگرام رحیمیّت ہے۔ یہ تو عام پروگرام ہے جو مسلسل، متواتر، التزاماً، تدریجاً ہوتا چلا جاتا ہے لیکن کبھی کبھی عندالضرورت اس کی صفت رحمانیت کا بھی ظہور ہوتا ہے، جو اس کے اس پروگرام کا دوسرا حصہ ہے، جس کے معنی ہیں: ''ہنگامی طور پر کسی کے لیے سامانِ نشوونما مہیا کرنا''۔ لیکن سامانِ نشوونما تو وہی مہیا کرسکتا ہے، اس سامان پر جس کا پورا پورا کنٹرول ہو۔ اگر یہ سامان و وسائل و ذرائع کسی اور کے قبضے میں ہوں تو پھر تو یہ ہستی کسی کی نشوونما نہیں کرسکتی۔ اس لیے اس کی اگلی بنیادی خصوصیت یہ بتائی گئی کہ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ (1:3) وہ نظام کہ جس کے اندر یہ نشوونما اس انداز سے سرانجام پاتی چلی جائے گی، اس میں کنٹرول اور اقتدار صرف خدا کا ہوگا تو گویا اتنے حصے تک سورۃ الفاتحۃ میں کہا یہ گیا ہے کہ یہ ہے وہ خدا، یہ ہے وہ اللہ، یہ ہے اس کا نظام، یہ ہے اس کا ایک پروگرام جو ساری کائنات میں پھیلا ہوا ہے۔

اب اس کے بعد فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر تم اس کو سمجھ گئے ہو اور اب اس پہ تمہارا یقین اور ایمان ہے کہ درحقیقت یہی نظام ہے، جو نوعِ انسانی کے لیے اس کی منزل تک پہنچانے کا ذمے دار ہوسکتا ہے اور ہر فرد کے لیے بھی کہ وہ اپنے دل میں یہ کہے کہ یہی

ہے وہ نظام جس میں میری انسانی صلاحیتوں کی نشو ونما ہوگی اور اس درجے تک ہوتی چلی جائے گی کہ میں اس زندگی کے بعد بھی اگلی زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاؤں گا۔ جب انسان دل و دماغ کی پوری رضامندی سے اس کی صداقت کا قائل ہو جاتا ہے تو یوں کہیے کہ اس کے بعد پھر پوچھا یہ جاتا ہے کہ اب تم بتاؤ اور نہایت اطمینان سے بتاؤ' دل و دماغ کی رضامندی سے بتاؤ' جذباتی طور پر نہیں' علیٰ وجہ البصیرت بتاؤ کہ پھر تم کس کی محکومیت اختیار کرو گے۔ جس نے ان حقائق پر اس طرح سے غور کیا ہے' اس طرح اسے دل و دماغ کی رضامندی سے قبول کیا ہے' اس کی صداقت کا قائل ہو گیا ہے' تو اس کی زبان سے اس کے جواب میں اس کے سوا کوئی دوسرا لفظ آ ہی نہیں سکتا کہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ (1:4)

سورۃ الحمد کے الفاظ ''اِیَّاکَ نَعۡبُدُ'' کی تفسیر

ایاک کے معنی ہیں: تیری اور صرف تیری۔ اس آیت (1:4) میں کہا کہ ہم تیری اور صرف تیری محکومیت اختیار کریں گے۔ کوئی اور اس کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اب آپ دیکھ لیجیے' عزیزانِ من! کہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ (1:4) کس مقام پر آیا ہے؟ اس کا مفہوم کیا ہے؟ اور ایک عبد مومن کیا اقرار کرتا ہے؟ ایک عبد مومن' ایک عبد مسلم' جس نے ان حقائق کو سمجھ لیا ہے' وہ پھر اپنے لیے کس قسم کی زندگی بسر کرنے کا آغاز کرتا ہے' اقرار کرتا ہے' عہد کرتا ہے' پروگرام بناتا ہے؟ وہ زندگی ہے ایاک نعبد کی کہ ''تیری اور صرف تیری محکومیت اختیار کرتے ہیں''۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہ کتنا عظیم پروگرام ہے لیکن یہ تو دین کا پروگرام تھا۔ جب دین مذہب میں تبدیل ہوا ہے تو جیسا میں نے پچھلے ہی درس میں کہا تھا کہ یہ ''نعبد'' تھا۔ اس کا ترجمہ ہوا: پرستش کرنا۔ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ (1:4) ہم تیری ہی پرستش کرتے ہیں تو گویا خدا ایک پرستش کی شے ہو گیا اور ہم صرف اس کی پرستش کرنے والے۔ پرستش کرنے سے آپ غور فرمائیے کہ کیا تاثرات آپ کے ذہن میں Imprint (مرتسم) ہوتے ہیں۔ آگے چل کر یہ مسئلہ بتاؤں گا کہ صرف یہی جو اتنی بات ہے کہ خدا نے انسانوں کو اس لیے پیدا کیا کہ یہ اُس کی پرستش کریں خدا کے متعلق کیا تصور پیدا کرتا ہے لیکن یہاں جو کہا گیا ہے کہ ''ہم صرف تیری محکومیت اختیار کرتے ہیں'' تو یہ محکومیت اختیار کرنے کے بھی معنی یہ ہوں گے کہ ہم صرف اسی نظام کے تابع زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں جس نظام کا ذکر ان پہلی تین آیتوں میں ہوا ہے۔ ہم کچھ اور چاہتے ہی نہیں۔ یہی الاسلام ہے اور اسی کے مطابق' ہم اپنا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں اور اسی کے تابع ہم رہنا چاہتے ہیں' اسی کی اطاعت کرنا چاہتے ہیں' اسی کی محکومیت اختیار کرنا چاہتے ہیں اور یہی ہے نعبد کا ترجمہ' خود عربی زبان کے اعتبار سے اور قرآن کریم کے اعتبار سے بھی۔

قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں پرستش کی بجائے عبادت کا تصور پیش کیا ہے

لفظ عبادت کا مادہ ''ع ب د'' ہے۔ Worship (پرستش) کا تو تصور ہی قرآن میں نہیں ہے۔ اب یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ یہ وہی

مادہ ہے جس سے لفظ ''عبدٌ'' آتا ہے اور یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ ''عبدٌ'' کے معنی غلام اور محکوم کے ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں یہ لفظ ٹھیک غلامی، محکومی اور اطاعت گزاری کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ دو ایک مقامات بطور سند میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، جس سے نظر آجائے گا کہ یہ ''ع ب د'' کا جو مادہ ہے اور اس سے جو لفظ ''عبادت'' بنا ہے یا ''نعبدُ'' بنا ہے یا ''یعبدُ'' آیا ہے، یہ تمام الفاظ اس مادہ سے بنے ہیں۔ اس کے معنی محکومیت اختیار کرنے کے ہیں، اطاعت اختیار کرنے کے ہیں۔ اس کے معنی Worship (پرستش) کے معنی نہیں ہیں۔ مثلاً سورۃ الشوریٰ میں ہے کہ حضرت موسیٰ ◆ فرعون کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ وہ بنی اسرائیل کو ان کے ساتھ جانے کی اجازت دے دے، تو اس نے ان سے کہا کہ موسیٰ! ہم نے تم پر اس قدر احسانات کیے اور تم ہمیں ان احسانات کا بدلہ یوں دے رہے ہو کہ پوری قوم کو ہمارے خلاف مشتعل کر رہے ہو اور اس درجہ مشتعل کہ تم ان کو یہاں رہنے بھی نہیں دینا چاہتے، چاہتے یہ ہو کہ تم ان کو یہاں سے لے کر چلے جاؤ۔ تم یہ بدلہ دے رہے ہو میرے احسانات کا جو میں نے تم پر کیے تھے۔ اس کے جواب میں حضرت موسیٰ ◆ نے کہا کہ ہاں، تمہارے احسانات یہی ہیں کہ اَنۡ عَبَّدۡتَّ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ❶ (26:22)۔ یہ دیکھیے کہ یہ لفظ ''عبدت''، وہی ''ع ب د'' سے ہے۔ کہا کہ تمہارے احسانات یہی ہیں کہ تم نے میری قوم کو اپنی غلامی اور محکومی کے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔ یہاں سے ''عبدت'' کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔

دوسری جگہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ ◆ اور حضرت ہارون ◆ نے فرعون اور اس کے اکابرین کو خدا پر ایمان لانے کی دعوت دی تو انہوں نے جواب میں کہا کہ اَنُؤۡمِنُ لِبَشَرَیۡنِ مِثۡلِنَا (23:47) کیا ہم ان کی بات مان لیں جو ہمارے ہی جیسے دو آدمی ہیں۔ یعنی بشر ہونے کے اعتبار سے تو وہ ہمارے ہی جیسے ہیں، فوق البشر نہیں ہیں اور اسی آیت میں اگلی بات یہ کہی کہ وَ قَوۡمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ ❷ (23:47) اس آیت میں ''عابدون'' کا لفظ آیا ہے، یعنی وہی عبادت کرنے والے جس کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ کہا کہ ''اور اس کی قوم ہماری محکوم قوم ہے''، یعنی یہ فوق البشر نہیں ہے اور یہ بھی نہیں ہے کہ بشر ہونے کی حیثیت سے یہ حاکم قوم کے افراد ہوں۔ اب سوچیے کہ محکوم قوم کے جو افراد ہیں، کیا ہم ان پر ایمان لے آئیں، ان کی بات تسلیم کر لیں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ان مقامات اور انہی جیسے دیگر مقامات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ عبدیت کے معنی ''خدا کی محکومیت اختیار کرنا ہے''۔ اس کے قوانین کی اطاعت اختیار کرنا ہے، اس کے معنی پرستش کرنا نہیں ہے۔ سورۃ الکھف میں محکومیت اور عبادت کے الفاظ مرادف معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ ذرا غور کیجیے۔ ایک جگہ کہا کہ وَلَا یُشۡرِکُ فِیۡ حُکۡمِهٖۤ اَحَدًا (18:26) خدا اپنے حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ یہاں فِیۡ حُکۡمِهٖ (18:26) آیا ہے۔ اب

---

❶ تم پوری کی پوری قوم بنی اسرائیل کو اپنی محکومی کے شکنجے میں جکڑے رکھو!

❷ اور جہاں تک رتبہ اور مرتبہ کا تعلق ہے وہ اس قوم کے افراد ہیں جو ہماری محکوم ہے۔

لفظ ''حکم'' تو آپ کے سامنے ہے۔ حقِ حکومت یہی چیز ہے۔ خدا اپنی حاکمیت میں، اپنے حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا اور دوسری جگہ ہے کہ جو لوگ اپنے مستقبل کو خوشگوار اور حسین بنانا چاہتے ہیں، ان کے لیے ضروری ہے کہ وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا (18:110) تم خدا کی عبادت میں کسی کومت شریک کرو۔ ایسا شخص جو اپنے مستقبل کو خوشگوار بنانا چاہتا ہے، اسے چاہیے کہ اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔ اب یہ دیکھیے کہ پہلے یہ کہا تھا کہ خدا لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا [1] (18:26). اور دوسری جگہ ان الفاظ میں کہا کہ وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا [2] (18:110) جو وہاں حُكْمِهٖ (18:26) آیا ہے، دوسری جگہ اس کے لیے لفظ عِبَادَةِ (18:110) آیا ہے، تو عبادت کے معنی ہی حکم ہیں، احکام ہیں، حکومت ہے۔

تصرفِ آیات کے تحت لفظ عبادت کا مفہوم

سورۂ یوسف میں حضرت یوسف ◆ نے اپنے قید خانے کے ساتھیوں سے کہا کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (12:40) یاد رکھو! حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ آپ غور کیجیے کہ ایک نبی کا فریضہ کیا ہے؟ فرعون جیسے بادشاہ کی مملکت میں قید میں پڑے ہوئے ہیں، دو اور قیدی وہاں ساتھ ہی قید ہیں، ان سے کہا جا رہا ہے، یہ تلقین کی جا رہی ہے، تعلیم دی جا رہی ہے، یہ سبق دیا جا رہا ہے کہ یاد رکھو! حقِ حکومت اس بادشاہ کو حاصل نہیں ہے، حقِ حکومت تو صرف خدا کو حاصل ہے۔ نبی تو خدا کے سوا کسی اور کے اقتدار کو بغاوت تصور کرتا ہے یعنی انسان پر انسان کی ہر قسم کی حکومت سے بغاوت کرنے والا اور صرف ایک خدا کی محکومیت کو تسلیم کرنے والا۔ بہر حال میں کہہ یہ رہا تھا کہ انہوں نے ان سے کہا کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (12:40) اب حقِ حکومت خدا کے سوا کسی کو نہیں ہے اور اس کے آگے ہے کہ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (12:40) اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبودیت اختیار نہ کرو۔ اب یہ دیکھیے کہ وہاں کہا ہے کہ ''الحکم'' اللہ کے لیے ہے اور یہاں کہا ہے کہ اس کا ''حکم'' یہ ہے کہ میرے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کرو اور لفظ ''عبادت'' ہی آیا ہے اور اس کے بعد کہا کہ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (12:40) یہ ہے دین محکم۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ قرآنِ کریم کی رُو سے خدا کی ''عبادت'' سے مراد ہے: ''اُس کی محکومیت اختیار کرنا، اس کے قوانین کی اطاعت اختیار کرنا'' اور اسی کا نام الدین ہے۔ اس کی وضاحت سابقہ درس میں ہو چکی تھی۔ دین کے معنی بھی سامنے آ گئے تھے اور یہ بھی کہ اطاعت صرف اس نظام اور اس دین کی ہے جس میں خدا کے قوانین جاری و ساری ہیں۔

---

[1] خدا اپنے حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

[2] اپنے رب کی محکومیت میں کسی کو شریک نہ کر۔

قرآنی قوانین کی اطاعت دوسرے معنوں میں اللہ تعالیٰ کی محکومیت کا نام ہے

اب جیسا کہ میں نے وہاں یہ کہا تھا' میں اسے پھر دہرادوں کہ جب خدا نے یہ کہا تھا کہ ہماری یہ محکومیت یا خدا کی حاکمیت' ایک ڈکٹیٹر کی حاکمیت نہیں ہے بلکہ ہم نے اس کے لیے ایک ضابطہ قوانین بھیجا ہے۔ اس ضابطۂ قوانین کی اطاعت کا نام ہماری محکومیت اختیار کرنا ہے تو گویا خدا کی یہ گورنمنٹ آج کی اصطلاح میں یوں کہیے کہ وہ گورنمنٹ' آئینی گورنمنٹ ہے' وہ Rule of the Law ہے' وہ قانون کی حکومت ہے اور پھر قانون بھی ایسا عمدہ! عزیزانِ من! غور کیجیے۔ انسانوں کی دنیا میں تو ابھی' اگر اتنا ہی کہہ دیا جائے کہ وہاں قانون کی حکومت ہے' تو اسی سے ہی لوگ اس نظام کو دنیا کے لیے باعثِ رحمت قرار دیتے ہیں۔ سب سے بہترین نظام اسی کو قرار دیتے ہیں جس میں قانون کی حکومت ہو لیکن دنیا میں انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی کیفیت تو یہ ہے کہ آج ایک قانون بنتا ہے' کل ہی اس کی جگہ دوسرا قانون بن جاتا ہے۔ ڈکٹیٹر کو چھوڑ دیجیے' ملوکیت کو چھوڑ دیجیے کہ وہاں تو ہر آن اس کی مرضی کے مطابق کام ہوتا ہے' بلکہ یوں کہیے کہ وہاں قانون تو ہوتا ہی نہیں' احکام بدلتے رہتے ہیں۔ جسے آپ ڈیموکریسی (جمہوریت) کہتے ہیں' جس میں آپ حقِ حکومت خود انسانوں کو دیتے ہیں' ان کی بھی یہ کیفیت ہے کہ اول تو وہی پارلیمنٹ کے ممبرز' جو آج اکثریت میں ہیں' وہی اپنے بنائے ہوئے قانون میں کل ہی تبدیلی کر دیتے ہیں اور اس سے آگے بڑھیے تو آج جو اکثریت ہے' وہ اگر دو ممبروں کے پیچھے ہٹ جانے سے اقلیت (Minority) کے اندر آ جاتے ہیں تو ان کے جو مخالف پارٹی آتی ہے' وہ Majority (اکثریت) میں آ کر نئے قوانین بناتی ہے جو پہلے سے بنائے ہوئے قوانین کے بالکل خلاف جاتے ہیں۔ یہاں تو قانون ہی راہیں بدلتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس خدا کے قوانین کی کیفیت یہ ہے کہ وہ انسانوں کا بنایا ہوا قانون نہیں ہوگا بلکہ جو انسان سے بلند و بالاتر ہستی ہے اس کا بنایا ہوا قانون ہے اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ لَا تَبۡدِیۡلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ (10:24) اس میں کبھی تبدیلی واقع نہیں ہوگی۔

انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ضابطہ حیات غیر متبدل ہوتا ہے

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں قوانین دے دیئے۔ یہ کہہ دیا کہ یہ مکمل ہو گئے: تَمَّتۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدۡقًا وَّ عَدۡلًا [1] (6:116)۔ یہ مکمل ضابطہ حیات ہے' اس میں کسی اضافے کی ضرورت نہیں۔ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ (6:115) کوئی ان میں تبدیلی نہیں کر سکتا' تو یہ ضابطۂ حیات مکمل اور غیر متبدل ہے اور پھر یہ کہ یہ محفوظ ہے۔ اس کے بعد کہا کہ اب تم اس ضابطہ قوانین کو دیکھ لو' سمجھ لو' پرکھ لو۔ اگر تمہارا دل اس پر پختہ ہے کہ یہ واقعی اس قابل ہے تو اس کے تحت زندگی بسر کرو۔ اگر انسان کو شرف اور خوشگواریوں کی زندگی بسر کرنا ہے تو

---

[1] اس قرآن میں' خدا کا ضابطہ قوانین' تمام صداقتوں کو اپنے اندر لیے' اور عدل و توازن کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے' مکمل ہو چکا ہے۔ (مفہوم القرآن از پرویزؒ)

اسے تسلیم کرو، اس کے مطابق نظام قائم کرلو۔ کتنا امن اور اطمینان نصیب ہو جاتا ہے اس قوم کو جو اس طرح کسی ضابطہ قوانین کو صحیح تسلیم کرے اور اس کے بعد اسے یہ یقین ہو کہ یہ کبھی تبدیل ہی نہیں ہوگا۔ یہی نہیں کہ آج کی حکومت اسے تبدیل نہیں کرے گی، کوئی آنے والی حکومت بھی اسے تبدیلی نہیں کرسکتی، کوئی انسان اسے تبدیل نہیں کرسکتا۔

اللہ تعالیٰ بھی اپنے بنائے ہوئے قوانین میں تبدیلی نہیں کرے گا

اب یہاں ایک بڑا عظیم نکتہ ہے، عزیزانِ من! یہ کچھ ماننے کے بعد شاید کوئی یہ کہہ دیتا کہ ٹھیک ہے، کوئی انسان تو اس میں تبدیلی پیدا نہیں کرے گا یا کرسکتا، اگر کل کو خدا کی طرف سے اور نبی آ گیا تو وہ تو اس میں تبدیلی پیدا کردے گا۔ یعنی اس کے ذریعے سے تو خدا ایسے قوانین دے دے گا، جو ان قوانین کے برعکس ہوں یا ان میں ترمیم و تنسیخ کرسکیں، ایسا تو ہو سکے گا تو پھر یہ نا قابلِ تغیر کس طرح ہو گئے؟ پھر ہم اس کا اطمینان کس طرح کرلیں کہ جن قوانین کے تابع زندگی بسر کرنے کا ہم نے آج عہد کیا ہے، یہ قوانین غیر متبدل ہیں؟ عزیزانِ گرامی قدر! اس کے لیے اللہ نے یقین دلا دیا کہ مطمئن رہو، ہم نے ختم نبوت کا اعلان کردیا ہے، ہماری طرف سے اس کے بعد کوئی نبی بھی نہیں آئے گا جو آ کر یہ کہے کہ خدا نے ان قوانین میں یوں تبدیلی کردی ہے۔ آپ غور کیجیے گا کہ کس قسم کا نظام ہے، جو خدا آگے دیتا ہے کہ اور تو اور کوئی شخص اب آ کے یہ بھی نہیں کہے گا کہ خدا نے ان میں یہ تبدیلی کردی ہے اور میں وہ تبدیلیاں لے کر آیا ہوں۔ نبوت کا بھی خاتمہ کردیا۔ قیامت تک کے لیے ایک عالم گیر نظام دے دیا۔

آدمی کے لیے یہ ایک سجدہ ہزار سجدوں سے نجات کا باعث بنتا ہے

اس کے معنی ہو گئے خدا کی عبادت، خدا کی عبدیت، خدا کی عبودیت، اس کی محکومیت، اس کی اطاعت۔ یہ ہے جب ایک عبد مومن خدا کے سامنے کہتا ہے کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ (1:4) تو آپ سوچیے، اسے ایک طرف کس قدر اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے اور دوسری طرف اتنا عظیم انقلاب ہے جس کا وہ اعلان کرتا ہے کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ (1:4). کسی اور کی محکومیت اختیار نہیں کریں گے، صرف تیری کریں گے، اس عبدیت میں ایک اور نکتہ بھی مضمر ہے۔ عربی زبان میں تَعْبِيْدٌ [1] کے معنی ہوتے ہیں ''اونٹ یا گھوڑے کو سدھا کر جوتنے کے قابل بنا دینا [1]''، یعنی اس وحشی جانور کو اس طرح سدھانا کہ وہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو خاص قاعدے اور ضابطے کے مطابق صرف کرے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت سی صلاحیتیں اور قوتیں عطا کیں ہیں۔ اگر انسان ان قوتوں کو نوعِ انسانی کے مفاد کی بجائے اپنے جذبات کو سرکش

---

[1] اسے انگریزی میں Breaking یا Harnessing کہتے ہیں۔ لین Lane نے Broken, or Trained کہا ہے۔

(Ref. Lane, Edward William (1968). An Arabic- English Lexicon Part 15. Lebanon: Librairie Du Liban, p. 1936)

اور بے باک رکھتا ہے یعنی اپنے جذبات کو ذاتی طور پر اپنے جذبات کے مطابق یا اجتماعی طور پر اپنی قوم کے مفاد کی خاطر اپنی مرضی کے مطابق صرف کرتا ہے تو نتیجہ فساد اور تخریب کے سوا کچھ نہیں ہوتا لیکن اگر انہی صلاحیتوں کو حدود اللہ کے اندر رکھتے ہوئے اس کے مقرر کردہ قوانین وضوابط کے مطابق صرف میں لاتا ہے تو اس کا نتیجہ عالم گیر ربوبیت اور اس کی اپنی ذات کی تعمیر ہوتا ہے۔

ساحلوں کے اندر بہنے والے پانی اور سیلاب کے پانی میں ایک بنیادی فرق ہوتا ہے

اس نہج سے دیکھیے تو عبادت کے معنی ہوں گے: اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرنا۔ اس میں سیلاب کی مثال بات کو اور واضح کر دیتی ہے۔ دریا میں بے انتہا پانی ہوتا ہے وہی دریا اگر ساحلوں کے اندر بہتا ہے تو وہ تعمیری نتائج پیدا کرتا ہے لیکن اگر وہ ساحل فراموش ہو جائے اگر وہ ساحلوں کو توڑ دے بے باک ہو جائے تو وہی پانی دریا کی بجائے سیلاب کہلاتا ہے اور وہ تباہیاں لاتا چلا جاتا ہے۔ اس پانی نے خدا کی عبودیت اختیار نہیں کی۔ یہ سرکش ہو گیا۔ میں ذرا آگے چل کر بتاؤں گا کہ قرآن نے اسی کو شیطنت کہا ہے کہ وہ خدا کا محکوم نہ رہا شیطان کا محکوم ہو گیا۔ یعنی اس نے سرکش قوتوں جیسی روش اختیار کر لی۔ اپنے جذبات کے تابع یہ کچھ کیا تو پھر بھی وہ خود شیطان تھا اس کی شیطنت نے یہ تخریب پیدا کی۔ اگر اجتماعی طور پر یہ کچھ کیا ہے تو وہ نظام ایسا تھا کہ جس میں خدا کے قوانین سے سرکشی اختیار کی تو اس کا نتیجہ سیلاب ہو گیا تو عبادت کا یا عبدیت کا جو مفہوم ہے جو مقصود ہے وہ تعمیر ہے یعنی کسی کی صلاحیتوں کو اس طرح سے سدھانا اس طرح ان کی تربیت کرنا کہ وہ قاعدے اور قانون کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرگرم عمل ہوں۔ عبادت کے معنی یہ ہو گئے تھے۔

اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف کی شکل میں ظاہر ہوگا

سورۃ النور کی وہی آیت (24:55) آپ ایک دفعہ پھر سامنے لائیے جو اس سے پہلے بھی شاید ایک یا دو بار آپ کے سامنے آ چکی ہے جہاں کہا گیا ہے کہ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ کَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ (24:55) خدا کا یہ وعدہ ہے اس کا اٹل قانون ہے کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ اس دنیا میں مملکت حکومت اور خلافت ہے۔ تاریخ اس کی شہادت پیش کرے گی کہ جن قوموں نے یہ روش اختیار کی انہیں اس دنیا کے اندر استخلاف حاصل ہو گیا لیکن یہ استخلاف مقصود بالذات نہیں تھا۔ یہ کاہے کے لیے تھا؟ اس کے جواب میں کہا کہ وَ لَیُمَکِّنَنَّ لَہُمۡ دِیۡنَہُمُ الَّذِی ارۡتَضٰی لَہُمۡ (24:55) یہ اس لیے تھا کہ وہ اس نظام کو قائم کر سکیں Establish (ثبت) کر سکیں محکم کر سکیں جسے ان کے لیے تجویز کیا گیا ہے پسند کیا گیا ہے تو گویا یہ جو مملکت ایمان اور اعمالِ صالحہ کے نتیجے میں ملتی ہے وہ دین کے تمکن کے لیے ملتی ہے۔

دین کے تمکن کا فطرتی نتیجہ اطمینان قلب اور آسودگی ہے

اب دین کے تمکن میں ہوتا کیا ہے؟ اس میں پہلی چیز یہ ہوتی ہے کہ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا (24:55) انسان کو کامل امن نصیب ہوجاتا ہے' کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں رہتا ہے۔ ابھی ابھی میں نے یہ عرض کیا تھا کہ اگر انسان کے سامنے ایسا ضابطہ قوانین ہو' جسے وہ علم و بصیرت کی رو سے' قلب و دماغ کے پورے اطمینان سے' اپنے لیے مفید سمجھے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کا عہد کرے تو یہاں ہی اسے امن نصیب ہوجاتا ہے اور اگر اس کے بعد یہ یقین ہو کہ یہ ضابطہ قوانین جسے میں نے اختیار کیا ہے' اس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوگی تو یہ امن دوام حاصل کر لیتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ہیشگی آجاتی ہے جو خالدین فیها ابدا -(24:55) ہے۔ وہ اس امن کی زندگی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہتا ہے کہ اس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ یہ جو اس مملکت کے اندر اسے اس طرح کا امن نصیب ہوا' تو اس سے وہ اس قابل ہوا کہ يَعْبُدُوْنَنِيْ (24:55) وہ صرف میری محکومیت اختیار کر سکے۔

میں نے جیسا کہا تھا کہ خدا کی عبادت تو صرف اپنی آزاد مملکت کے اندر کی جاسکتی ہے جس کا مقصد دین کا تمکن ہو۔ یہاں کہا ہے کہ يَعْبُدُوْنَنِيْ (24:55) صرف میری عبادت کر سکے' میری محکومیت اختیار کرے لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا (24:55). اور اس میں کسی اور چیز کو شریک نہ کرے۔ یہ ہے شرک کے معنی۔

سب سے بڑا شرک یہ ہے کہ حکومت کسی کی ہو اور محکومیت کسی کی

عزیزانِ من! میں نے جیسا کہا تھا کہ جب خدا کی عبادت کا ترجمہ پرستش Worship کر دیا جائے' تو پھر شرک کے معنی بت پرستی ہوجائے گی یعنی حکومت کسی کی ہو' محکومیت کسی کی اختیار کی جائے۔ اگر ہم نے خدا کی پرستش کر لی یا پھر ہم نماز پڑھ کے کہتے ہیں' ہم خدا کی پرستش کر رہے ہیں' اگر ہم نے خدا کی پرستش کر لی تو سمجھ لیجیے کہ اپنے آپ کو فریب دے لیا کہ وہ جو رحیم کا منشا تھا' وہ پورا ہوگیا کیونکہ اس نے یہی کہا تھا کہ تم اس قابل ہوجاؤ کہ میری پرستش کرو' تمہیں کوئی مجبور نہ کرے کہ تم بتوں کی پرستش کرو۔ پرستش تو ہر حکومت کے تابع ہو سکتی ہے' عبادت تو ہر حکومت کے تابع نہیں ہوسکتی۔ وہ تو صرف اس استخلاف فی الارض میں ہوتی ہے جو دین کے تمکن کے لیے عمل میں آتا ہے اور یہاں بھی آگیا کہ يَعْبُدُوْنَنِيْ (24:55) میری ہی عبادت تم کرو' اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کرو۔ یہ وہ چیز تھی جس کا عبد مومن نے اعتراف اور اعلان کیا تھا کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ (1:4) ہم صرف تیری عبودیت اختیار کریں گے۔

نزول قرآن سے قبل ہر جگہ ہر سطح پر عبادت کا مفہوم پرستش ہی تھا

آگے بڑھنے سے پیشتر ایک چھوٹا سا نکتہ ہے جس کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ قرآنِ کریم عربوں کی زبان میں نازل ہوا ہے اور جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں دین کہیں باقی نہیں رہا تھا' ہر جگہ مذہب ہی مذہب تھا۔ مذہب میں خدا کی

محکومیت نہیں بلکہ اس کی پرستش کا تصور ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے عربی بولنے والے اہلِ مذاہب اور مشرکین عرب عبادت کے اس لفظ کا مفہوم پرستش لیتے تھے کیونکہ ان کے ہاں محکومیت کا تو تصور ہی نہیں تھا۔ خدا کی حاکمیت کا تصور بھی نہیں تھا۔ اس لیے ان کے ہاں اہل مذاہب میں جو یہودی اور عیسائی تھے بلکہ ایران کے جو مجوسی بھی تھے' ان تینوں کے ہاں خدا کی پرستش کا تصور تھا اور ان قریش میں بھی ان کی دیکھا دیکھی' اس لفظ کا مفہوم یا تصور یا معنی' پرستش رہ گیا تھا۔ وہ بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ لہٰذا جب ہم قرآنِ کریم میں اس لفظ کو ان لوگوں کی طرف نسبت کرتے ہوئے دیکھیں گے کہ وہ کہتے تھے کہ ہم فلاں کی عبادت کرتے ہیں تو وہاں اس کے معنی ان کے تصور کے مطابق پرستش ہوگا لیکن جب اس کی نسبت اللہ کی طرف ہوگی' جماعت مومنین کی طرف ہوگی' امت مسلمہ کی طرف ہوگی' مسلمانوں کی طرف ہوگی' تو پھر اس کے معنی پرستش نہیں ہوں گے' اس کے معنی خدا کی محکومیت ہوں گے: پرستش اہل مذاہب کے ہاں اور محکومیت خدا کے نظام کے تابع زندگی بسر کرنے والی امت مسلمہ کے ہاں۔ اس کو زیرِ نظر رکھیے کیونکہ کہیں کہیں قرآن میں جب ہم دیکھیں گے کہ یہ لفظ ان لوگوں کی زبان سے آیا ہے تو وہاں انہی کا جو تصور تھا' وہی اس کا مفہوم لیا جائے گا۔ یعنی وہاں اس کا مفہوم پرستش ہوگا' اپنے ہاں نہیں۔

دین اور مذہب میں بنیادی فرق عبادت اور پرستش کے مفہوم میں ہے

ان حقائق کی روشنی میں' عزیزانِ من! ہم اس مقام پہ آ گئے ہیں کہ جہاں دین اور مذہب کی غایت' مقصد اور منتہیٰ کا فرق نکھر کر سامنے آ جائے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے پہلے بھی یہ آیت پیش کی تھی اور اب تو اس مقام پر یہ نکھر کر واضح طور سے سامنے آ جائے گی کہ دین اور مذہب میں فرق کیا ہوتا ہے؟ وہ آیت ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ (51:56)۔ مذہب کی دنیا میں ہمارے ہاں آپ جہاں بھی' جس قرآن میں بھی دیکھیں گے' اُس کا ترجمہ یہ دیا ہوگا کہ ''ہم نے جن اور انس کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ ہماری پرستش کرتے رہیں''۔ جن اور انس کے معنوں میں آپ ابھی گہرے مفہوم میں نہ جائیے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کہ ''وہ شہری زندگی کے لوگ' متمدن زندگی کے لوگ' تمدن کے اعتبار سے زندگی بسر کرنے والے لوگ ہوں' یا صحرائی لوگ' بدوی لوگ ہوں'' بہر حال انسان جس میں بھی ہیں' مذہب کی رو سے کہا یہ گیا کہ ان کو پیدا اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ خدا کی پرستش کرتے رہیں یعنی خدا نے تو یہ کہا ہے کہ ہم نے تو انسانوں کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ ہماری پوجا کرتے چلے جائیں یعنی یہ ہے منشائے تخلیقِ انسانی: ''خدا کی پرستش کرتے چلے جائیں''۔ معاذ اللہ خدا کا کوئی ایک کام تھا اور اس کام کو پورا کرنے کے لیے اس نے انسانوں کو پیدا کر دیا۔ اب انسان یہاں جو کچھ کر رہا ہے یہ خدا کا کوئی مقصد ہے' جسے وہ پورا کر رہا ہے۔ اس کا کوئی اپنا مقصد نہیں ہے' اپنا مقصد اتنا ہی ہے کہ اگر یہ نہ کیا گیا تو خدا ناراض ہو جائے گا اور اس کی ناراضگی سے تو پھر جو سزا ملتی ہے' اس کے تو تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں' کانپتا ہے' ڈرتا ہے کہ وہ مجھے سزا نہ ملے یعنی اس کے حکم کے نہ ماننے سے خدا راضی ہو جاتا ہے' خوش ہو جاتا ہے۔ گویا یہ ساری پرستش' یہ پوجا پاٹ' اس کے احکام کے مطابق

کرنا' صرف اس لیے ہے کہ وہ خوش ہو جائے' راضی ہو جائے اور اگر یہ نہ کیا جائے تو وہ ناراض ہو جائے گا' ناخوش ہو جائے گا اور سخت سزا دے گا۔

اللہ تعالیٰ کی محکومیت کی بجائے پرستش کے تصور نے ہماری نفسیات تک کو تبدیل کر دیا ہے

مذہب کی دنیا کے اندر اس کا خدا کے متعلق یہ تصور ذہن میں آتا ہے یعنی یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے یہ کرو اور وہ نہ کرو' ایسے چلو اور ایسے نہ چلو' تو یہ سارا کچھ خدا کا کوئی اپنا پروگرام ہے اس کے مطابق وہ یہ چیز ہم سے کہہ رہا ہے۔ ہمارا اس کے اندر کچھ اپنا حصہ نہیں ہے کوئی اپنی غرض نہیں ہے' کوئی اپنی غایت نہیں ہے۔ اپنی غایت وغرض یہی ہے کہ ہم یہ کچھ کریں گے تو وہ ہمیں اس کا کوئی صلہ دے دے گا' کوئی بدلہ دے دے گا' کوئی معاوضہ دے دے گا' اگر نہیں کرے گا تو وہ پیٹے گا' کھال ادھیڑ دے گا۔ جیسے ہم اپنے ہاں مزدور لگاتے ہیں' معمار لگاتے ہیں۔ اپنے ہاں ہم نے اپنے نقشے کے مطابق کوئی مکان بنوانا ہوتا ہے اور اس نقشے کی تعمیر کے لیے یا اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے ان مزدوروں کو' معماروں کو Engage کرتے ہیں۔ ان سے یہی معاملہ ہوتا ہے کہ انہیں اس کا یہ صلہ یا معاوضہ ملے گا۔ اس مکان کی تعمیر میں' ان کی غرض وغایت' ان کا جو مقصد ہے' وہ صرف وہ معاوضہ لینا ہے اجرت لینا ہے جس کے لیے ان کو مقرر کیا گیا ہے۔ ان کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ کس نقشے کے مطابق مکان بن رہا ہے' ایسا کیوں بن رہا ہے' اس میں کون رہے گا' انہیں اس سے کوئی مقصد ہی نہیں ہے' ان کا اس میں کوئی Interest (دل چسپی) ہی نہیں ہے۔ انہیں کہا گیا کہ یہاں بنیاد کھود دیجیے' انہوں نے کھود دی۔ ان سے کہا گیا کہ اتنی اونچی دیوار بنا دیجیے' انہوں نے دیوار بنا دی۔ کہا گیا کہ اس قسم کی چھت ڈال دیجیے' اس کی چھت ڈال دی۔ اگر یہ ڈال دی ہے تو مالک راضی ہو گیا۔ اگر ایسا نہیں کیا تو وہ یقیناً ناراض ہو جائے گا' فوراً کام سے الگ کر دے گا' اجرت بھی نہیں دے گا۔ تو ہمارا اس میں Interest (دل چسپی) اس مکان کے بنانے میں ہے اور ان مزدوروں کا' ان معماروں کا' ان تمام کا Interest (دل چسپی) صرف وہ اجرت ہے جو انہیں ملے گی۔ مکان کے اندر ان کا کوئی اپنا Interest (دل چسپی) نہیں ہے' اپنی کوئی غایت نہیں ہے' اپنا کوئی مقصد نہیں ہے۔

مذہب میں پرستش اور پوجا پاٹ کا جو تصور ہے یا جو کچھ بھی انسان کرتا ہے' اس کے لیے کہتا یہ ہے کہ یہ اس لیے ہے کہ اس سے خدا خوش ہو جائے' انسان کی اپنی کوئی غایت یا اپنا کوئی مقصد نہیں ہے۔ یعنی ان کا اس سے کچھ نہیں سنورتا' اُس کا کچھ سنورتا ہے۔ معاذ اللہ اس کا کوئی پروگرام تھا جس کے لیے اس نے یہ کہا کہ یہ کرو اور یہ کرو۔ یہ ہے اس کا تصور' عزیزانِ من! دین کے اندر تو تصور ہی کچھ اور ہے اور وہ تصور یہ ہے کہ جو کچھ تم سے کہا جا رہا ہے کہ ایسا کرو' اس نہج کی زندگی بسر کرو' اس قسم کا نظام قائم کرو' تو اس سے خدا کا کچھ سنورتا نہیں۔ معاذ اللہ اس کا کوئی کام رکا ہوا نہیں ہے کہ اس نے اس کے لیے تم سے کہا ہے کہ یہ کچھ کرو تاکہ ہمارا یہ کام ہو جائے بلکہ یہ تمہارے ہی بھلے کے لیے ہم کہہ رہے ہیں۔ جیسے ڈاکٹر جو مریض کو ہدایت دیتا ہے تو وہ اس مریض کے بھلے کے لیے ہوتی ہے۔ اگر وہ اس کے مطابق عمل کرتا

ہے تو اس سے مریض کی صحت ٹھیک ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ ڈاکٹر کی صحت ٹھیک ہوتی ہے۔ اگر وہ اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس سے ڈاکٹر کی صحت پہ تو کوئی برا اثر نہیں پڑتا' مریض کی صحت پہ اثر پڑتا ہے' یہ Directives (ہدایات) ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو ہدایت یاDirectivesدی ہیں کہ ایسا کرو اور ویسا کرو اور کہا ہے کہ اس کے مطابق زندگی بسر کرو تو اس کا مقصد یہ ہے۔ اگر ایسا کرو گے تو تمہاری صحت درست ہو جائے گی۔ یہ جو میں نے ابھی مثال دی ہے ڈاکٹر اور مریض کی' اس اعتبار سے میں کہہ رہا ہوں۔ قرآنِ کریم نے عزیزانِ من! ہر مقام پہ یہ کہا ہے کہ جو کچھ تم سے کہا جا رہا ہے کہ ایسا کرو' ایسا کہنے میں ہمارا کوئی مقصد نہیں پورا ہو رہا' ہماری اپنی کوئی غایت نہیں ہے۔ یہ تمہارے بھلے کی ہی کہہ رہے ہیں۔

''شکر'' کا قرآنی مفہوم انسانی صلاحیتوں کو قوانین خداوندی کے تابع صرف کرنے کے ہیں

سورۃ لقمان میں پہلی ہی چیز لکھی ہے کہ اس نے' یعنی یہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا جو اس کی زبان سے ادا کیا جا رہا ہے' کہا کہ اَنِ اشْکُرْ لِلّٰہِ (31:12)۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے: ''اللہ کا شکر کرو''۔ میں یہاں ''شکر'' کے یہ معنی بھی نہیں بتانا چاہتا۔ یہ بھی ایک بڑی اہم چیز ہے۔ اس کے معنی یوں سمجھ لیجیے کہ ''خدا کے بتائے ہوئے قوانین اور قواعد کے مطابق اپنی صلاحیتوں کو صرف کرو تاکہ وہ بھرپور نتائج پیدا کریں''۔ یہ معنی ہوتے ہیں شکر کے۔ تو کہا یہ کہ اَنِ اشْکُرْ لِلّٰہِ (31:12) ترجمہ کیا گیا کہ اللہ کا شکر کرو حالانکہ ''اللہ'' کا شکر نہیں۔ یہاں للہ ہے۔ اس کے معنی ''کے لیے'' ہیں۔ اب اگر یہ ترجمہ کریں: ''اللہ کے لیے شکر کرو'' تو بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اس غایت کے لیے' اس مقصد کے لیے' جو خدا نے تمہارے لیے متعین کیا ہے' اس کے لیے کرنے کا کام یہ ہے۔ اَنِ اشْکُرْ اس مقصد کے حصول کے لیے شکر کرو۔ اب یہ جو ''شکر'' کی بات ہے' میں یہ کہہ رہا تھا کہ وہ خدا کے کسی مقصد کے حصول کی بات نہیں ہے۔ سنیے 'عزیزانِ من! کیا کہتا ہے اَنِ اشْکُرْ لِلّٰہِ (31:12) اور اس کے بعد ہے کہ یاد رکھو! وَمَنْ یَّشْکُرْ (31:12) جو کوئی اس طرح سے شکر بجا لاتا ہے فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِہٖ (31:12) وہ ہمارا کچھ کام نہیں سنوارتا' اپنی ذات کو سنوارتا ہے' اسی کے حسن میں اضافہ کرتا ہے' اسی کی صلاحیتوں میں نشوونما پیدا ہوتی ہے' وہ اپنا کچھ کام کرتا ہے اور آگے ہے کہ وَمَنْ کَفَرَ (31:12) جو اس سے انکار کرتا ہے' اس کے خلاف جاتا ہے تو اس سے بھی ہمارا کچھ نہیں بگڑتا۔ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ (31:12) اللہ تمہاری ان چیزوں سے مستغنی ہے' وہ تو مستحق حمد و ستائش چلا آ رہا تھا' اس وقت بھی جب نہ یہ کائنات موجود تھی' نہ تم انسان موجود تھے۔ اگر اس نے اپنے ہی کسی کام کے لیے یہ کچھ کرانا ہوتا' تو جب تم موجود نہیں تھے تو اس وقت تو پھر سارے ہی اس کے کام رکے رہتے۔ بالکل نہیں فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ (31:12) یاد رکھو! خدا تو مستغنی ہے۔ تم سے بھی مستغنی ہے۔ اس میں تمہارا ہی کچھ سنورتا ہے۔ اس کے لیے' عزیزانِ من! بہت سے مقامات پیش کیے جا سکتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے لیے ایک الگ درس نہیں' بلکہ قرآن کریم کی پوری تفسیر سامنے آنی چاہیے اور آپ دیکھیں گے

آئندہ درسوں میں جو چیزیں آپ کے سامنے آئیں گی وہ انہی نکات کی وضاحت ہوگی۔ یہ قرآن کریم کے بنیادی نکات ہیں، کہ جو کچھ تم سے کہا جارہا ہے، یاد رکھو! یہ تمہارے ہی لیے ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ہر ہدایت انسان کی اپنی منفعت کے لیے ہی ہے

سورۃ الانعام کی آیت (6:104) غور سے سنیے۔ کہا کہ قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ (6:104) تمہارے خدا کی طرف سے یوں کہیے سورج طلوع ہوا، روشنی پھیل گئی، راستے روشن ہو گئے۔ یہ اس نے کیا ہے لیکن اس روشنی دینے سے اور راستوں کو روشن کرنے سے اس کا کوئی اپنا مقصد نہیں ہے۔ کہا کہ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ (6:105) اب اس روشنی میں جو شخص آنکھیں کھول کر چلے گا اس کا فائدہ اسی کو ہوگا۔ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا (6:105) جو آنکھیں بند کر کے چلے گا، وہ نقصان اٹھائے گا۔ اس کا نقصان اس کو ہوگا۔ نہ آنکھیں کھول کر چلنے والوں کے اس کام کا ہمیں کچھ فائدہ، نہ آنکھیں بند کرنے والے حضرات کا ہمیں کوئی نقصان ہے۔ اس لیے یہاں پہنچنے کے بعد آگے کہا کہ ہم انسانوں کو مار مار کے نہیں چاہتے کہ اس ایک راستے پہ چلیں اور ہم انسانوں سے یہ کہیں کہ یہ روشنی ہم نے عطا کی ہے، تو آنکھیں کھولو یا ہم زبردستی اس کی آنکھیں کھولیں۔ کہا کہ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ انسان کی بنیادی خصوصیت اس کا اختیار وارادہ ہے۔ اگر اس کا اختیار وارادہ اس سے سلب کر لیا جائے تو وہ تو انسانیت کی سطح سے نیچے گر جاتا ہے۔ ہمارا کام صرف یہ سمجھا دینا ہے کہ دوراہے پہ کھڑے ہو، یہ راستہ اِدھر جاتا ہے، یہ اُدھر جاتا ہے، راستے میں روشنی پیدا کر دی ہے۔ ہم نے سائن پوسٹ (نشان راہ) لگا دیئے اور اس کے بعد اگر تم صحیح راستے پہ چلو گے، منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤ گے، غلط راستہ اختیار کرو گے تو پھر گمراہ ہو جاؤ گے۔ اس کے نقصانات تمہیں ہوں گے کیونکہ وَ مَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ (6:104) ہم تم پہ داروغہ نہیں ہیں۔ انسان اپنی ذات سے اپنے آپ کی بھلائی کے لیے چلتا ہے۔ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا (39:41) اور جو غلط راستہ اختیار کرتا ہے اس کا نقصان بھی اسی کو ہوتا ہے وَ مَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ (39:41) ہم تم پر کوئی داروغہ مقرر نہیں ہوئے۔ ہمارا کوئی اپنا مقصد نہیں تھا جس کے لیے ہم نے تمہیں خاص راستے پہ چلانا تھا کہ تم نہیں چلتے تو ہم تمہیں مار مار کے ادھر چلائیں۔ تمہارے اپنے بھلے کی بات تھی۔ تم اپنا بھلا نہیں چاہتے ہو، تو ہم تمہیں مجبور نہیں کرتے۔ اس سے بھی آپ نے دیکھ لیا کہ خدا کا جو حکم ہے، جو ہدایت ہے، جو صحیح راستے ہیں، اس پہ چلنے سے خدا کا کوئی کام نہیں سنورتا، انسان کی اپنی ذات سنورتی ہے، اس کا اپنا ہی بھلا اس کے اندر ہوتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی زندگی کے آخری الفاظ کہ خدا کی ذات میری بہترین رفیق ہے

عزیزانِ من! اب آگے چلیے۔ سورۃ العنکبوت میں ہے کہ وَ مَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ (29:6) جو بھی جدوجہد کرتا ہے، جو بھی ہمارے ہدایت کے مطابق، ہماری ڈائریکشن کے مطابق، جدوجہد کرتا ہے فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ (29:6) وہ اپنی ذات کے

سنوارنے کے لیے یہ کچھ کرتا ہے اور اگلے الفاظ نے تو بات واضح کر دی کہ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (29:6) خدا تو تمام کائنات سے مستغنی واقع ہوا ہے۔ وہ اپنے لیے تم سے کچھ نہیں کرانا چاہتا' اس کو ضرورت ہی نہیں ہے کہ وہ کسی سے اپنے کام کرائے۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے کہ خدا تو اس وقت بھی خدا تھا' جب یہ کل کائنات کا وجود ہی نہیں تھا۔ اس کے پروگرام اس وقت بھی سرگرمِ عمل چلے جا رہے تھے جب کوئی بھی موجود نہیں تھا' تو یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے کسی پروگرام کی تکمیل کے لیے انسانوں سے کہتا ہے کہ تم یہ کرو اور تم وہ کرو۔ یہ نہیں ہے۔ وہ جو کہتا ہے تو ایک مشفق حکیم کی طرح' مصلح کی طرح' ناصح کی طرح' انسانوں کے بھلے کے لیے کہتا ہے۔ انہی کے فائدے کے لیے یہ بات کہتا ہے کہ ہم تم سے یہ کہتے ہیں کہ تم ایسا کرو گے تو تمہاری ذات سنور جائے گی' تمہاری زندگی حسین تر ہو جائے گی۔ کیا بات کہہ گیا ہے' عزیزانِ من! شعر تو فارسی کا ہے لیکن بڑا ہی جامع شعر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

حکایت قدِ آن یار دلنواز کنم

اس یارِ دلنواز کی میں باتیں کر رہا ہوں۔ اس لیے کہا ہے کہ آگے بات آئے گی' اس میں شریعت ہے۔

بایں بہانہ مگر عمر خود دراز کنم

مگر یہ کچھ اس کے قد کی تعریف کے لیے نہیں بلکہ اس بہانے سے میں خود اپنی عمر کو دراز کر رہا ہوں' اپنی درازیٔ عمر کے لیے میں اس کی یہ تعریفیں یا اس کا ذکر' یا اس کی داستان بیان کر رہا ہوں' تو یہ جو خدا کا ذکر' خدا کی داستان بیان کرنا ہے' یہ جو جسے ہم خدا کی عبادت' خدا کے احکام کی' اطاعت کہتے ہیں' تو یہ تو "بایں بہانہ مگر عمر خود دراز کنم" کی بات ہے۔ عزیزانِ من۔ یہ شعر ہے۔ خدا سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ

تیری جلوہ گاہِ جمال میں میرا ذوق دید نکھر گیا
تیری ضوفشانیٔ حسن نے میری حیرتوں کو سجا دیا

پہلے تو کہا تھا کہ

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

انسان ہزار سجدہ خدا کے لیے کرتا ہے لیکن کیفیت یہ ہے کہ اس سے دنیا بھر کی غلامیوں سے' محکومیوں سے' انسان چھوٹ جاتا ہے۔ ایک سجدے سے کیا ہوتا ہے۔ کسی اور نے کہا ہے:

تیرے سنگ در میں بدل دیا ہے یہ پستیوں کو فراز نے
کہ ہزاروں عرش جھلک رہے ہیں میری جبین نیاز میں

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں انسان کا ایک ایک سجدہ انسان کی جبین نیاز کو حسین سے حسین تر کرتا چلا جاتا ہے

اس کے سنگ در کے اوپر اگر پیشانی کو رکھا جاتا ہے تو اس میں نہ سنگ در کا کوئی مقصد ہے' نہ اس کے مالک کا کوئی فائدہ ہے۔ اس سے تو میری پیشانیوں میں' میری جبین نیاز کے اندر' ہزاروں عرش جھلکنے شروع ہو جاتے ہیں۔ انسان کی ذات' عزیزانِ من! آہستہ آہستہ علیٰ حد بشریت' صفاتِ خداوندی کا آئینہ بنتی چلی جاتی ہے۔ اگر آپ اس کا غلط مفہوم نہ لے لیں' چھوٹے پیمانے پر یہ انسان علیٰ حدِ بشرّیت خود خدا کا ایک نمونہ بنتا چلا جاتا ہے۔ اسی کا کچھ سنورتا ہے' خدا کا اس میں کچھ نہیں سنورتا۔ اور پھر یہ جو انسان کو وہ بار بار ہدایتیں دیتا ہے' تاکید کرتا ہے' اگر وہ غلط چلتا ہے تو کہتا ہے یٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ (36:30) میرے بندے! تو نے اپنے ہاتھ سے کیا کر لیا۔ کس کس قدر ہمدرد و مشفق ہے وہ! وہ یہ خود چاہتا ہے کہ انسان اس طرح بن جائے' ایسا بن جائے' اس مقصد پہ پورا اترے' اس قالب میں ڈھل جائے۔ یہ وہ خود چاہتا ہے۔ کیا کہہ گیا ہے وہ حسرت [1]! کیا شعر ہے! کہ

شعائے مہر خود بے داغ ہے جذبِ تمنا سے
حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پرواز شبنم کی

جب بھی کوئی خدا کے قانون میں دخل اندازی کرے گا وہ مشرک کا مرتکب ہوگا

شعائے مہر تو خود یہ چاہتی ہے کہ اس قطرۂ آب کو' جسے اگر ایسے چھوڑ دیا جائے' تو وہ خاک میں' زمین میں گر جائے گا' خاک میں مل جائے گا' شانِ جبرائیل نصیب ہو جائے کہ وہ اعلیٰ اور اعلیٰ بلندیوں پہ اٹھتا ہوا چلا آئے اور ہماری جلوہ گاہِ جمال کے اندر آ کر اپنی ذات میں اور حسن پیدا کرتا چلا جائے۔ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ [2] (31:12)۔ سورۃ لقمان ہی میں آگے ہے کہ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (31:13) اے میرے بیٹے! خدا کی محکومیت میں کسی اور کو شریک نہ کرنا' یاد رکھو! شرک ظلم عظیم ہے۔ میں نے شاید پہلے کسی درس میں بتایا ہے کہ عربی زبان میں ''ظلم'' کے معنی ہوتے ہیں ''جس مقام پر کسی کو ہونا چاہیے اس کا اس مقام پر نہ ہونا''' تو کہا یہ ہے کہ شرک ایک ایسا ظلم ہے اس سے بڑا ظلم کوئی نہیں ہو سکتا۔ دیکھیے' عزیزانِ من! دونوں طرف سے' کس طرح وہ شے جس مقام پہ ہونی چاہیے' وہ وہاں نہیں رہتی۔

شرک کے معنی ہیں ''خدا کی محکومیت میں کسی اور کو شریک کرنا' خواہ وہ انسان کے اپنے جذبات ہی کیوں نہ ہوں' کسی اور کو شریک کرنا''۔ جونہی آپ نے کسی اور کو وہ مقام دے دیا جو مقامِ خداوندی ہے تو خدائے واحد اپنے مقام پہ نہ رہا' اس سے نیچے گر گیا یعنی اس

---

[1] فضل الحسن حسرت موہانی (1875-1951)

[2] جو نعمائے خداوندی کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرتا ہے' اس کی ذات کی صلاحیتیں بھرپور انداز سے نشوونما پاتی ہیں۔

کے ساتھ ایک اور ساتھی بھی آ گیا۔ خدا کی خصوصیت تو یہ ہے کہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ [1] (112:1) وہ اپنے مقام میں منفرد ہے، کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔ جونہی آپ نے اس کے ساتھ ایک اور شریک کیا، خدا اپنے مقام پہ نہ رہا اور دوسری طرف، عزیزانِ من! انسان کا شرف اس میں ہے کہ وہ دنیا میں کائنات کی کسی قوت کے سامنے نہ جھکے، اس لیے کہ کائنات کو تو اس کے لیے تابع تسخیر کیا گیا ہے، مسخر کیا گیا ہے، یہ مسجودِ ملائک ہے، یہ سب اس کے سامنے سجدہ ریز ہونے چاہئیں۔ یہ پہلی چیز ہے۔

اگر کائنات کی کسی قوت کے سامنے جھک گیا تو اس کا وہ مقام نہ رہا جو ہونا چاہیے اور اگر آگے بڑھا اور کسی انسان کے سامنے جھک گیا تو پھر بھی مساواتِ انسانیت کے مقام سے گر گیا۔ تو شرک میں نہ خدا اپنے مقام پہ رہا، نہ انسان اپنے مقام پہ رہا اور انسان تو اس شرک میں ایسی ذلتوں اور پستیوں میں گرتا ہے کہ اقبالؒ (1877-1938ء) کے الفاظ میں پھر یوں ہوتا ہے:

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے، نہ من تیرا نہ تن [2]

قصہ ختم ہوا، اس کے بعد کوئی انسان ہی نہیں رہتا۔ اس میں یہ ہے کہ یہ جو عبادت ہے، یہ خدا کی عبودیت ہے، خدا کے قوانین کی اطاعت ہے، تو عزیزانِ من! یہ اطاعت انسان کی اپنی ذات کو سنوارنے کے لیے ہے، اس میں نشوونما پیدا کرنے کے لیے ہے، اس کے حسن کو نکھارنے کے لیے ہے، خدا کا اس میں کوئی کام نہیں ہوتا۔

قصۂ ابلیس و آدم کی اصل حقیقت

اب ایک قدم آگے بڑھیے۔ میں نے کہا تھا کہ شرک میں یہ بات بھی شامل ہے کہ انسان خود اپنے جذبات کا محکوم بن کر رہ جائے، اپنی بے مہار، بے زمام، خواہشات کی اطاعت کرنے لگ جائے۔ اسی سے خدا کے قوانین کی سرکشی ہوتی ہے اور اسی سرکشی کی جو کیفیت ہے، اسے قرآن نے شیطان کہہ کر پکارا ہے۔ میں آگے چل کر قصہ آدم میں یہ بتاؤں گا کہ یہ ابلیس اور شیطان، خارج میں کوئی ہستیاں نہیں ہیں، یہ انسان کی اپنی ہی کیفیت کا نام ہے۔ تو جہاں شیطان کا لفظ ہے، اس کے لیے میں یہ کہہ رہا تھا کہ انسان کے اپنے جذبات جب اقدارِ خداوندی سے سرکشی اختیار کر لیتے ہیں تو اسے قرآن شیطان کہہ کر پکارتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ (36:60) اے نوعِ انسانی! کیا ہم نے تم سے یہ بات نہیں کہی تھی کہ تم نے شیطان کی عبودیت اختیار نہیں کرنی۔ اگر اس عبودیت، عبادت کے معنی پرستش لیے جائیں تو یہاں بات ہی کوئی نہیں بنتی۔ شیطان کی تو کوئی پرستش نہیں کرتا۔ شیطان خود انسان

---

[1] اس کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 30 (مکمل)، ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2006ء، سورۃ الاخلاص۔

[2] اقبالؒ: بالِ جبریل۔

کے سرکش جذبات ہیں۔تم سے یہ کہا گیا ہے کہ کائنات کی قوتوں کے سامنے نہیں جھکنا' اپنے جیسے انسانوں کے سامنے نہیں جھکنا اور یہ کہ خود اپنے سرکش جذبات کے سامنے بھی نہیں جھکنا۔انہیں اقدارِ خداوندی کے ساحلوں کے اندر رکھنا۔کہا یہ گیا تھا کہ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ (36:60) ان کی عبودیت اختیار نہ کرنا بلکہ وَ اَنِ اعْبُدُوْنِیْ (36:61) صرف میری محکومیت اختیار کرنا لٰہذا یہ صراط مستقیم ہے۔صراطِ مستقیم کا تذکرہ آگے آتا ہے۔یہ یہی سورۃ الفاتحۃ میں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (1:5) ہے۔آپ نے دیکھا کہ اس کے کیا معنی ہیں؟ یہ کہ اپنے جذبات کو کبھی سرکش نہ ہونے دو بلکہ یہ کہا کہ انہیں بھی ہمارے قوانین کے تابع رکھنا۔یہ ہیں معنی کہ شیطان کی عبودیت اختیار نہ کرنا بلکہ وَ اَنِ اعْبُدُوْنِیْ (36:61) صرف میری محکومیت اختیار کرنا' لٰہذا هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ہے۔

طاغوت کا مفہوم

قرآنِ کریم نے ایک اور اصطلاح بھی استعمال کی ہے اور وہ ہے طاغوت۔طاغوت کے معنی ہیں ''ہر وہ قوت جو خدا سے سرکشی اختیار کرے۔'' انسان کی اپنی ذات یا کوئی اور دوسرے انسان' یعنی جہاں بھی کوئی قانون' کوئی نظام' کوئی حکومت خود انسان کی اپنی ذات' خدا کے قوانین سے سرکشی اختیار کرے گی تو اسے قرآن طاغوت کہہ کر پکارتا ہے۔

ان تصریحات سے آپ نے سمجھ لیا' عزیزانِ من! کہ خدا کی عبادت کے معنی ہیں ''اس کی محکومیت اختیار کرنا' اپنے ہر معاملات کے فیصلے اس سے لینا'' اور اس سے لینے کے معنی ہوں گے ''اس کی کتاب سے لینا'' کیونکہ اس نے کہا ہے کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ...... هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ...... هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (42;43;44) یہ جو بھی خدا کی کتاب کے سوا کہیں اور سے فیصلے لیتا ہے' جو بھی اس کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتا' یہی لوگ ہیں جن کو فاسق کہا جاتا ہے' ظالم کہا جاتا ہے حتیٰ کہ کافر کہا جاتا ہے۔تو اصل چیز ہے اپنے معاملات کے فیصلے کہاں سے لیے جائیں' کس قانون کی اطاعت کی جائے؟ یہ ہیں وہ خدا کی عبودیت یا عبدیت کے معنی۔اب دیکھیے وہ اس کے مقابلے میں دوسری بات کیا کہتا ہے۔ابھی ابھی میں نے کہا تھا کہ یہ جو طاغوت یا سرکش جذبات یا سرکش قوتیں ہیں' اُن کے لیے قرآن نے کہا تھا کہ ان سے اجتناب برتنا' ان کے تابع نہ ہو جانا۔کہا کہ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (4:60) کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پہ کبھی غور کیا ہے کہ بزعم خویش یہ سمجھتے ہیں کہ ہم تو صاحب الحمدللہ مسلمان ہیں' صاحبِ ایمان ہیں' اللہ کی کتاب پہ ایمان لائے' اس سے پہلی کتابوں پہ ایمان لائے' ہم تو بالکل صاحب ایمان ہیں؟ اور ان کی کیفیت یہ ہے کہ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْا اِلَى الطَّاغُوْتِ. (4:60) چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے غیر خداوندی قوتوں سے جا کر کرائیں' حکومت ان کی قبول کریں' محکومیت ان کی اختیار کریں' قوانین ان کے لائیں' ان کے تابع اپنے معاملات کو طے کریں۔آپ نے دیکھا' عزیزانِ من! قرآن نے بات کیسے واضح کر دی وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ (4:60) حالانکہ

تم سے کہا گیا تھا کہ ان قوتوں سے سرکشی برتو اور محکومیت صرف خدا کی اختیار کرو۔ ان مقامات سے' عزیزانِ من! آپ دیکھ لیجیے کہ جب ایک عبد مومن کہتا ہے کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) ہم صرف تیری محکومیت اختیار کرتے ہیں' تو اس کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ بہت بڑا نعرۂ انقلاب ہے۔ یہ وہی چیز ہے جسے لا الہ الا اللہ کہا جاتا ہے یعنی کوئی صاحب اقتدار نہیں سوائے خدا کے۔ یہ تو ایک حقیقت کا اظہار اور اعلان ہوا اور اس کے بعد یہ کہا کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) ہم عملاً بھی ایسا ہی کرتے ہیں کہ خدا کے سوا کسی اور کے قانون کی' کسی اور کی محکومیت اختیار نہیں کرتے ہم عملاً یہی کرتے ہیں:

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی' باقی بتانِ آزری!

ہمارے ہاں ہر نماز میں ''ایاک نعبد'' کے اعلان کی عملی کیفیت

اب اس کے بعد آپ سوچیے' عزیزانِ من! کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) کو یعنی سورۃ الفاتحۃ نماز کی ہر رکعت کے اندر ہم پڑھتے ہیں اور اس ہر رکعت میں ہم یہ اعلان کرتے ہیں' باوضو مسجد میں کھڑے ہو کر' منہ طرف قبلہ شریف کہہ کر نماز میں اعلان کرتے ہیں کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) ہم تیرے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہیں کرتے' کسی کی اطاعت نہیں کرتے' صرف تیری اطاعت کرتے ہیں اور اس کے بعد ہمارا عمل کیا ہے۔ عزیزانِ من! یہ تمام فیصلے ہم غیر اللہ کے قانون کے تحت کرتے ہیں۔ نہ نظام خدا کے قانون کا' نہ حکومت خدا کے قانون کی' نہ اطاعت خدا کے قانون کی۔ عجیب چیز ہے' عزیزانِ من! اور اس کے باوجود اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) کتنا بڑا فریب ہے جو ہم اپنے آپ کو دیتے ہیں! خدا تو کہتا ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (2:9) وہ اس طرح خدا کو اور مسلمان' جماعت مومنین کو فریب دے دیتے ہیں۔ وَ مَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَھُمْ (2:9) حالانکہ یہ اپنے آپ کو فریب دیتے ہیں' خدا کو کیا فریب دیں گے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے' عزیزانِ من! خود فریبی اس میں ہے کہ وہ جو دین کے نظام کے شعائر اور ارکان تھے' وہ جو اس نظام کو قائم کرنے کے لیے' محسوس طور پر ایک پروگرام تھا' اس کو اسی طرح سے قائم رکھا جاتا ہے' مگر ہوتا یہ ہے کہ مذہب کے اندر اقیموا الصلوٰۃ نماز پڑھو بنتا ہے۔ نماز کی رکعتیں نماز کا قیام' رکوع' سجود یہ سارا کچھ اسی طرح سے قائم رکھا جاتا ہے۔ صیام یعنی روزہ اسی طرح سے ہے' کہ کس وقت کھانا چاہیے' دن بھر یہ کرو شام کو پھر افطار کرو' پھر یہ کرو' وہ اسی طرح سے مراسم ادا کیے جاتے ہیں۔ حج بھی ایک بہت بڑا اجتماع رہ گیا ہے۔ وہ بھی ایک رسم ہے' جس کو ہم ادا کرتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں دین کے نظام کے اہم رکن تھے۔ یہ اس مشین کے اہم پرزے تھے۔ وہ نہ نظام باقی ہے نہ وہ مشین باقی ہے' نہ وہ پروگرام باقی ہے۔ ان چیزوں کو ہم اس شکل میں قائم رکھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں کہ ہم دین کے نظام پہ چل رہے ہیں۔

فوج کے اندر کسی سپاہی کا صرف ہر آن چوک و چوبند رہنا ہی مقصود بالذات نہیں ہوتا

وہ جو میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ فوج میں جو ایک سپاہی ہے اس کے لیے ایک پروگرام مقرر کیا جاتا ہے اس کے لیے قاعدے مقرر کیے جاتے ہیں ضابطے مقرر کیے جاتے ہیں ان قواعد وضوابط کی جزئیات تک کی یہ کیفیت ہے کہ اس میں یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ ایک سپاہی اپنے بوٹ کے تسمے کس طرح سے بند کرتا ہے اپنی پیٹی کس مقام پر لگاتا ہے اپنے بٹن کس طرح بند کرتا ہے بندوق کو اٹھاتا کیسے ہے قدم کیسے اٹھاتا ہے چلتا کیسے ہے رکتا کیسے ہے یہ سب کچھ اس سے کرایا جاتا ہے۔ اگر وہ ذرا بھی اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اسے قانون شکنی کہا جاتا ہے۔ اس کی اسے سزا ملتی ہے۔ اس کی پابندی کی اتنی اہمیت ہے۔ فوج کے اندر پوری زندگی بھر اس کو یہ کچھ کرنا پڑتا ہے لیکن یہ چیز مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ ان تمام قواعد اور ضوابط کی پابندیوں سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اس قابل ہو جائے کہ کل کو اگر اسے اپنے دین کی حفاظت کے لیے اپنے مملکت اور ملک کی حفاظت کے لیے میدانِ جنگ میں نکل کر جان بھی دینی پڑے تو بے دریغ جان دے دے۔ مقصد یہ ہوتا ہے۔ اس کے لیے یہ ساری جزئیات طے کی جاتی ہیں ان تمام چیزوں کی پابندی کرائی جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی زندگی میں ساری عمر یہ موقعہ آئے ہی نہیں اس کے باوجود اس کو پابندی ساری عمر کرنا پڑتی ہے۔ یہ اس لیے کہ یہ اس غایت اور اس مقصود کے حصول کا ذریعہ ہے مقصود بالذات نہیں ہے لیکن اگر نہ کوئی مملکت رہے نہ اس کی فوج رہے نہ اس کے اختیار رہیں لیکن ایک سپاہی اپنی وردی لے کر اپنے گھر آجائے اور وہ ہر روز صبح اٹھ کر اسی طرح وردی پہنے بوٹ کے تسمے کسے بٹن بند کرے بندوق تو نہیں ہے اس کی بجائے ایک ڈنڈا ہی لے لے اور اسے لے کر گاؤں کی گلی میں لیفٹ رائٹ کرتا رہے وہی 45 منٹ کی جو پریڈ تھی وہ یہاں کرتا ہے التزاماً کرتا رہے باقاعدہ کرتا رہے تو سوچیے عزیزانِ من! کیا یہ اس غایت کو پورا کر رہا ہے جس کے لیے فوج کے سپاہی کی حیثیت سے اس سے یہ کچھ کرایا جاتا تھا؟ عزیزانِ من! فوج میں یہ کچھ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا یہاں یہ کچھ اس نے مقصود بالذات سمجھ لیا ہے۔ بس یہ فرق ہے دین اور مذہب میں۔ مذہب میں دین کے نظام کے ارکان وغیرہ قائم رکھے جاتے ہیں ان کی پابندی کرائی جاتی ہے۔ اُن مراسم کی پابندی کرائی جاتی ہے جن کی غایت اور مقصد سامنے نہیں ہوتا لیکن جب وہ نظام دین قائم ہوتا ہے تو یہی ارکان ہوں گے یہی صلوٰۃ ہوگی یہی اطاعت ہوگی یہی صیام ہوگا یہی الحج [1] ہوگا لیکن یہ ایک نظام کے پروگرام کے اجزا ہوں گے۔ یہ مقصود بالذات نہیں ہوں گے۔ نظامِ دین میں ایک جماعت کو ایک فرد کو اس کی ذات کی صلاحیت کی نشوونما سے ایک پوری جماعت کو اس کے اندر ایک ڈسپلن پیدا کر کے اس کے اندر اخلاق حسنہ پیدا کر کے انہیں اقدار کا پابند بنا کر بلند مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ بنایا جاتا ہے تو اِیَّـاکَ نَـعْبُـدُ (1:4) کے معنی کی تعبیر ابھرتی ہے۔ آپ ''تعبیر'' کا لفظ سامنے رکھیے کہ ایک وحشی جانور کو سدھایا جاتا ہے تا کہ وہ قاعدے اور

---

[1] اس کی مکمل تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ حج ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور 2005ء

قانون کے مطابق اپنی صلاحیتوں کو استعمال میں لائے' اپنے مقصد کے لیے نہیں بلکہ اس مقصد کے لیے لائے جو اس تربیت کا مقصود تھا۔ اچھا سدھایا ہوا گھوڑا بھی اگر آپ نے ٹانگے میں جوت لیا ہے اور آپ اسے ریلوے اسٹیشن کی طرف لے جانا چاہتے ہیں اور وہ سرکش ہو کر الٹی طرف ماڈل ٹاؤن کی طرف چل پڑتا ہے 'تو یہ بھی اس کا سدھانا' اس کی صلاحیتوں کا نشوونما پانا' اس غایت کو پورا نہیں کرتا' جو اس کا نصب العین سامنے رکھا گیا ہے' جو منزل اس کے سامنے رکھی گئی ہے' اس تک پہنچنے کے لیے' یہ تو ان صلاحیتوں کو نشوونما دینا ہے۔

یہ ہے عزیزانِ من! عبادت سے مفہوم' یہ ہے خدا کا عبد ہونا اور یہ ہے مقصد اس اعلان کا کہ اِيَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) ہم تیرے سوا کسی اور قاعدے قانون کی پابندی نہیں کرتے۔ یہ سورۃ الفاتحۃ کی چوتھی آیت کا پہلا ٹکڑا اِيَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) ہمارے سامنے ابھی آیا ہے۔ اگلا ٹکڑا وَاِيَّاکَ نَسْتَعِيْنُ (1:4) ہے۔ یہ ایک بات ہمیں اس سے اور آگے لے جاتی ہے۔ یہ موضوع بہت گہرا بھی ہے بہت وسیع بھی ہے۔ اس لیے ہم اسے اگلے درس پر اٹھا رکھتے ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ



چھٹا باب: سورۃ الفاتحۃ (آیت 4: وایاک نستعین)



عزیزانِ من! سابقہ درس سورۃ الفاتحہ کی چوتھی آیت کے پہلے ٹکڑے پر مشتمل تھا: اِیَّاکَ نَعۡبُدُ (1:4) اور آج کا درس اس کے اگلے ٹکڑے پر مشتمل ہوگا: وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ (1:4). ان الفاظ کا عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے: ''ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں''۔ یعنی اس پوری چوتھی آیت کا ترجمہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ ''تیری ہی ہم پرستش کرتے ہیں اور تجھ ہی سے ہم مدد مانگتے ہیں''، پرستش والی بات کے متعلق تو میں سابقہ درس میں بتا چکا ہوں۔ اسی میں عبادت کے مفہوم سے اس آیت کے پہلے ٹکڑے کی وضاحت واضح ہوگئی تھی۔ اب یہ جو ''تجھ ہی سے ہم مدد مانگتے ہیں''، اس میں آپ دیکھیے کہ مدد کے لیے عربی زبان اور قرآنِ کریم میں بہت سے دوسرے الفاظ بھی آئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہاں اس لفظ کا انتخاب کیوں کیا گیا ہے۔

قرآنِ حکیم کے ایک ایک لفظ کا انتخاب بذاتِ خود ایک ایسا اعجاز ہے کہ جس کا ترجمہ ممکن ہی نہیں

جیسا کہ میں بار بار بتاتا چلا آرہا ہوں کہ عربی زبان بڑی وسیع المعانی ہے جس میں ایک ایک چیز کے لیے سینکڑوں الفاظ آتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے اپنے مقاصد اور مطالب کے اظہار کے لیے ان متعدد الفاظ میں سے جن کا انتخاب کیا ہے، وہ بذاتِ خود قرآن کا اعجاز ہے۔ اس لیے قرآن نے جس مقام پر جس لفظ کو استعمال کیا ہے، دیکھنا یہ ہوگا کہ اس نے وہاں اسی لفظ کو کیوں منتخب کیا ہے۔ اگر یہ حقیقت سامنے آجائے تو نہ صرف یہ کہ اس سے متعلقہ آیت کا مفہوم واضح ہو جائے گا بلکہ اکثر وبیشتر قرآنِ کریم کی پوری کی پوری تعلیم یا اس کی غرض وغایت، حکمت کی ایک جھلک بھی، سامنے آجائے گی۔ یہ وجہ ہے کہ قرآنِ کریم کے الفاظ کے صحیح مفہوم کا سمجھنا ازبس ضروری ہے۔ ان الفاظ کے ترجمہ سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ پہلے بھی میں کہہ چکا ہوں ترجمہ تو ان الفاظ کا ہو ہی نہیں سکتا، دنیا کی کسی زبان میں بھی نہیں ہوسکتا۔

زیرِ نظر آیت کے پہلے حصے میں اِیَّاکَ نَعۡبُدُ (1:4) کہا گیا تھا۔ اس میں آپ نے دیکھ لیا تھا کہ عبدیت کے معنی ''اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو ضابطہ خداوندی کے مطابق صرف کرنا ہے''، اور تعبیر کا لفظ بھی آپ کے سامنے آگیا تھا جس کے معنی تھے ''ان

صلاحیتوں کونشوونما دینے کے بعد انہیں متعینہ قوانین اور قواعد وضوابط کے مطابق صرف کرنا' ان صلاحیتوں کی نشوونما کرنا اور اس کے بعد انہیں ان ساحلوں کے اندر رکھتے ہوئے' صرف کرنے سے نتیجہ نکالنا۔'' یہ ہم اس سے پہلے والے درس میں بتا چکے تھے۔ میں نے بتایا تھا کہ قرآن نے کہا ہے کہ یہ تمام چیزیں' تمہارے ایک مقصد کے بروئے کار لانے کے لیے ہیں' تمہارے فائدے کے لیے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس سے تمہاری منفعت کیا ہوگی؟ اس کے لیے کہا کہ اس سے تمہاری ذات کی نشوونما ہوگی اور اس میں اعتدال پیدا ہوجائے گا۔ میں نے کہا ہے کہ اس سے Developed and Balanced Personality (نشوونما یافتہ اور متوازن شخصیت) پیدا ہوجائے گی۔ ہر ایک فرد میں پیدا ہوگی اور ان افراد کے مجموعے سے جو نظام قائم ہوگا' وہ تمام عالمِ انسانیت کے لیے موجبِ فلاح و بہبود اور امن وسلامتی ہوگا۔ تو گویا اِیَّاکَ نَعۡبُدُ (1:4) کے اندر یہ بات مضمر تھی کہ ہم اپنی صلاحیتوں کی نشوونما چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ انہیں تیرے قوانین کے تابع صرف کریں گے۔ اس صرف کرنے سے جو چیز پیدا ہوگی وہ اس آیت کے اگلے دو الفاظ: وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ (1:4) میں ہے۔

سورۃ فاتحۃ کے لفظ ''نستعین'' کی وضاحت

وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ (1:4) میں ''نستعین'' کا مادہ ''ع و ن'' ہے۔ عربی زبان ''عوان'' اس جانور یا انسان کو کہتے ہیں جو بھرپور شباب کے عالم میں ہو' اس کی توانائیاں نشوونما پا چکی ہوں' اس شرط کے ساتھ کہ ان میں پورا پورا اعتدال بھی ہو۔ لہٰذا اس ''استعان'' کے معنی ہوں گے: ''اپنی ذات کے لیے پوری پوری نشوونما اور اعتدال کی آرزو کرنا اور اس مقصد کے لیے کسی کی مدد طلب کرنا۔'' اسی نہج سے اللہ تعالیٰ کو المستعان (21:112) کہا گیا ہے۔ ''استعان'' کے اس مفہوم کے بعد جب ہم وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ (1:4) کہتے ہیں' تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ''اے خدا! اے اللہ! ہم تجھ سے یہ چاہتے ہیں'' تو اس میں خدا سے چاہنا' طلب کرنا' اپنی آرزو کے پورا کرنے کے لیے اس سے کہنا' یہ تمام چیزیں اس استعان کے اندر آجائیں گی۔ اس سے آپ دیکھیے گا کہ فوراً آپ کے ذہن میں ''دعا'' کا لفظ آئے گا' دعا کا تصور آئے گا کہ ہم خدا سے ''دعا'' کرتے ہیں کہ ہم ایسے ہوجائیں۔

نستعین کے مفہوم سے پہلے لفظ دعا کی وضاحت کرنا ضروری ہے

جب تک دعا کا مفہوم سمجھ میں نہیں آئے گا اس وقت تک نہ صرف یہ کہ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ (1:4) کا مفہوم سمجھ میں نہیں آئے گا بلکہ قرآنِ کریم کی یوں کہیے کہ پوری کی پوری تعلیم سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اس کے متعلق عجیب قسم کے الجھاؤ پیدا ہوں گے' بعض اوقات کشمکش بھی پیدا ہوگی۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں سب سے پہلے دعا کا قرآنی مفہوم سمجھ لینا چاہیے۔ ممکن ہے میرے کہنے سے آپ احباب میں سے بعض کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ ان میں سے کون ہے جو ''دعا'' کو نہیں سمجھتا' دعا تو ہم ہر روز خدا سے مانگتے ہیں' یہ وہ

لفظ ہے جو اللہ کے ساتھ بار بار ہمارے ذہنوں میں' ہماری زبان پہ آتا ہے تو پھر اس کے لیے اتنی لمبی وضاحت کی کیا ضرورت ہے لیکن عزیزانِ من! جیسا کہ آپ پہلے دیکھ چکے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ جتنے بھی الفاظ اور اصطلاحات اس سے پہلے آئی ہیں' ان سب میں یہ بات تھی کہ ہمارے ذہنوں میں اس کے متعلق پہلے سے ایک مفہوم یا ایک تصور متعین تھا لیکن جب عربی زبان اور قرآنِ کریم کی رو سے اس کی وضاحت ہوئی تو یہ نظر آیا کہ ہمارا وہ تصور' نہ تو مفہوم کے اعتبار سے' نہ اسی زبان کے اعتبار سے صحیح تھا اور نہ ہی قرآن کی تعلیم کے اعتبار سے۔ ان تصورات میں ایک تبدیلی پیدا ہوئی' ایک انقلاب آیا اور اسی طرح سے آپ دیکھیں گے کہ جب ''دعا'' کا قرآنی مفہوم سامنے آئے گا تو اس سے بھی آپ کے قلب و نگاہ کے اندر ایک انقلاب پیدا ہو جائے گا۔

ہمارے ہاں ''دعا'' مانگنے سے عام مفہوم یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے کسی مقصد کے حصول کے لیے بارگاہِ خداوندی میں التجا کرتا ہے۔ اسی کو خدا کے ہاں سے مراد مانگنا بھی کہا جاتا ہے۔ دعا کے اس مفہوم کے خلاف جو شکوک پیدا ہوتے ہیں اور جو اعتراضات اُبھرتے ہیں 'میں پہلے انہیں سامنے لانا چاہتا ہوں۔ میں اتنا واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ دعا کے تصور یا مسئلہ کا تعلق تقدیر سے بھی ہے۔ اسے میں نے اپنی تصنیف ''کتاب التقدیر''[1] میں بھی تفصیل سے لکھا ہے اور پھر جستہ جستہ مقامات پر ''مطالب الفرقان''[2] کی اب تک چھپنے والی کتب میں بھی' اس کی بعض تفاصیل آئی ہیں لیکن اس درس میں چونکہ یہ بات پہلی دفعہ آئی ہے' اس لیے جو کچھ میں نے وہاں تفصیل سے لکھا ہے' اسے یہاں سمیٹ کر' ملخصاً' آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

لفظ دعا کے متعلق عام طور پر پایا جانے والا تصور اور اس سے پیدا ہونے والی صورتِ حال

میں نے ابھی ابھی یہ کہا ہے کہ جب دعا کا یہ مفہوم لیا جائے کہ ہم خدا سے کچھ مانگتے ہیں' کچھ چاہتے ہیں کہ وہ ہماری یہ طلب پوری کر دے تو اس کے خلاف کچھ شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ اعتراضات ابھرتے ہیں' سب سے پہلے میں انہیں سامنے لاتا ہوں۔ اگر عقیدہ یہ ہو کہ انسان کی زندگی میں جو کچھ ہونا ہے' اسے خدا نے پہلے سے لکھ دیا ہوتا ہے اور یہ قسمت کا لکھا اٹل ہوتا ہے تو پھر دعا کے کچھ معنی ہی نہیں رہتے۔ مثلاً ایک شخص کے متعلق اگر پہلے سے طے شدہ ہے کہ اس نے اتنے دن بیمار رہ کر مر جانا ہے' اب اس کے لیے وہ خود' یا اس کے

---

[1] کتاب التقدیر کا پہلا ایڈیشن اکتوبر 1971ء کو زیورِ طباعت سے آراستہ و پیراستہ ہو کر منظرِ عام پر آیا۔ اس میں ''خدا کا تصور'' کے لیے دیکھیے ص ص 35 تا 51' اور ''دعا'' کے لیے دیکھیے ص ص 359 تا 390 ''کتاب التقدیر'' میں دنیا کے مشکل ترین مسئلہ کا' قابلِ فہم' بصیرت افروز' حل موجود ہے۔

[2] اس سے مراد ''مطالب الفرقان'' کی پہلی 6 جلدیں سورۃ فاتحہ سے سورۃ ہود تک پرویزؒ (1985-1903) کی حیات میں ہی طبع ہو کر منظرِ عام پر آ چکی تھیں جبکہ اس سلسلہ کی ساتویں جلد جو سورۃ حجر تک کا مسودہ آپ کی زندگی میں ہی اکتوبر 1984ء میں بستر علالت پر فراش ہونے سے قبل مکمل ہو چکا تھا جو بعد میں پھر 1991ء میں شائع ہوا۔

متعلقین لاکھ دوائیں کریں، قسمت کے لکھے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ اس لیے کہ قسمت کے لکھے کے متعلق بھی تو عقیدہ یہ ہے کہ وہ خدا ہی کا طے کردہ، خدا ہی کا فیصلہ ہوتا ہے، خدا ہی نے تقدیر مقرر کی ہے، خدا ہی نے اس کی قسمت میں یہ لکھا ہے۔ اگر قسمت میں یہی لکھا ہے کہ ایک شخص اتنا بیمار رہے گا اور اس کے بعد مر جائے گا، تو پھر دوا کرنے سے کیا حاصل ہوگا اور اگر یہ کہا جائے کہ نہیں، دعا سے تقدیر بدل جاتی ہے تو پھر یہ عقیدہ غلط قرار پائے گا کہ قسمت کا لکھا اٹل ہوتا ہے۔ جو فیصلہ بدل سکتا ہے خواہ وہ دعا سے بدلے یا تدبیر سے، وہ اٹل نہیں کہلا سکتا اور اس کے ساتھ ہی اس عقیدہ کی رو سے خود اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی عجیب سا تصور سامنے آتا ہے کہ پہلے اس نے ایک بات کا فیصلہ کر دیا اور کہہ دیا کہ ہمارا یہ فیصلہ اٹل ہے۔ اس کے بعد وہ انتظار کرنے لگا کہ اگر اس شخص نے یا اس کے متعلقین نے ہم سے درخواست کی، تو ہم اپنا فیصلہ بدل دیں گے اور اگر یہ خاموش رہے تو وہ فیصلہ نافذ ہو جائے گا۔ سوچیے، عزیزانِ من! کہ خدا کے متعلق اس قسم کے تصور سے کس قسم کے اشکال پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ پہلے سے ہر بات طے شدہ نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ ہر معاملہ کا فیصلہ ساتھ کے ساتھ کرتا ہے تو اس سے اور بھی زیادہ پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔

عزیزانِ من! اس کی وضاحت ایک مثال سے کی جاتی ہے۔ مثلاً زید اور بکر کا باہمی مقدمہ ہے جس کا فیصلہ عدالت نے کرنا ہے۔ زید حق پر ہے اور بکر جھوٹا ہے۔ دونوں خدا سے دعا کرتے ہیں کہ فیصلہ اس کے حق میں ہو جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ ان دونوں کی دعا قبول نہیں ہوسکتی کیونکہ مقدمہ کا فیصلہ لامحالہ ایک ہی کے حق میں ہوسکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کس کی دعا قبول ہوگی۔ اگر کہا جائے کہ اس کی دعا قبول ہوگی جو زیادہ گڑگڑا کر دعا مانگے گا تو ہوسکتا ہے کہ بکر جو جھوٹا تھا، وہ زیادہ خشوع وخضوع سے دعا مانگے۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا اس کی دعا قبول کرے گا خواہ وہ حق پر نہ ہی ہو۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ نہیں، خدا اس کی دعا قبول کرے گا جو حق پر ہے یعنی زید کی تو اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر زید دعا نہ مانگتا تو پھر کیا ہوتا۔ پھر خدا بکر کا ساتھ دیتا کیونکہ اس نے دعا مانگی تھی اور زید نے دعا نہیں مانگی تھی۔ اس لیے اس نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس قسم کے اعتراضات وارد ہو رہے ہیں اور اگر کہا جائے کہ خدا بہر حال حق بات کا ساتھ دے گا تو اول تو یہ چیز واقعہ کے خلاف ہے، ہمارے ہاں عدالتوں سے آئے دن ایسے فیصلے صادر ہوتے رہتے ہیں جو حق کے خلاف ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ کئی بے گناہ پھانسی کے تختے پر چڑھا دیئے جاتے ہیں لیکن اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ خدا حق کا ساتھ دیتا ہے تو اس صورت میں دعا کا پھر کوئی مطلب نہیں رہتا۔ حقدار دعا کرے یا نہ کرے، خدا بہر حال اس کا ساتھ دے گا اور جو حق پر نہیں وہ لاکھ دعائیں کرے، خدا اس کی سنے گا ہی نہیں۔

دعا کے ساتھ تدبر کا عمل بھی

عزیزانِ من! اگر کہا جائے کہ خالی دعا نہیں بلکہ دعا کے ساتھ تدبیر بھی ضروری ہے اور دعا سے تدابیر کامیاب ہو جاتی ہیں تو اس سے

پھراور دشواری لاحق ہوجاتی ہے۔ مثلاً زیداور بکر دونوں تدبیر کرتے ہیں۔ بکراس کے ساتھ دعا بھی کرتا ہےاور زید دعانہیں کرتا تو کیا اس صورت میں بکر کی تدبیر کارگر ہوجائے گی کیونکہ اس نے دعا بھی کی تھی اور زید ناکام رہ جائے گا کیونکہ اس نے دعانہیں کی تھی۔ یہ ہیں وہ اشکال جو ہمارے ہاں کے مروّجہ عقائد کی رو سے دعا کے سلسلے میں ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے سامنے سورۂ بقرہ کی وہ آیت آتی ہے جسے دعااوراس کی قبولیت کے ضمن میں بنیادی طور پر پیش کیا جاتا ہےلیکن جس کا غلط مفہوم ان دشواریوں میں اور بھی اضافہ کر دیتا ہے۔

سورہ بقرہ کی آیت نمبر 2.186 کا مروجہ ترجمہ اوراس سے پیدا ہونے والی دشواری

اگر آپ کے پاس قرآنِ کریم کا نسخہ ہے، تو آپ اس آیت کو خود سامنے لے آیئے۔ وہ آیت ہے: **وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ط اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ** (2:186)۔ اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ''اے رسول! جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہہ دو کہ میں ان کے قریب ہوں۔ جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کو سنتا اور اسے قبول کرتا ہوں۔'' اس ترجمہ کی رو سے دشواری یہ پیش آتی ہے کہ ہم روز دیکھتے ہیں کہ مظلوم و مقہور، غریب و نادار، بے کس و بے بس، اور مصیبت زندہ لوگ، دن رات گڑگڑا کر خدا سے دعائیں مانگتے ہیں لیکن ان کی مصیبت رفع نہیں ہوتی، ان کی ساری عمر ظلم و ستم سہتے، مصیبتوں میں، کٹ جاتی ہے۔ لہٰذا اس امر واقع کی موجودگی میں یہ کس طرح تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ خدا ہر پکارنے والے کی پکار سنتا اور اس کی دعا قبول کرتا ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں عام طور پر کہہ دیا جاتا ہے کہ اللہ سنتا تو سب کی ہے لیکن کرتا وہی ہے جو دعا مانگنے والے کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کسی کی دعا قبول نہیں ہوتی تو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ جو کچھ ہوا ہے اس کے حق میں وہی بہتر تھا لیکن قطع نظر اس کے کہ ستم رسیدہ، مصیبت زدہ، برسرحق، مظلوم انسان کا اس سے حقیقی اطمینان نہیں ہوسکتا، بڑے دوررس نتائج کا موجب بن جاتا ہے۔ ایک مظلوم انسان، ظالم کی دست درازیوں کے خلاف خدا سے دعا کرتا ہےاوراس کے بعد دیکھتا ہے کہ اس کی حالت ذرا بھی بہتر نہیں ہوئی بلکہ اس مستبد ظالم کے ظلم میں اوراضافہ ہوتا چلا جارہا ہے تو مذکورہ بالا جواب کی رو سے اسے سمجھ لینا چاہیے کہ ظالم کا ظلم اس کے حق میں بہتر اور خدا کی منشا کے عین مطابق ہے، اس لیے اسے نہ اب اس کے مظالم کے خلاف لب کشائی کرنا چاہیے اور نہ ہی اس سے بچنے کی کوئی تدبیر سوچنا چاہیے۔

اس قسم کی غلط سوچ کا نتیجہ

غور کیجیے کہ اس قسم کے عقائد ظالموں کو کس طرح بدلگام چھوڑ دینے کا موجب بن جاتے ہیں۔ اس سے پہلے ان ظالموں کے خلاف

مظلوموں کے دل میں کم از کم انتقام کے جذبات تو ابھرتے تھے اور ہو سکتا تھا کہ وہ ان کے دست ستم سے محفوظ رہنے کی کوئی تدبیر سوچ لیتے لیکن اس عقیدہ کے بعد تو صورت یہ ہوگی کہ مظلوم نہ صرف ظلم و زیادتی کو دل کے پورے سکون کے ساتھ برداشت کرے گا بلکہ ظالم کے حق میں دعائے خیر بھی کرے گا کہ وہ اس کے لیے بہتری کے سامان پیدا کر رہا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ مستبد قوتیں، محکوموں، زیردستوں اور مظلوموں کے لیے کس کس قسم کے عقائد وضع کرتی رہتی ہیں تا کہ وہ انہیں ذبح بھی کریں اور یہ ان کے شکرگزار بھی ہوں۔

دعا کی قبولیت کے لیے خدا کے مقرب بندوں کے وسیلے کی تلاش

عزیزانِ من! اس سے بھی آگے بڑھیے تو یہ عقیدہ سامنے آتا ہے کہ خدا ہر ایک کی نہیں سنتا، وہ اپنے مقبول بندوں کی دعائیں قبول کرتا ہے۔ اس عقیدے کا نتیجہ ہے کہ آپ کو ہر حضرت صاحب کے آستانۂ عالیہ پر مصیبت زدہ اور آفت رسیدہ لوگوں کا ہجوم دکھائی دیتا ہے جو گڑگڑا کر ہاتھ باندھے اور اکثر ان کے پاؤں چومتے درخواست کرتے ہیں کہ یا حضرت! میرے لیے دعا کیجیے، ورنہ میں تباہ ہو جاؤں گا، برباد ہو جاؤں گا اور یہ سلسلہ حضرت صاحب کی زندگی تک ہی محدود نہیں رہتا، ان کی وفات کے بعد جسے یہ لوگ وفات نہیں بلکہ وصال کہتے ہیں، یعنی ان کا اپنے محبوب، خدا کے ساتھ جا کر مل جانا، تو ان کی وفات کے بعد، ان کے مزار شریف سے وابستہ ہو جاتا ہے، جہاں ان سے سجدوں میں گر گر کر التجائیں کی جاتی ہیں اور مرادیں مانگی جاتی ہیں۔ جب ان سے پوچھا جائے تو جواب میں کہا جاتا ہے کہ ہم گنہگار بندے ہیں، اس لیے ہماری خدا تک رسائی نہیں ہو سکتی، یہ حضرات مقربین بارگاہِ خداوندی ہیں، اس لیے خدا ان کی بات مانتا ہے۔ یہ عقیدہ بھی رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ قرآن کی وہ آیت بھی پڑھی جاتی ہے، جسے میں نے شروع میں بیان کیا ہے یعنی وَاِذَا سَأَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (2:186) جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہہ دو کہ میں ان کے قریب ہوں، میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ خدا کے مقربین کی وساطت سے خدا تک درخواست پہنچانے کا یہ عقیدہ، ہمارے دور ملوکیت کی تخلیق ہے۔ اس دور میں ذہنوں میں یہ بٹھایا گیا کہ **السلطان ظل اللہ علی الارض** یعنی بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس قسم کا سایہ زمین پر دیکھا گیا اسی قسم کی اس کی اصل آسمان پر تصور کر لی گئی۔ اس کی رو سے، خدا کا جو تصور سامنے آتا ہے، ظاہر ہے یہاں کے بادشاہوں کی طرح، وہ شہنشاہ حقیقی بھی ایک آمرِ مطلق سمجھا جاتا ہے، نہ کسی قاعدے کا پابند، نہ قانون کا: جسے چاہا پکڑ لیا، جسے چاہا نواز دیا، جسے چاہا بخش دیا، جسے چاہا باندھ لیا۔

اسی سلسلے میں بادشاہ کا دربار سامنے آیا جس میں سب سے پہلے حارس اور دربان کھڑے ملتے تھے، پھر اہل دربار میں سے مصاحب، امراء، وزراء اور پھر مقربین بارگاہِ سلطانیہ سامنے آتے تھے۔ کسی عام آدمی کے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اپنی درخواست براہِ راست سلطان المعظم تک پہنچا سکے۔ اس کے لیے اسے مقربین کے وسیلے کی ضرورت پڑتی تھی۔ آج بھی یہی حالت ہے۔ دفتروں کے باہر بیٹھے ہوئے

چپڑاسی (Peons) ہی ذریعے بنتے ہیں جس سے درخواست آگے جاتی ہے۔ بہرحال دورِ ملوکیت میں بادشاہ اور بادشاہ کے دربار کا اس قسم کا جو تصور سامنے آیا تو ہم نے یہی نقشہ دربارِ خداوندی کا متعین کر دیا۔ اس کی رو سے خدا تک بات پہنچانے کے لیے اس کے مقربین کی وساطت ضروری قرار پائی۔ یہ ہے وہ ضرورت جس کے پیش نظر خدا تک دعا پہنچانے کے لیے کسی حضرت صاحب کے وسیلے کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ ہماری درخواست بھی خدا تک پہنچاتے ہیں اور اس کے ساتھ سفارش بھی کرتے ہیں۔ اللہ ان کی بات مان لیتا ہے اور ہماری درخواست منظور ہو جاتی ہے۔ درخواست کے ساتھ کچھ نذر نیاز بھی دینی پڑتی ہے' بعینہٖ بادشاہوں کے حضور نذرانے گزارنا پڑتے ہیں یا ان کے مقربین کی خدمت کرنا پڑتی ہے۔

خدا کے متعلق ہمارا موجودہ تصور دورِ ملوکیت کا اور مرورِ زمانہ کا پیدا کردہ ہے

یہ ہے عزیزانِ من! خدا کا وہ تصور جو ہمارے شہنشاہیت کے زمانے میں' ہمارے ذہنوں میں مرتسم کیا گیا اور جس نے رفتہ رفتہ مصدقہ عقائد کی شکل اختیار کر لی۔ مرورِ زمانہ کے یہ عقائد اس طرح ہمارے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو گئے کہ اب اگر ان کے خلاف کوئی بات کہی جائے' تو اربابِ شریعت کی طرف سے اس پر کفر والحاد کے فتوے لگا دیئے جاتے ہیں اور دامانِ طریقت کے وابستہ افراد پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے کہ نہ معلوم حضرت صاحب کی طرف سے کیسا غضب نازل ہو جائے گا حالانکہ ان حضرات کے متعلق اللہ کا ارشاد ہے کہ عِبَادٌ اَمْثَالُکُمْ (7:194) وہ تمہارے ہی جیسے انسان' خدا کے بندے ہیں۔ اور جن مزاروں پر جا کر مرادیں مانگی جاتی ہیں یا انہیں خدا تک بات پہنچانے کا واسطہ قرار دیا جاتا ہے' ان کے متعلق کہا کہ تم انہیں لاکھ پکارو' وہ تمہاری بات ہی نہیں سن سکتے اور اگر بالفرض محال وہ سن بھی لیں تو اس کا جواب ہی نہیں دے سکتے (35:14)۔ تم انہیں جو کچھ پکار پکار کر کہتے ہو وہ اس سے قطعاً بے خبر ہوتے ہیں (46:5)۔ انہیں تو خود اپنے متعلق بھی اتنا علم نہیں ہوتا کہ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ (16:21) وہ کب اٹھائے جائیں گے۔ جو اپنے حال سے بھی بے خبر ہیں' وہ تمہاری کیا سنیں گے اور تمہاری کیا مدد کریں گے!!

دعا کے اس پیچیدہ مسئلے کا ایک نہایت شافی اور متضاد کیفیات سے ماوراحل

اب آیئے اس سوال کی طرف کہ دعائیں قبول کن لوگوں کی ہوتی ہیں اور کس طرح ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے اسی آیت کو لیجیے جس کا ایک حصہ ہم پہلے نقل کر چکے ہیں اور اس کی وضاحت میں' میں نے اتنا کچھ کہا ہے یعنی وہ آیت جس کے معنی تھے کہ جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہو کہ میں ان کے قریب ہوں' ہر پکارنے والی کی پکار کا جواب دیتا ہوں' اس کے بعد ہے کہ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ (2:186) ان سے کہو کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری مانگ پوری ہو' تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم میری راہنمائی' میرے قوانین کی صداقت پر' پورا پورا یقین رکھو اور میری اطاعت کرو' میری باتوں کا جواب دو' اس طرح کامیابی کا

صحیح راستہ تمہارے سامنے آجائے گا۔ تم اسے یہ کہتے ہو کہ میں تمہاری بات کا جواب دوں تو خدا سے یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ میں تمہاری بات کا جواب دوں' لیکن پہلے تم میری باتوں کا تو جواب دو۔

دعا کی قبولیت کے سلسلہ میں قرآن کا تفصیلی جواب

یعنی وہ یہ کہ میں نے جو کچھ تم سے کہا تھا' بتاؤ تم نے ان کے متعلق کیا کیا۔ کیا ان پر عمل کیا؟ کیا اس کے مطابق چلے؟ پہلے اس بات کا جواب دو تو پھر میں تمہاری بات کا جواب دوں گا۔ غور فرمایا' عزیزانِ من! اسی کی وضاحت میں دوسری جگہ کہا کہ یَسۡتَجِیۡبُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (42:26) دعائیں قبول ان کی ہوتی ہیں جو ایمان لائیں اور اعمالِ صالحہ کریں یعنی ایمان و اعمالِ صالحہ کا لازمی اور فطری نتیجہ کامیابی ہوتا ہے اور یہی دعا سے مقصود ہوتا ہے۔ ایک دوسرے مقام پر سورۃ المؤمن میں ہے کہ تم مجھے پکارو' میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا لیکن اتنی بات سن رکھو کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِیۡ سَیَدۡخُلُوۡنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیۡنَ (40:60) جو لوگ میری اطاعت سے سرکشی اختیار کریں گے' ان کی دعائیں قبول نہیں ہوں گی' وہ ذلیل وخوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔

جو کچھ میں نے ابھی تک جستہ جستہ مقامات سے کہا ہے' سورۂ آلِ عمران کی تین چار مسلسل آیتوں میں اسے نہایت وضاحت سے' تسلسل کے ساتھ' بیان کیا گیا ہے۔ پہلی آیت (3:189) ہے۔ میں آیت قرآنِ کریم سے پڑھتا ہوں اور اس آیت کا مفہوم اپنے ''مفہوم القرآن'' سے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں نے پورے قرآنِ کریم کا مفہوم مرتب کیا ہوا ہے' اس کا نام بھی ''مفہوم القرآن'' ہے۔ تو یہ جو آیت میں پیش کروں گا' اس کا مفہوم' مفہوم القرآن ہی سے پیش کروں گا۔ آیت یہ ہے اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ (3:190) جو لوگ عقل وبصیرت سے کام لیتے ہیں' ان کے لیے کائنات کی تخلیق' رات اور دن کی گردش میں قوانین خداوندی کی محکمیت اور ہمہ گیریت کی نشانیاں ہیں الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ وَ یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (3:191) ان صاحبانِ عقل وبصیرت اور اربابِ فکر ونظر کے لیے' جو زندگی کے ہر گوشے میں کھڑے' بیٹھے' لیٹے' قوانین خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں اور کائنات کے تخلیقی پروگرام پر غور وفکر کرتے رہتے ہیں' اور اپنی تحقیقات کے بعد علیٰ وجہ البصیرت پکار اٹھتے ہیں' کہ اے ہمارے نشو ونما دینے والے! تو نے اس کارگہۂ ہستی کو نہ تو عبث اور بیکار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لیے۔ تیری ذات اس سے بہت بلند ہے کہ تو کسی شے کو بے مقصد اور بلا غرض وغایت پیدا کردے۔ تو ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم علمی تحقیقات اور عملی تجارب کے بعد اشیائے کائنات سے صحیح صحیح فائدہ اٹھائیں اور اس طرح تباہ کن عذاب سے محفوظ رہیں۔ اب یہ ہے کہ رَبَّنَاۤ اِنَّکَ مَنۡ تُدۡخِلِ النَّارَ فَقَدۡ اَخۡزَیۡتَهٗ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ (3:192) جو قومیں اس قسم کی تحقیقات نہ کرنے

سے، اشیائے کائنات کی نفع بخشیوں سے محروم رہتی ہیں، ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس جاتی ہیں اور وہ ذلت وخواری کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی ذلیل وخوار قوموں کا کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرکے انہیں دنیا کی تباہی کے لیے استعمال نہ کیا جائے بلکہ نوع انسان کی ربوبیت عامہ کے لیے صرف میں لایا جائے۔ ایسا کچھ وہی قوم کرسکتی ہے جو خدا کی رہنمائی پر یقین محکم رکھے۔ لہٰذا ان اربابِ عقل وبصیرت کی پکار یہ ہوتی ہے کہ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِىْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ كَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ (3:193) اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم نے ایک پکارنے والے کو یہ کہتے سنا کہ ''آ ؤ! اپنے نشوونما دینے والے کے قانون کی صداقت پر ایمان لاؤ'' ہم نے اس کی دعوت پر لبیک کہا، اور خدا کے قانون کی صداقت پر ایمان لے آئے۔ اس کے بعد ان اربابِ علم وایمان کے سینے میں اس قسم کی آرزوئیں بیدار ہوتی ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم سے اگر کوئی بھول چوک ہو جائے تو اس کے مضرت رساں نتائج سے ہمیں محفوظ رکھنا اور ہماری چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں اور تدبیری ناہمواریوں کے اثرات مٹاتے رہنا۔ اور ہمارا انجام ان لوگوں کی رفاقت میں کرنا، جن کے سامنے زندگی کی وسعت اور کشادگی کی راہیں کھل چکی ہوں۔ اگلی آیت ہے کہ رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَ لَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (3:194) اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے ہم سے اپنے رسولوں کے ذریعے وحی کی رو سے، جن خوشگواریوں اور سرفرازیوں کا وعدہ کیا ہے، ان سے ہمیں بہرہ یاب کرنا۔ اور ایسا نہ کرنا کہ اعمال کے ظہورِ نتائج کے وقت ہم دنیا کی نگاہوں میں ذلیل وخوار ہو جائیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تو وعدہ خلافی نہیں کیا کرتا۔ تیرا ہر قانون صحیح صحیح نتائج مرتب کرکے رہتا ہے۔

عزیزانِ من! دعائیں مانگنے والوں کی خصوصیات کو بھی آپ نے دیکھ لیا اور ان کی دعاؤں کو بھی۔ اب خدا کی طرف سے اس کا جواب سنیے۔ جواب یہ ہے کہ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّىْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى (3:195) خدا نے ان کی دعاؤں کا یہ جواب دیا کہ ہم نے تمہاری دعاؤں کو سن لیا ہے لیکن تم یاد رکھو! ہم کسی کام کرنے والے کی محنت کو ضائع نہیں کرتے، وہ مرد ہو یا عورت، ہر ایک کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ دیتے ہیں۔ یہ ہوتا ہے، عزیزانِ من! خدا کی طرف سے دعاؤں کا جواب اور ان کی قبولیت کی شرط۔

مومنین کی دعاؤں کی قبولیت کے بعد انبیائے کرام کی دعاؤں کی قبولیت کی نوعیت اور غایت

یہاں تک تو بات عام مومنین کی تھی۔ حضراتِ انبیائے کرام □ کی دعاؤں کی قبولیت کی صورت بھی ملاحظہ فرماؤ کہ ان کی قبولیت کو خدا کن باتوں سے مشروط قرار دیتا ہے اور وہ کس طرح سے قبول ہوتی ہیں۔ دو تین مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔ حضرتِ نوح ◆ کے متعلق، جب ان کی قوم نے ان کی سخت مخالفت کی تو کہا کہ وَ لَقَدْ نَادٰنَا (37:75) نوح ◆ نے ہمیں پکارا اور اس کے بعد ہے کہ فَلَنِعْمَ

الْـمُجِیْبُوْنَ (37:75) اور ہم دعاؤں کا بہترین جواب دینے والے ہیں۔ ان کی اس دعا کا جواب کیا دیا گیا۔ ذرا غور سے سنیئے' جواب تھا کہ فَاَوْحَیْنَآ اِلَیْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْکَ بِاَعْیُنِنَا وَ وَحْیِنَا (23:27) ہم نے نوح ◆ کی طرف وحی بھیجی۔ اس سے کہا کہ تم اس آنے والے طوفان سے بچنا چاہتے ہو' حفاظت چاہتے ہو' اس کے لیے تم نے ہمیں پکارا تھا اور اس پکار کا جواب ہم تمھیں دیتے ہیں۔ اور وہ جواب یہ ہے کہ تم ایک کشتی بناؤ۔ ہوسکتا ہے تم کہو کہ یہ ایک نئی سی چیز ہے' مجھے کشتی بنانی نہیں آتی' ہم بتائیں گے کہ کشتی کیسے بنائی جاتی ہے' ہمارے زیرِ نگرانی کشتی بناؤ' ہماری وحی کے مطابق کشتی بناؤ' لیکن کشتی بناؤ۔ اس طوفان سے حفاظت کی صورت یہی ہے کہ تم کشتی بناؤ' کشتی کے ذریعے سے حفاظت ہوگی۔ آپ دیکھ رہے ہیں' عزیزانِ من! نوح ◆ نے پکارا۔ جواب ملا کہ فَلَنِعْمَ الْمُجِیْبُوْنَ (37:75) ہم بہترین دعاؤں کا جواب دینے والے ہیں اور جواب یہ دیا گیا کہ طوفان سے بچنا ہے تو اس کے لیے کشتی بناؤ۔

حضرت نوح کے بعد حضرت موسیٰ کا ذکرِ خیر اور پروگرام کی تکمیل کے لیے استقامت کی تاکید

آگے بڑھیے۔ جب حضرت موسیٰ ◆ سے کہا گیا کہ فرعون [1] کی طرف جائیں اور بنی اسرائیل کو اس کے پنجۂ استبداد سے نجات دلائیں تو انہوں نے اس مہم کی سختی اور اس میں پیش آنے والے خطرات کے احساس سے خدا سے متعدد تائیدی اسباب و ذرائع کی دعا کی تاکہ وہ ان کی تقویت کا موجب بنیں۔ حضرتِ موسیٰ ◆ نے خدا سے یہ کچھ مانگا' اس کے جواب میں کہا کہ قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَکَ یٰمُوْسٰی (20:36) اے موسیٰ ◆! جو کچھ تم نے مانگا ہے' تجھے عطا کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب خدا نے اس طرح کہہ دیا ہو کہ ہم نے تیری دعا قبول کر لی' تیری مانگ پوری کر دی' تو پھر کچھ کرنے کی ضرورت باقی ہی نہیں رہ سکتی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی ان سے کہہ دیا کہ اِذْهَبْ اَنْتَ وَ اَخُوْکَ بِاٰیٰتِیْ وَ لَا تَنِیَا فِیْ ذِکْرِیْ (20:42) تم دونوں بھائی موسیٰ ◆ اور ان کے بھائی حضرت ہارون ◆ فرعون کی طرف جاؤ اور یاد رکھو' جو پروگرام تمہیں دیا گیا ہے' اس کے بروئے کار لانے میں ذرا سی بھی سستی نہ کرنا۔ دعا کے قبول ہوجانے کی ضمانت بھی دی اور اس کے بعد یہ کہا کہ اسے تم نے بروئے کار لانا ہے اور اس میں ذرا سا بھی تغافل نہ برتنا' تساہل نہ کرنا۔ دوسری جگہ ہے کہ قَالَ قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُکُمَا فَاسْتَقِیْمَا وَ لَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِیْلَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ (10:89) خدا نے کہا کہ میں نے تمہاری دعا کو قبول کرلیا: فَاسْتَقِیْمَا اب تم اس پروگرام پر جم کر کھڑے ہو جاؤ اور یاد رکھو' کبھی ان لوگوں کا اتباع نہ کرنا جو حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔ غور فرمایئے' عزیزانِ من! ایک نبی سے کہا جا رہا ہے کہ تمہاری دعا ہم نے قبول کر لی اور اس قبولیت کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ جو پروگرام تمہیں دیا جاتا ہے اس پر جم کر کھڑے ہو جانا' تمہارے پائے استقامت میں ذرا لغزش نہ آنے پائے اور اس کے بعد تم دیکھو گے کہ تمہیں کامیابی نصیب ہو جاتی ہے۔ یعنی فقط ان کی کامیابی نہیں ہوسکتی یہ پروگرام ہے جس پر عمل کرنا ہے اور نہایت استقامت

---

[1] فرعون کے متعلق دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن' سورۃ بنی اسرائیل۔ ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004' ص 109 (فٹ نوٹ 1)

سے اس پر عمل پیرا ہونا ہے۔

جن لوگوں کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں ان کی عملی زندگی کی حالت

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا' عزیزانِ من! کہ جن دعاؤں کے متعلق یہ کہہ دیا گیا کہ ہم نے انہیں قبول کر لیا' ان کے سلسلوں میں بھی یہ تاکید کر دی کہ ان کی کامیابی کے لیے جن طبعی اسباب و ذرائع کی ضرورت ہے' انہیں باہم پہنچایا جائے اور اپنے پروگرام پر ثبات و استقامت سے عمل پیرا ہوا جائے' یہ نہیں کہ دعا مانگ لی' خدا نے جواب دیا کہ ہم نے قبول کر لی اور پھر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ اس قسم کی دعاؤں کے متعلق سورۂ رعد میں کہا گیا ہے اور بڑے ہی محاکاتی انداز سے کہا گیا ہے کہ تم ذرا اس پیاسے کا تصور سامنے لاؤ جو اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے دریا کے کنارے کھڑا ہے۔ کیا اس شخص کی پیاس بجھ جائے گی؟ اس کی پیاس کبھی نہیں بجھے گی۔ جو آگے بڑھ کر پانی سے چلو بھرے اور اسے پی لے' پیاس اس کی بجھے گی۔ پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر کھڑے رہنے سے قیامت تک پیاس دور نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے کہا ہے کہ وَ مَا دُعَآءُ الْکٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ (13:14) جو لوگ خدا کے اس قانون کی صداقت سے انکار کرتے ہیں ان کی دعائیں رائیگاں چلی جاتی ہیں۔ جو دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ کو پکارتا رہے' دریا کے کنارے پانی بہہ رہا ہے' کنارے پہ کھڑا ہے' دعا بھی مانگ رہا ہے' لیکن آگے بڑھ کر پانی نہیں پیتا۔ تو یہ کیا ہے؟ یہی کہ یہ خدا کے قانون سے انکار کر رہا ہے۔ خود پانی نہیں پی رہا۔ اس واسطے اس کی' پانی پینے کی یہ دعا' اس کی یہ طلب اور مانگ' قیامت تک پوری نہیں ہو سکتی۔

معاشرے کے مظلوم اور مصیبت زدہ لوگوں کے مصائب و آلام کے حل کے لیے نظام کی اہمیت اور اس کی افادیت

عزیزانِ گرامیِ قدر! اس مقام پر یہ کہا جائے گا کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ اپنی جگہ بجا اور درست لیکن سوال یہ ہے کہ کیا خدا کی خدائی میں مظلوموں اور مصیبت کے ماروں کی کوئی داد فریاد نہیں' ان کے دکھوں کا کوئی مداوا نہیں' ان کی پریشانیوں کا کوئی علاج نہیں' ان کی دعاؤں کا سننے والا کوئی بھی نہیں؟ قرآن ان سوالوں کے جواب میں کہتا ہے کہ ان کی دعائیں سنی بھی جاتی ہیں' قبول بھی کی جاتی ہیں' ان کی مدد بھی کی جاتی ہے' ان کے دکھ درد کو دور بھی کیا جاتا ہے لیکن اس کا طریقہ کچھ اور ہے۔ وہ طریقہ یہ ہے۔ اسے غور سے سنیے' عزیزانِ من! برس ہا برس کی محنت شاقہ اور تگ و تاز و پیہم کے بعد مدینے میں جماعت مومنین کی اپنی مملکت قائم ہو گئی لیکن جو مسلمان ہنوز مکے میں محصور تھے' قریش کی طرف سے ان پر مظالم کا سلسلہ شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا۔ اس انتہائی بے کسی اور مظلومیت کے عالم میں انہوں نے خدا سے دعا کی کہ بارِ الٰہا! ہماری مدد کر' اور ہمارے لیے ان ظالمین کے جور و ستم سے نجات حاصل کرنے کی کوئی صورت پیدا کر دے۔ انہوں نے خدا سے دعا کی اور آپ کو معلوم ہے کہ خدا نے کیا کیا؟ خدا نے وہاں کی جماعت مومنین سے کہا کہ وَ مَا لَکُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (4:75) اے جماعت مومنین! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں جنگ کے لیے نہیں اٹھتے۔ وَ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ

النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا (4:75) کیا تم سنتے نہیں ہو کہ مکہ کے مظلوم ومقہور' بے کس و بے بس' کمزور و ناتواں مرد عورتیں بچے کس طرح گڑگڑا کر ہم سے یہ فریاد کر رہے ہیں کہ بارِ الٰہا! ہمیں اس بستی سے نکال لے جس کے رہنے والوں نے اس قدر ظلم واستبداد پر کمر باندھ رکھی ہے۔ اے مملکت اسلامی کے علمبر دارو! کیا تم ان کی ان دعاؤں کو سن نہیں رہے اور اگر سن رہے ہو تو پھر انتظار کس بات کا ہے' ان کی امداد کے لیے اٹھتے کیوں نہیں' تم نہیں سن رہے کہ وہ ہم سے کس نالہ وزاری سے کہہ رہے ہیں کہ وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّ اجْعَل لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا [1] (4:75)۔ وہ ہم سے فریاد کرتے ہیں۔

خدا کے لیے کیا مشکل تھا کہ وہ براہِ راست ان کی امداد کر دیتا اور انہیں دشمنوں سے نجات دلا دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے اس مملکت سے' اس حکومت سے' اس نظام سے کہا جو اس کے نام پر اس کے قوانین کو نافذ کرنے کے لیے قائم ہوا تھا کہ کیا تم ان کی پکار کو سن نہیں رہے؟ اٹھو اور ان کی پکار کا جواب دو' ان کی مدد کے لیے آگے بڑھو۔ یہ ہے مظلوموں کی دعاؤں کے قبول ہونے کا صحیح طریقہ۔ یہی جماعت مومنین جو اب مدینے میں تھی' تیرہ برس تک قریش کے بے پناہ مظالم کا تختہ مشق بنی رہی۔ انہوں نے اس زمانے میں خدا سے کچھ کم دعائیں تو نہیں کی ہوں گی لیکن چونکہ اس وقت دنیا میں کوئی نظام ایسا نہیں تھا جو مظلوموں کی دادرسی کے لیے وجود میں آیا ہؤا اس لیے ان کی مدد کا کوئی سامان نہ ہو سکا۔ ان سے کہا جاتا رہا کہ ہمت واستقلال سے کام لے کر اپنے پروگرام پر جمے رہو۔ ایک دن تمہاری حکومت قائم ہو جائے گی تو ان تمام مشکلات کا حل خود بخود مل جائے گا۔ اس طرح تمہاری اپنی مشکلات ہی حل نہیں ہو جائیں گی بلکہ تم ان مظلوموں کی امداد کے قابل بھی ہو جاؤ گے جو ہم سے نصرت واعانت کی دعائیں مانگیں گے۔

دیکھیے اس حقیقت کو قرآنِ کریم نے دوسری جگہ کس بلیغ انداز سے بیان کیا ہے۔ فرمایا کہ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوْٓءَ (27:62) کہو کہ وہ کون ہے جو قلب مضطر کی دعائیں سنتا ہے اور ان کی مصیبتوں اور پریشانیوں کو دُور کر دیتا ہے؟ کس طرح دُور کر دیتا ہے' اس کے لیے کہا کہ وَ يَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ (27:62) وہ تمہیں حکومت ومملکت عطا کر دیتا ہے۔ یہ ہے طریق خداوندی جس سے مظلوموں کی مصیبتیں رفع ہوتی ہیں۔ آپ کو یہ معلوم ہی ہے کہ اس قسم کی حکومت بھی محض دعائیں مانگنے سے نہیں ملا کرتی۔ خدا نے یہ کہا تھا کہ یہ ایمان واعمالِ صالحہ کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ دوسرے مقام پر اسی جماعت مومنین کے متعلق کہا ہے کہ وَ الَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۠ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (42:38) یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے بلاوے پر لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں' اس کے احکام وقوانین کی پوری پوری اطاعت کرتے ہیں' انہی کی روشنی میں اپنے امورِ مملکت باہمی مشورے سے طے کرتے ہیں اور جو سامانِ زیست خدا نے انہیں دے رکھا ہؤا سے رفاہِ عامہ کے لیے کھلا رکھتے ہیں۔

---

[1] اور ہمارے لیے' اپنی جناب سے کوئی محافظِ نگران' کوئی سرپرست اور مددگار بھیج دے۔ (مفہوم القرآن از پرویزؒ)

آپ نے غور فرمایا کہ یہاں بھی وَ اَمۡـرُهُـمۡ شُـوۡرٰی بَیۡـنَهُـمۡ (42:38) سے اشارا اسی نظامِ مملکت کی طرف ہے جسے دنیا سے ظلم اور ناانصافی دور کرنے کے لیے متشکل کیا جاتا ہے۔ یہی وہ طریق تھا جس سے بنی اسرائیل کو قومِ فرعون کے مظالم سے نجات دلائی گئی۔

انسانی زندگی کی نفسیات پر معاشرتی خرابیوں اور نظام کی تباہ کاریوں کے اثرات کا نتیجہ

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ مظلوموں اور بے کسوں کو خدا سے دعا مانگنے کی ضرورت کہاں اور کب پیش آتی ہے؟ اس کی ضرورت اس غلط معاشرہ میں پیش آتی ہے' جہاں کوئی بات قاعدے اور قانون کے مطابق نہ ہوتی ہو' جہاں ہر جگہ دھاندلی ہو رہی ہو' جہاں حقدار کو اس کا حق نہ مل سکتا ہو' جہاں مظلوم کی مدد کرنے اور ظالم کا ہاتھ روکنے والا کوئی نہ ہو' جہاں اس شخص کا کوئی پرسانِ حال نہ ہو جو معاشرہ میں تنہا رہ جائے' جہاں غنڈہ گردی ایسی ہو کہ شریف انسانوں پر عرصہ حیات تنگ ہو جائے' جہاں افراتفری اور نفسانفسی کا یہ عالم ہو کہ جو کہیں اتفاق سے گر جائے سب اسے روندتے ہوئے آگے بڑھ جائیں' کوئی اس کے اٹھانے کی فکر نہ کرے' جہاں کسی کو اس کا خیال نہ ہو کہ کس کے بچے بھوکے ہیں اور کس کے تن پر کپڑا نہیں' جہاں مختلف مریض اس لیے بن آئی موت مر جائیں کہ ان کے پاس علاج کے لیے پیسہ نہیں تھا اور بیوہ ماں اپنے جوان بیٹے کی موت پر اس فکر میں گھلی جا رہی ہو کہ اس کا گور و کفن کیسے مل سکے گا اور اب میرا کیا بنے گا۔ یہ ہے وہ معاشرہ' جہاں بے کسوں اور ناداروں کو قدم قدم پر خدا سے دعائیں کرنا پڑتی ہیں کہ اس کے سوا ان کے سامنے امید کا کوئی اور سہارا نہیں ہوتا۔ یہی ہے وہ معاشرہ جس سے متاثر ہو کر کسی کہنے والے نے کہا تھا کہ

جو نہیں آشنا مصیبت کا　　درد و غم کا نہ جو شکار ہوا
جس پہ کوئی کبھی نہ وقت پڑا　　جو نہ اٹھ اٹھ کے رات کو رویا
وہ نہیں جانتا دعا کیا ہے
اسے معلوم کیا خدا کیا ہے

لیکن جب معاشرہ صحیح خطوط یعنی مستقل اقدارِ خداوندی پر متشکل ہو تو اس میں ہر بات کا فیصلہ قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا ہے' ہر حقدار کو اس کا حق ملتا ہے اور بغیر کسی پریشانی اور تردد کے ملتا ہے' نہ کسی پر کوئی ظلم ہوتا ہے نہ دھاندلی۔ اس میں ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی مملکت کی طرف سے پوری ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس لیے اس میں نہ کوئی محتاج ہوتا ہے' نہ بے نوا۔ اس میں نہ کوئی اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے' نہ بے سہارا۔ ایسے معاشرے میں کسی کو خدا سے وہ کچھ مانگنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی جس کے لیے ہم قدم قدم پر اپنے آپ کو محتاج اور لاچار پاتے ہیں اور خدا سے التجائیں کرتے ہیں۔

اس کسمپرسی اس محتاجی اور اس بیچارگی کے علاج کے لیے حضرت عمر فاروق کا فرمان

عزیزانِ من! اس حقیقت کبریٰ کو حضرتِ عمر فاروق ♦ (581-644/45AD) نے ایسے بلیغ اور عمیق انداز میں بیان کیا ہے کہ جوں جوں انسان اس پہ غور کرتا ہے' روح وجد میں آ جاتی ہے۔ **آپ نے فرمایا تھا کہ لوگوں سن رکھو مجھے خلیفہ کیوں بنایا گیا؟ مجھے خلافت کا فریضہ اس لیے سونپا گیا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو خدا تک پہنچنے سے روک دوں۔** اللہ اکبر! کتنی بلند حقیقتیں اس ایک جملے میں چھپی ہیں! کتنی بلند حقیقت ہے جسے اس قدر سادہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے! مطلب یہ کہ قیامِ خلافت کا مقصد یہ ہے کہ کسی ضرورت مند کی کوئی ضرورت رُکی نہ رہے۔ جب یہ ہوگی تو پھر کسی شخص کو اپنی ضروریات کے لیے خدا سے دعا کرنے کی حاجت ہی نہیں رہے گی اور اگر کوئی شخص اپنی کسی ضرورت کے لیے خدا سے دعا کرتا پایا گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں اپنے فریضے کی سرانجام دہی میں قاصر رہا ہوں اور وہ میرے خلاف گویا خدا سے شکایت کر رہا ہے۔ اس لیے مجھے فوراً احتساب خویش کرنا ہوگا اور اس امر کی کوشش کرنا ہوگی کہ میری شکایت بارگاہِ خداوندی تک نہ پہنچنے پائے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ضرورت مند کی ضرورت اس کے مانگنے سے پہلے ہی پوری ہو جائے۔ لہٰذا تم اپنی ضروریات اور اپنی احتیاجات کے لیے خدا سے براہِ راست دعا کرنے کی بجائے اسے مجھ تک پہنچایا کرو۔ یہاں وہ پوری ہو جائیں گی' تمہاری دعا کے خدا تک پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی' البتہ جب یہاں ضرورت پوری نہ ہوا اور اگر ایسا وقت آ جائے تو میں اس سے پیشتر اس خلافت کے منصب سے الگ ہو جاؤں گا۔ یہ ہوتی ہے' عزیزانِ من! اس معاشرہ کی کیفیت جو وحی کی رہنمائی میں متشکل ہوتا ہے۔ اس میں کسی کو اپنی انفرادی ضروریات کے لیے خدا سے کچھ مانگنا نہیں پڑتا۔ جسے سب کچھ از خود مل رہا ہو' اسے مانگنے کی ضرورت کیا ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں مومنین کی جس قدر دعائیں مذکور ہیں وہ اجتماعی ہیں' انفرادی نہیں ہیں اور یہ اجتماعی دعائیں مانگی ہی اس مقصد کے لیے جاتی ہیں کہ ان کے ہاتھوں سے وہ نظام قائم ہو جائے جس میں کوئی مصیبت زدہ مظلوم نہ ہو' جس میں عالم گیر انسانیت کے مصائب اور آلام کا علاج ہوتا چلا جائے گا۔ یہ ہیں وہ دعائیں جو جماعت مومنین خدا سے مانگتی ہے۔ اجتماعی دعائیں ایک فرد کے لیے نہیں اور یہ جو آیت ہمارے زیرِ نظر ہے' اس میں بھی کہا گیا ہے کہ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (1:4) ہم تجھ سے استعانت چاہتے ہیں۔

آخرکار سوال یہ کہ بیماری میں دعائیں کرتی کیا ہیں یا ان کا نتیجہ کیا نکلتا ہے

یہ سب کچھ کہنے کے بعد بھی ایک اہم سوال سامنے آتا ہے کہ دعائیں انفرادی ہوں' اجتماعی ہوں سوال یہ ہے کہ ان سے بالآخر ہوتا کیا ہے' ان کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور غور سے سمجھنے کے قابل۔ اس لیے کہ یہی وہ محور ہے جس کے گرد دعا کا سارا مسئلہ

گردش کرتا ہے۔ دعا سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کے ساتھ ہی جو کچھ قرآنِ کریم نے کہا ہے' اس کے معنی یہ ہیں کہ دعا کے بعد اس پروگرام پر عمل پیرا ہونا بھی ضروری ہے جس سے یہ مقصد حاصل ہوتا ہے۔ پھر اس میں جو''دعا'' درمیان میں آتی ہے اس کا مقصد کیا ہے' کیا وہ بیکار ہے؟

یہ بڑی اہم چیز ہے اور اسے غور سے سنیے کہ اس کی اہمیت کیا ہے؟ دنیا میں کوئی کام کرنا ہو' تو اس کے لیے سب سے پہلے ہمارے دل میں آرزو ابھرتی ہے۔ اسے پھر دہرا دوں کہ دنیا میں کوئی کام کرنا ہو' اس کے لیے سب سے پہلے ہمارے دل میں آرزو پیدا ہوتی ہے' ایک تقاضا بیدار ہوتا ہے۔ دنیا میں عمل کی بنیاد آرزو ہے۔ اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں

ما زِ تخلیقِ مقاصد زندہ ایم

دنیا میں ہر عمل کی بنیاد آرزو کی رہین منت ہوتی ہے

ہماری زندگی کا ثبوت یہ ہے کہ ہم مقاصد کی تخلیق کرتے چلے جائیں اور اس کے بعد

از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

ہماری زندگی میں نورانیت اور چمک اس سے پیدا ہوتی ہے کہ اس کے لیے آرزو بیدار ہو۔ یہ شعاعِ آرزو ہے کہ جس سے ہماری زندگی روشن ہوتی ہے۔ جس قدر یہ آرزو شدید ہوگی اسی قدر ہمارا ارادہ مستحکم ہوگا اور جس قدر ارادہ مستحکم ہوگا' اسی نسبت سے ہم اس مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد کریں گے۔

علامہ اقبالؒ (1877-1938) نے بچوں کے لیے ایک نظم [1] لکھی ہے جسے ہم ابتدائی مدارس (Schools) کے ہر طالب علم کی زبان سے ہر روز سنتے ہیں۔ اس کا پہلا شعر یہ ہے:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

دعا کے سلسلہ میں علامہ اقبال کی یہ نظم نفسیاتی تبدیلی کو بدلنے کی ایک بنیاد ہے

اس شعر کے پہلے مصرعے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ یوں تو بچوں کے لیے ہے لیکن اس میں جو حقیقت بیان ہوئی ہے' وہ بڑی عمیق ہے یعنی جب انسان کی دلی تمنا حروف اور الفاظ کی شکل میں زبان پر آتی ہے' تو اسے دعا کہا جاتا ہے: جتنی گہری تمنا' اتنی ہی مخلص دعا' جتنی

---

[1] اقبالؒ: بچے کی دعا (ماخوذ) بانگِ درا' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996' ص ص۔ 47-48

شدید آرزو اتنی ہی پر کیف پکار' دعا۔ نفسیات کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ آرزوؤں کی بیداری سے انسان کے اندر کس کس قسم کی نفسیاتی تبدیلی واقع ہوتی ہے پھر جس قسم کی وہ آرزو اسی قسم کی نفسیاتی تبدیلی۔ اس نفسیاتی تبدیلی سے انسان کا زاویہ نگاہ بدل جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ زاویہ نگاہ کی تبدیلی سے خارجی دنیا میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔

اقبالؒ ہی کے الفاظ میں ہے کہ

قیمت ہر شے زِ اندازِ نگہہ

ہر شے کی قیمت نگاہ کے انداز سے' ہے۔ نگاہ کا زاویہ بدل لو' اس کی دنیا بدل جائے گی

ہر شے کی قیمت آرزو کے بدلنے میں ہی مضمر ہے

ساری دنیا ''من'' کی دنیا ہے:

میں اب سمجھا کہ دنیا کچھ نہیں' دنیا مرا دل ہے
بدل جانے سے اس کے رنگ ہر اک چیز کا بدلا

دوسرے ایک شعر میں ہے کہ

نہ کلی ہے وجہ نظر کشی' نہ کنول کے پھول میں تازگی
فقط ایک دل کی شگفتگی' سبب نشاطِ بہار ہے [1]

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ انسان کی شدت آرزو سے اس کے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی (Psychological Change) پیدا ہو جاتی ہے جو اس کا اندازِ نگاہ بدل دیتی ہے اور اس کی آرزو میں جس قدر ارتکاز پیدا ہوتا ہے اسی قدر اس میں توانائیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہ جو اقبالؒ [2] (1877-1938) نے کہا تھا کہ ''عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام''، وہ شدت آرزو کی ہی پیدا کردہ توانائی

---

[1] پرویزؒ (1903-1985) نے اپنی کتاب ''انسان کے کیا سوچا؟ کے پہلے ایڈیشن میں خارج میں نہ بہار ہے نہ خزاں' نہ نغمہ ہے نہ فغاں' لکھنے کے بعد یہ شعر اسی طرح سے درج کیا ہے۔ سچ کہا تھا پروفیسر وائٹ ہیڈ نے اپنی کتاب Science and the modern world میں کہ' نہ پھول اپنی مشام جاں نواز کے لیے درخور تحسین ہے' نہ عندلیب اپنے نغمہ دل ربا کے لیے۔ اور نہ آفتاب جہانتاب اپنی نور افگنی کے لیے کسی تعریف و توصیف کا مستحق ہے...... اپنے قصائد کا ممدوح خود اپنے ''دل'(Mind) کو قرار دینا چاہیے۔ فطرت تو یکسر بے آب و رنگ واقع ہوئی ہے۔ نہ اس میں چنگ و رباب ہے' نہ رنگ و شباب۔ یہ سب کچھ ہمارے اپنے اندر ہے۔'' ''حواس (Senses) ذریعہ عمل'' میں ''دل (Mind) کی دنیا'' کے لیے انسان نے کیا سوچا؟ کے پہلے ایڈیشن کے صفحات 102 تا 104 پڑھیے۔

[2] بالِ جبریل: عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

کی رو سے ہوتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک آرزو کا معیار

آرزو کے سلسلے میں دو باتیں بنیادی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ آرزو کس قسم کی ہے؟ انسان کے دل میں مختلف آرزوئیں پیدا ہوتی رہتی ہیں لیکن قرآن مومن کے سامنے صحیح آرزو کا جو معیار رکھتا ہے' وہ یہ ہے کہ وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (81:29) تمہیں اس کا اختیار ہے کہ جو جی میں آئے' اسے چاہو' لیکن مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ وہی چاہے' جو خدا چاہتا ہے اور اس طرح اپنی آرزوؤں کو مشیت خداوندی سے ہم آہنگ رکھے۔ جس بات کو خدا نے برا قرار دیا ہے' تم بھی اسے برا سمجھو۔ جسے اس نے اچھا کہا ہے تم بھی اسے اچھا سمجھو۔ تم ویسا بننے کی کوشش کرو جیسا خدا چاہتا ہے کہ تم بن جاؤ۔

قرآنِ کریم کے متعلق اقبالؒ (1877-1938) نے کہا ہے کہ

آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

یہ تمہیں وہ کچھ بنا دے گا جو خدا چاہتا ہے کہ تم بن جاؤ۔ لہٰذا سب سے پہلے پہلا ضروری مرحلہ یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ جو آرزو ہمارے دل میں پیدا ہو رہی ہے' وہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگر یہ ویسی نہ ہو تو اسے تبدیل کر کے مستقل اقدار سے ہم آہنگ کر لینا چاہیے۔ تو اس کے اندر پہلی چیز تو یہ آئی۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ دل میں صرف آرزو کی بیداری سے مقصد حاصل نہیں ہو جاتا۔ آپ کسی جگہ جانے کا ارادہ رکھتے ہیں' آپ کے دل میں وہاں جانے کی آرزو بیدار ہوتی ہے۔ اب اس کے بعد اگر آپ اسی طرح گھر میں بیٹھے رہیں' تو آپ اس منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ پائیں گے۔ اس کے لیے اگر آپ کو ریل میں جانا ہے تو ریلوے ٹائم ٹیبل کنسلٹ کرتے ہیں' گاڑیوں کے اوقات دیکھتے ہیں' انکوائری والوں سے دریافت کرتے ہیں' پھر مقررہ وقت' اور مقررہ تاریخ پر گھر سے چلتے ہیں' اسٹیشن پر پہنچتے ہیں' ٹکٹ خریدتے ہیں' گاڑی کا انتظار کرتے ہیں' صحیح گاڑی میں بیٹھتے ہیں' جو گاڑی سامنے آ جائے اسی میں نہیں بیٹھ جاتے' جو گاڑی آپ کو منزلِ مقصود تک پہنچانے والی ہے اس میں بیٹھتے ہیں اور یہ وہ گاڑی ہے جو آپ کو منزلِ مقصود تک پہنچاتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ دل میں کسی جگہ پہنچنے سے یا آرزو کے بیدار ہونے سے' اور وہاں تک پہنچنے کے درمیان یہ جتنے مراحل آتے ہیں' وہ سارے اس پروگرام کا حصہ ہوتے ہیں کہ جس سے اس آرزو کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہی آرزو' ایسی آرزو ہے جو اس مقصد تک پہنچانے کے لیے دل میں اٹھے۔ یہ خدا نے مستقل اقدار کی رو سے آپ کے لیے' انسان کی اپنی ذات کی نشوونما اور عالمگیر انسانیت کی نشوونما کے لیے' مقرر کیا ہے۔ یہ آرزو بیدار ہو اور پھر اس کے لیے وہ تمام اسباب اور سامان اکٹھا کیا جائے جو اس کے لیے متعین کیا گیا ہے اور اس کی ہدایت کے مطابق اس گاڑی میں سوار ہوا جائے جو آپ کو اس منزلِ مقصود تک پہنچا دے گی۔

داخلی تبدیلی کے بغیر خارجی تبدیلی ممکن ہی نہیں

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ ''دعا'' سے انسان کے اپنے اندر ایک نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی کا پیدا ہونا بڑی اہم چیز ہے۔ کس قدر قابل رشک ہے وہ انداز' جس میں اقبال (1938-1877) نے اتنی بڑی' بلند' عمیق' دقیق حقیقت کو دو مصرعوں میں واشگاف کر دیا ہے! میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بلیغ اور دل کش انداز تصور میں نہیں آ سکتا۔ آپ بھی سنیے اور میری طرح وجد میں آ جایئے۔ وہ کہتا ہے کہ

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی

یہاں ''قضا'' سے مراد ''قانونِ خداوندی'' ہے:

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

کیا بات ہے! کیا کہہ گیا!! اسی کے ساتھ دوسرا شعر ہے کہ

تری دعا ہے کہ ہو آرزو تری پوری
مری دعا کہ تری آرزو بدل جائے

کہا کہ تیری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی' مگر اس سے یہ ممکن ہے' کہ تو بدل جائے اور یہ جو تبدیلی ہے کہ تو بدل جائے' وہ قرآنِ کریم کے اندر ڈوبنے سے یعنی اپنی آرزوؤں کو اس کے قوانین سے ہم آہنگ کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ قرآن کے متعلق اقبال نے کیا کیا کچھ کہا ہے!! کہ

چوں بجاں در رخت جاں دیگر شود

یہ جب دل کی گہرائیوں کے اندر اتر جاتا ہے تو جہاں دیگر شود۔ [1] اور انسان کے اندر جب وہ تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے تو خارج میں خود بخود تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ خارجی انقلاب آ ہی نہیں سکتا جب تک انسان کے اندر داخلی انقلاب پیدا نہ ہو اور یہ وہ حقیقت ہے جسے قرآنِ کریم نے بڑے ہی بلیغ الفاظ میں کہا کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (13:11) یاد رکھو! تم تو ایک طرف' ساری دنیا بھی زور لگا کر دیکھ لے کسی قوم کی حالت میں کبھی تبدیلی نہیں آ سکتی تاوقتیکہ اس قوم کے پہلے اندر نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا ہو۔ اس کی خارج کی تبدیلی کا دارومدار اس کی داخلی تبدیلی کے اوپر ہے' اس کی نفسیاتی تبدیلی کے اوپر ہے اور یہ ہے جو ''دعا'' سے حاصل ہوتی

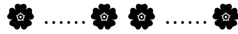
---

[1] دنیا بدل جاتی ہے۔

ہے۔اس چیز سے انسان کے اندر ایک داخلی تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔عزیزانِ من! یہ ہے دعا کی اہمیت اور غایت۔

میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ انسان کی ہر کوشش یا عمل کا آغاز اس کے دل میں پیدا ہونے والی خواہش یا آرزو سے ہوتا ہے۔یہی آرزو شدید ہو کر ارادہ بنتی ہے اور ارادہ کے مستحکم ہونے کے بعد اس مقصد کے حصول کے لیے قدم اٹھتا ہے۔قدم اٹھانے کا مرحلہ بڑا اہم ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی بڑا نازک بھی۔آپ گھر سے کسی جگہ جانے کا ارادہ لے کر نکلتے ہیں' اس جگہ پر پہنچنے کے لیے سب سے پہلی اور لاینفک شرط یہ ہے کہ آپ صحیح راستہ پر گامزن ہوں۔اگر آپ کا قدم غلط راستہ پر پڑ گیا تو آپ مسافت بھی طے کریں گے جس میں آپ کا وقت اور توانائی بھی صرف ہو گی لیکن آخر الامر ہو گا یہ کہ نہ صرف آپ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکیں گے بلکہ آپ اس سے بہت دور ہٹ چکے ہوں گے۔لہٰذا جب آپ نے وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (1:4) کہہ کر خدا سے منزلِ مقصود تک پہنچنے کی آرزو کا اظہار کیا اور اس کے لیے اس کے اعانت طلب کی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ نے سب سے پہلے یہ چاہا کہ اس منزل تک پہنچنے کا صحیح یا سیدھا راستہ آپ کے سامنے آ جائے۔اس کے لیے آپ کے دل کی آرزو یہ دعا بن کر آپ کے لبوں تک آئی کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (1:5) ہمیں اس سیدھے راستے کی راہنمائی مل جائے جو ہمیں منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔یہ سورۃ الفاتحہ کی اگلی یعنی پانچویں آیت ہے اور اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط



ساتواں باب: سورة الفاتحة (آیت 5)



عزیزانِ من! سابقہ درس میں ہمارے سامنے یہ حقیقت آئی تھی کہ انسان کے دل میں شدت سے ایک آرزو پیدا ہوئی' جو الفاظ بن کر اس کی زبان پہ آ گئی کہ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (1:4) ہماری آرزو' ہماری خواہش' ہماری طلب' ہمارا تقاضا یہ ہے کہ ہماری ذات مناسب نشوونما حاصل کر کے ایک Balanced Personality (متوازن شخصیت) بن کر سفر حیات کو اس طرح طے کرتی چلی جائے کہ وہ ارتقائی منازل میں سے گزرتی ہوئی اپنے انتہائی منزلِ مقصود تک پہنچ جائے۔ یہ بات بعد میں سامنے آئے گی کہ وہ آخری منزل کون سی ہے' وہ مقصد کیا ہے لیکن بہرحال اس دنیا کے اندر کامیابیاں اور کامرانیاں ہوں تو یہ بھی مقصد حیات ہوگا اور اس کے بعد کی زندگی میں انسانی ذات کی ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد کسی منزل تک پہنچ جانا' یہ بھی نصب العین حیات ہوگا تو اس دنیا میں ہو یا اس سے اگلی دنیا میں ہو' بہرحال راستہ طے کرنے کا تصور مشترک ہے اور لاینفک ہے۔ راستہ طے کیے بغیر آپ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ جب آپ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (1:4) میں یہ آرزو دل سے لب پہ لائے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری یہ ذات صحیح راستہ طے کرتے ہوئے منزلِ مقصود تک پہنچ جائے تو لازماً اس سے اگلی بات یہی آنی چاہیے تھی کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (1:5) ہماری آرزو یہ ہے کہ ہمارا قدم غلط راستے پر نہ اٹھ جائے۔ ہم سفر کے لیے تو اٹھے ہیں' ارادہ بھی کیا ہے' ہم نے تیاری بھی کی ہے' سامانِ سفر بھی ساتھ لیا ہے' چل بھی پڑے ہیں' لیکن ہماری آرزو یہ ہے' مقصد اب یہ ہے کہ ہمارا قدم کہیں غلط راستے پر نہ پڑ جائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ سیدھا راستہ ہمارے سامنے آ جائے جو ہمیں تمام خطرات سے محفوظ رکھتے ہوئے منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔

لفظ صراطِ مستقیم کا قرآنی مفہوم اور اس کی خصوصیت

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (1:5) کا عام ترجمہ یہی کیا جاتا ہے کہ ''دکھا ہم کو راہ سیدھی''۔ اب دیکھیے کہ اس میں ''اھدنا'' کے اندر ہے: ''دکھا ہم کو''۔ پھر وہی دعا کا مفہوم سامنے آ جاتا ہے اور دعا کا مفہوم ہم پہلے ہی سابقہ درس میں اچھی طرح واضح کر چکے ہیں اور یہ چیز بھی دیکھیے کہ اس میں ''اھدنا'' ہے۔ جمع کا صیغہ آیا ہے۔ ایک فرد صرف اپنے لیے نہیں چاہتا بلکہ وہ جمع کا صیغہ ہے۔ دعا میں

ہے کہ ہمیں سیدھی راہ دکھا' تو یہ نظر آیا کہ یہ انسانی زندگی' کارواں در کارواں ایک قافلے کی حیثیت سے' اجتماعی حیثیت سے' سفرِ حیات پر گامزن ہو تو پھر منزلِ مقصود تک پہنچ سکتی ہے۔ ایک فرد کا انفرادی طور پر سفر طے کرنے کا سوال نہیں ہے۔ اسی لیے کہا کہ **اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ** (1:5)۔ اہدنا (ہدایت) کا لفظ تو سارے قرآن میں بھرا پڑا ہے اور ہم روز سینکڑوں مرتبہ اس لفظ کو دہراتے ہیں۔ ہادی کے لفظ کو تو ہدایت سے لیا ہے۔ ہدایت کا مفہوم تو ویسے ذہنوں میں آ ہی جاتا ہے۔ ''رہنمائی'' اس کے لیے عام طور پر لفظ استعمال کیا جاتا ہے: ہماری رہنمائی کر' ہمیں راستہ دکھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ رہنمائی کرنا' راستہ دکھانا' اس لفظ کے بنیادی معانی میں ہے لیکن اس لفظ میں' جو قرآن نے منتخب کیا ہے' ایک خصوصیت ہے۔ صرف راستہ دکھانا نہیں ہے' بلکہ یہ ''رہنمائی' یہ راستہ دکھانا اس قسم کا ہونا چاہیے کہ جس سے وہ راہ' وہ منزل' ابھر کر سامنے آ جائے''۔ یہ اس کی بنیادی خصوصیت ہے: ''راستے کا ابھر کر سامنے آنا''۔ اسی لیے عربوں کے ہاں ''**هـــادية**'' اس کتاب کو کہتے تھے جو دُور سے ابھری ہوئی نظر آئے۔ جو مخفی ہو' چھپی ہوئی ہوں' جسے آپ کو خود تلاش کرنا پڑے' مشتبہ ہو' مشکوک ہو' ضمنی ہو' اسے ہدایت نہیں کہا جائے گا' بلکہ ہدایت کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ رہنمائی واضح' مبین' روشن' نمایاں اور ابھری ہوئی ہو۔ تو آپ دیکھیے کہ ایک لفظ کے انتخاب سے' اور اس کے بنیادی معانی کی خصوصیت سے' یہ رہنمائی کس طرح سے عام رہنمائیوں سے متمیز ہو کر' الگ ہو گئی۔ اس رہنمائی نے کسی قسم کے وہم وقیاس کو کوئی جگہ نہیں دی' بلکہ یہ ہے کہ وہ یقینی ہو' حتمی ہو' اس طرح جیسے دُور سے اُبھری ہوئی کتاب نظر آ جاتی ہے اور پھر اس میں آپ جانتے ہیں کہ اختلاف بھی کوئی نہیں ہوتا۔ کتاب ابھری ہوئی سامنے نہ ہو تو ہوسکتا ہے کوئی شخص کہے کہ وہ ادھر دائیں کی طرف ہے' کوئی کہے بائیں کی طرف ہے لیکن جب وہ دُور سے اُبھری ہوئی نظر آئے گی تو اس کے مقام کے تعین میں کوئی دو آراء نہیں ہوسکتیں' کوئی بات بھی ایسی نہیں ہوسکتی۔ ہر آنے والے کو متعین طور پر بتائے گا کہ وہ ہے اور ہر آنکھوں والا' ایک سمت بتائے گا' ایک ہی منزل بتائے گا۔ یہ وہی ہے کہ خدا کی طرف سے جو رہنمائی ملتی ہے' ایک تو وہ اتنی واضح' مبین' روشن اور ابھری ہوئی ہوتی ہے کہ اس کے تلاش کرنے میں کوئی دقت واقع نہیں ہوتی اور دوسرے اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جو بھی اس رہنمائی کو اختیار کرتا ہے' ان میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہوسکتا' تضاد نہیں ہوسکتا۔

دین میں اختلاف ہوتا ہی نہیں جبکہ مذہب کی بنیاد اختلافات پر ہی استوار ہوتی ہے

برادرانِ عزیز! دین میں اختلاف ہوتا ہی نہیں ہے۔ یہ تو مذہب ہے جس میں انسان خود اپنا راستہ تلاش کرتا ہے۔ مذہب کے معنی ہی راستہ ہوتے ہیں۔ وہ فرد تلاش کرتا ہے۔ ہر ایک کا الگ الگ مذہب ہوتا ہے' افراد کا بھی مختلف' اہل مذاہب کا بھی مختلف' اور اقوام کا بھی مختلف۔ دین میں کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا۔

دین میں خدا کی رہنمائی چٹان کی طرح اُبھری ہوئی سامنے آ جاتی ہے۔ خدا کی طرف سے ملنے والی رہنمائی کو اللہ تعالیٰ نے اپنی

ذمے داری قرار دیا ہے۔ عزیزانِ من! یہ اہم چیز ہمارے سامنے آ رہی ہے۔ خدا نے ہر شے کو پیدا کیا' اس کے لیے ایک راستہ تجویز کیا' اور کہا کہ یہ ہماری ذمے داری تھی کہ ہم اپنی مخلوق کو یہ راستہ دکھا دیتے جس پر چلنے سے وہ اس منزل تک پہنچ جاتی جو اس کے لیے متعین کی گئی تھی۔ چنانچہ سورۃ الاعلیٰ میں دیکھیے' جہاں رب (87:1) کا لفظ' ربوبیت کرنے والا' نشوونما دینے والا' کے معنوں میں آیا ہے۔ کہا ہے کہ اَلَّـذِیۡ خَـلَقَ (87:2) کیا لفظ ہیں' عزیزانِ من! غور سے سننے کی بات ہے' پھر سنیے کہا کہ اَلَّـذِیۡ خَـلَـقَ فَسَوّٰی o وَالَّـذِیۡ قَدَّرَ فَهَــدٰی (87:2-3) رب وہ ہے جس نے تخلیق کی ابتدا کی۔ یہ خلق ہے یعنی اس نے ہر شے کے حشو وزوائد کو الگ کیا' پھر اس میں توازن اور اعتدال پیدا کیا۔ یہ فســوّٰی ہے۔ پھر اس کے لیے پیمانے اور قوانین مقرر کیے' وہ نصب العین متعین کیا جس تک اسے پہنچنا ہے۔ یہ قدر ہے۔ قدر کے معنی ہوتے ہیں ''پیمانے مقرر کر دینا''۔ یہ لفظ قانون کے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ جسے خدا کی تقدیر کہتے ہیں' وہ میں آگے چل کر بتاؤں گا۔ یہ وہ قوانین ہیں جو اس نے وضع کیے ہیں' نافذ کیے ہیں اور پھر اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے اسے رہنمائی دی۔ یہ فھدی ہے۔ یہ ہیں چار الفاظ: خلق 'فسوی' قدر' فھدی. ان چار الفاظ میں ہر شے کے تخلیق سے لے کر اپنی آخری منزل تک پہنچ جانے کے پورے کے پورے مراحل آ گئے۔

ہر شے کی تخلیق کے بعد اس کی منزل کا تعین اور اس کی رہنمائی اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے

قرآن کریم میں دوسری جگہ یہ آیا ہے کہ رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡـطٰـی کُـلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰی [1] (20:50). اس میں دو باتیں ہیں۔ پہلی شے یہ ہے کہ اس نے ہر شے کو تخلیق کیا اور دوسری یہ کہ تخلیق عطا کرنے کے بعد' اس منزل کی طرف رہنمائی کر دی جس تک پہنچنا اس کے لیے مقصود ہے۔ یہ رہنمائی' کہ کسی شے نے کس طرح اپنی زندگی بسر کرنا ہے' خارجی کائنات میں ہر شے کے اندر موجود ہے۔ اسے ان اشیاء کی فطرت یا جبلت (Instinct) کہا جاتا ہے۔ مثلاً پانی کی فطرت ہے کہ وہ مائع شکل میں نشیب کی طرف بہے' ایک خاص درجہ حرارت پر پہنچ کر منجمد ہو جائے یا دوسری طرف اگر اس کو حرارت پہنچائی جائے تو ایک خاص درجہ حرارت پر بھاپ بن کر اڑ جائے۔ یہ پانی کی خصوصیت ہے۔ یہ ایسی خصوصیت ہے' جو پانی بدل ہی نہیں سکتا۔ کسی شے کی وہ خصوصیت جس میں تبدیلی ہی نہ آ سکے' اسے اس شے کی فطرت (Nature) کہتے ہیں اور فطرت ہر شے کے اندر موجود ہوتی ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ ہر شے اپنی اس فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ پانی کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ اگر اس کو مائع شکل کے اندر چھوڑ دیا جائے تو وہ نشیب کی طرف جانے کی بجائے بلندی کی طرف چڑھ جائے۔ اسے اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ خاص حرارت کے اوپر پہنچنے پر وہ بھاپ نہ بنے بلکہ برف بن جائے۔

---

[1] ہمارا رب' کسی خاص گروہ یا قوم کا رب نہیں ہے۔ ہمارا رب وہ ہے جو ہر شے کو پیدا کرتا ہے اور پھر اسے وہ راستہ بتا دیتا ہے (جس پر چل کر وہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتی ہے۔ انسانوں تک یہ راہنمائی وحی کے ذریعے آتی ہے' جسے لے کر ہم تمہارے پاس آئے ہیں)۔ (مفہوم القرآن)

وہ ان قوانین کی اطاعت پر مجبور ہے ۔لہٰذا فطرت وہ خصوصیت ہے جو غیر متبدل ہوتی ہے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے وہ شے مجبور ہوتی ہے۔

عزیزانِ من! اشیاء کی اس فطرت کی وضاحت یوں ہے کہ مثلاً بکری کی جبلت میں ہے کہ وہ گھاس کھائے اور گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ شیر کی جبلت ہے کہ وہ خون پیے اور گوشت کھائے اور جیسا کہ شاید میں نے پہلے بھی یہ مثالیں دی ہیں کہ آپ کسی مرغی کے نیچے مرغی اور بطخ کے انڈے سینے کے لیے رکھ دیں۔ جب ان انڈوں سے بچے نکلیں گے' تو بطخ کے بچے پانی کی طرف لپکیں گے اور مرغی کے چوزوں کو آپ پانی کی طرف لے جانا بھی چاہیں تو وہاں سے دور بھاگیں گے۔ بطخ کے بچوں کے اندر یہ رہنمائی ہے کہ انہوں نے پانی میں زندگی بسر کرنی ہے' مرغی کے چوزوں میں یہ رہنمائی ہے کہ انہوں نے خشکی پر رہنا ہے۔ یہ ان کے اندر پیدائش کے ساتھ موجود ہے۔ نہ انڈوں کے خول کے اندر کسی نے انہیں ان کی تعلیم دی تھی' نہ خول سے باہر آنے کے بعد انہوں نے کہیں سے یہ سبق حاصل کیا تھا۔ جونہی انہوں نے اس کائنات میں سانس لی' اس کے ساتھ ہی وہ جو ان کے اندر کی خصوصیت تھی' جس کے مطابق انہوں نے زندگی بسر کرنی تھی' اس کے مطابق ان کے قدم اٹھنے شروع ہو گئے اور پھر ہر بطخ کے بچے کے اندر یہ خصوصیت ہے کہ وہ پانی کی طرف لپکے۔ ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے' جیسا کہ میں نے کہا ہے' وہ مجبور ہوتے ہیں۔ لہٰذا انہیں یہ رہنمائی کہیں خارج سے حاصل نہیں کرنا پڑتی۔

قدرت نے کائنات کی ہر شے کی طرف رہنمائی کر رکھی ہے

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے اس رہنمائی کو بھی جو انہیں جبلی طور پر (Instinctively) ملتی ہے' وحی کہہ کر پکارا ہے۔ خارجی کائنات کے اندر وحی کے الفاظ' قرآنِ کریم کے مختلف مقامات پر آئے ہیں۔ مثلاً وَ اَوۡحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحۡلِ (16:68) شہد کی مکھی کی طرف وحی' وَ اَوۡحٰی فِیۡ کُلِّ سَمَآءٍ اَمۡرَهَا (41:12) اجرامِ فلکی کی طرف وحی' بِاَنَّ رَبَّکَ اَوۡحٰی لَهَا (99:5) زمین کی طرف وحی۔ اسی طرح سے ان اشیاء کے اندر جبلت (Instinct) کہ جسے ان اشیاء کی فطرت (Nature) کہا جاتا ہے' کے متعلق کہا کہ خدا نے وحی کے ذریعے' ان کے اندر یہ رہنمائی رکھ دی تھی' انہیں اس رہنمائی کے حاصل کرنے کے لیے کسی خارجی درس گاہ کی ضرورت نہیں ہے۔ کسی سے یہ رہنمائی حاصل کرنے کی احتیاج نہیں ہے' وہ اُن کے اپنے اندر ہے اور پہلے دن سے آخری دن تک رہتی ہے۔ وہ اس پر چلنے کے لیے مجبور ہیں۔

انسان کے لیے رہنمائی کی بنیادی تفصیل سورۃ بقرہ میں دے دی گئی ہے

انسان بھی مخلوقِ خداوندی میں شامل ہے۔ اُسے بھی اپنے ارتقائی منازل طے کر کے منزلِ مقصود تک پہنچنا ہے۔ اس کے لیے سفر

اختیار کرنا اور راستہ طے کرنا ہے۔ لہٰذا اس کے لیے بھی صحیح رہنمائی کی ضرورت ہے اور اس رہنمائی کا ذمہ بھی اسی خدا نے لے رکھا ہے جس نے اشیائے کائنات کو رہنمائی عطا کی ہے۔ چنانچہ اس کا ارشاد ہے کہ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى (92:12) انسانوں کو رہنمائی دینا بھی ہمارے ذمے ہے۔ دوسری جگہ حضرت ابراہیم ◆ کی زبان سے کہلایا گیا کہ رب العالمین وہ ہے کہ الذی خلقنی فھو یھدین (26:68) جس نے مجھے پیدا کیا اور وہی میری رہنمائی کرتا ہے۔ قصہ آدم کے ضمن میں جسے قرآن نے تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے اور جس کی تشریح آگے چل کر سورۃ البقرۃ میں ہمارے سامنے آئے گی۔ اس میں کہا گیا ہے کہ جب آدم سے جنت چھن گئی اور وہ مایوس ہو گیا کہ کیا معلوم میری بازآفرینی کی Possibility (اِمکان) بھی ہے یا نہیں، تو اللہ تعالیٰ نے اس سے کہا کہ تم مایوس نہ ہو۔ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:38) میری طرف سے تمہاری جانب رہنمائی آتی رہے گی، ان میں سے جو بھی اس کے مطابق راستہ طے کرے گا وہ بلاخوف وخطر منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا۔ ان آیات اور اسی قبیل کی متعدد دیگر آیات سے واضح ہے کہ انسان کی رہنمائی کا ذمہ بھی خدا نے خود لے رکھا ہے لیکن انسان کو اس رہنمائی کے عطا کرنے کی صورت کچھ اور ہے۔

انسان کے لیے رہنمائی کا طریق

اشیائے کائنات کی صورت میں خدا کی یہ رہنمائی ان کے اندر جبلی طور پر (Instinctively) رکھ دی گئی ہے۔ انسانوں کے سلسلے میں یہ صورت نہیں ہے۔ ان کے لیے ایک اور طریقہ اختیار کیا گیا۔ وہ طریقہ یہ تھا کہ خدا کی طرف سے یہ رہنمائی، جسے وحی کہا جاتا ہے، اس کے کسی برگزیدہ بندے کو عطا کی جاتی تھی، اسے نبی یا رسول کہہ کر پکارا جاتا ہے اور وہ اس رہنمائی کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتا تھا۔ انسانوں کو اس کا اختیار تھا کہ وہ اس رہنمائی کا اتباع کر کے بلاخوف وخطر منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں یا اپنے لیے دوسرا غلط راستہ اختیار کر کے تباہ و برباد ہو جائیں اور یہ ہے وہ نقطہ جہاں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انسانوں کے سلسلے میں یہ دوسرے قسم کا طریقہ کیوں اختیار کیا گیا۔ یہ بڑی اہم چیز ہے اور ایک بہت بڑی غلط فہمی کے ازالے کا ذریعہ بھی ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اشیائے کائنات کے اندر جو وحی رکھ دی گئی، جو رہنمائی رکھ دی گئی، وہ اس رہنمائی کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ انہیں اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ اس کو چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کر لیں۔ بکری بھوکی مر جائے گی لیکن گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گی۔ جنگل کے جانوروں میں انتہائی قوتوں کے مالک، شیر کے سامنے انگور کے خوشے بھی لٹک رہے ہوں گے تو وہ اس کی طرف نگاہ نہیں اٹھائے گا وہ بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر جائے گا، گوشت کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں کھائے گا۔ اس کے سامنے اب یوں سمجھیے، جو میں اصطلاحیں استعمال کر رہا ہوں، Two Possibilities (دو امکانات) نہیں ہیں، اس کے لیے ایک ہی راستہ ہے اور جب دو راستے ہوں گے ہی نہیں، تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اپنے اختیار و ارادے سے ایک راستہ اختیار کرے یا دوسرا اختیار کرے۔

اس کائنات میں اختیار وارادہ کی نعمت صرف اور صرف انسان کو ہی حاصل ہے

اشیائے کائنات میں اختیار اور ارادہ صرف انسان کو دیا گیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جب اختیار وارادہ دیا گیا ہو تو پھر اس کے سامنے Two Possibilities (دو امکانات) ہونے چاہئیں۔ اسے دوراہے (Cross-road) پہ کھڑا ہونا چاہیے کہ جہاں سے دو راستے پھٹتے ہوں۔ اختیار وارادے کے معنی یہ ہیں کہ وہ ان میں سے جونسا راستہ جی چاہے اختیار کرے۔ لہٰذا انسان کو مجبور نہیں پیدا کیا گیا کہ وہ ایک ہی راستہ ہے جسے اختیار کرے۔

انسانی فطرت کے متعلق دنیا بھر میں پایا جانے والا غلط تصور

اس سے ایک بڑی اہم بات سامنے آ گئی اور وہ ہے انسانی فطرت۔ ہم آئے دن انسانی فطرت (Human Nature) کا لفظ سنتے ہیں' یہ Human Nature (انسانی فطرت) ہمارے ہاں ہی نہیں دنیا بھر کے فلاسفرز کے ہاں یہ چیز ملتی ہے۔ فلاسفر میں حکمائے یونان کو فلاسفرز کا ابوالاباء سمجھا جاتا ہے۔ سقراط (C.469-399. B.C) ارسطو (C.384-322. B.C) افلاطون (C. 428-347 B.C) اور یہ تمام کے تمام حکمائے یونان سے لے کر آج تک کے فلاسفرز تک' سب Human Nature (انسانی فطرت) کے قائل چلے آتے تھے اور انسانی فطرت کو مانتے تھے اور کبھی کسی نے متعین نہیں کیا کہ انسان کی فطرت ہے کیا؟ اس لیے کہ فطرت تو اسے کہیں گے جو ایک ایسی خصوصیت ہو جو قابل تبدیل نہ ہو' جسے بدل نہ سکیں اور وہ خصوصیت اس نوع کے ہر فرد کے اندر ہو۔ ہر بکری کی ایک جبلت ہوتی ہے' ہر شیر کی ایک ہی جبلت ہوتی ہے۔ ان کی جبلتوں میں اختلاف نہیں ہوتا' لہٰذا ان کی فطرت ایک ہوتی ہے Human Nature یا انسانی فطرت کے کہنے سے مطلب ہی یہ ہوگا کہ باقی اشیائے کائنات کی طرح انسان بھی مجبور ہیں اور یہ چیز تو واقعہ کے خلاف ہے اور پھر دوسری چیز یہ ہے کہ جسے آپ فطرت یا (Instinct) جبلت کہتے ہیں وہ تو اس نوع کے ہر فرد میں یکساں ہونی چاہیے اور یہاں کیفیت یہ ہے کہ دو انسان بھی اپنی افتادِ طبع اور مزاج اور خیالات اور جذبات اور تصورات میں یکساں نہیں ملتے۔ ہر انسان دوسرے سے الگ ہوتا ہے۔ یہاں وہ فرد ہوتا ہے نوع نہیں ہوتا۔

عزیزانِ من! آپ غور کیجیے کہ اتنی بڑی بدیہی چیز جو اڑھائی ہزار سال سے دنیا کے بڑے بڑے دانش ور' فلاسفرز' حکما کو اس غلطی کے اندر مبتلا کیے ہوئے تھی تو قرآنِ کریم نے اسے کس طرح آسانی سے حل کر دیا۔ قرآنِ کریم میں فطرت کا یہ لفظ ان معنوں میں کہیں آیا ہی نہیں۔ وہاں انسانی فطرت کا کوئی ذکر نہیں۔ کتنی عظیم چیز ہے یہ! کہ قرآن نے دنیا بھر کے مفکرین سے بالکل الگ ایک چیز کہی کہ انسان کی کوئی فطرت نہیں ہے۔ قرآن کریم نے کہا کہ وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ [1] (90:10) ہم نے اس کے سامنے دونوں راہیں رکھ دیں

---

[1] اس کے ساتھ ہی ہم نے اسے وحی کے ذریعے' صحیح اور غلط راستے' ابھار اور نکھار کر دیئے ہیں۔ (انسانی ذرائع علم اور وحی کی روشنی۔ دونوں)

اور جب دوامکانات ہوں تو اس کی کوئی فطرت نہیں ہوسکتی۔ وہ صاحب اختیار وارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ عزیزانِ من! غیر مسلم مفکرین کے ہاں تو اب یہ انسانی فطرت کا لفظ شاید استعمال ہونا تھوڑا تھوڑا کم ہوگیا ہے۔ مگر ہمارے ہاں تو ہر ایک کی زبان پہ انسانی فطرت کا یہ لفظ ہے اور اس کے ساتھ ایک دوسری اصطلاح بھی ہے کہ اسلام دین فطرت ہے۔

انسانی فطرت کے عقیدہ میں پائے جانے والے تضادات کے مختلف پہلو

ہم روز یہ لفظ بولے جاتے ہیں اور یہ کوئی نہیں بتاتا' کوئی نہیں پوچھتا کہ صاحب! اس کے معنی کیا ہیں؟ دین فطرت کے کیا معنی ہیں؟ اس کے لیے نبی اکرم ﷺ کی وہ ایک روایت منسوب کردی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ وہ حضور کی روایت نہیں ہوسکتی۔ اس روایت میں کہا یہ جاتا ہے کہ ہر انسانی بچہ اسلام پر پیدا ہوتا ہے' اس لیے ہر انسان کی فطرت تو اسلام ہے لیکن اس کے جو ماں باپ ہیں' وہ اسے یہودی بنادیتے ہیں' نصرانی بنادیتے ہیں' مجوسی بنادیتے ہیں۔ اندازہ لگایئے پہلی چیز تو یہ ہے کہ اگر وہ اسلام پہ پیدا ہوتا ہے اور اسلام فطرت ہے' اسی سے اسلام کو دین فطرت کہا جاتا ہے تو اس کے بعد فطرت تو کہتے ہی اسے ہیں جو کوئی بدل ہی نہ سکے تو اس کے ماں باپ اسے اس اسلام کی فطرت سے الگ راستے کے اوپر کیسے چلا سکتے ہیں اور پھر دوسری بات یہ ہے کہ یہ جو انسان سے کہا جاتا ہے کہ اگر اس کی سوسائٹی کے' ماں باپ کے' معاشرے کے اثرات نہ ہوں تو وہ جس قسم کی زندگی بسر کرے گا وہ فطرت کے مطابق' فلہٰذا وہ اسلام کے مطابق ہوگی۔

انسانی فطرت کے تصور کے پیش نظر کیے جانے والے تجربات

ایسے تجربے ہوئے کہ ایک بچے کو اس کی پیدائش کے ساتھ ہی انسانوں سے الگ کردیا گیا یا وہ انسانوں سے کسی حادثے کی رو سے الگ ہوگیا۔ اکبر (1542-1605AD) کے زمانے میں تو کہا جاتا ہے کہ ایک تجربہ اس نے خود کر کے دیکھا تھا۔ ایک بچے کو پیدا ہونے کے ساتھ ہی ایسی جگہ رکھا' جہاں کوئی انسان نہیں تھا۔ اسے تو چھوڑیئے' تقسیم پاک و ہند سے پہلے کا ذکر ہے۔ انڈیا میں یعنی ہندوستان میں یوپی [1] کے کسی مقام پر جنگل میں شکاریوں کو ایک انسانی بچہ ملا' جو بھیڑیوں کے اندر رہتا تھا۔ وہ انسانی بچہ ان شکاریوں نے کسی نہ کسی طرح سے اپنے قابو میں کرلیا۔ وہ انسانی بچہ بالکل بھیڑیا تھا۔ وہ چار پاؤں پہ چلتا تھا' چیر پھاڑ کر کچا گوشت کھاتا تھا' وہ کوئی بولی نہیں بول سکتا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ ایں ایں کرتا تھا۔ اس میں کوئی انسانی خصوصیت ہی نظر نہیں آتی تھی۔ لہٰذا یہ کہنا کہ انسانی بچے کو اگر انسانی اثرات سے محفوظ رکھا جائے تو وہ جس قسم کی زندگی بسر کرے گا وہ الاسلام ہے' وہ دین فطرت ہے' تجربات اس کی تصدیق نہیں کرتے ہیں۔ یہ وجہ ہے

---

[1] اپر پردیس (UP)

جو میں نے کہا ہے کہ یہ نبی اکرم ﷺ کی روایت ہو نہیں سکتی کیونکہ یہ علم اور تجربے کے خلاف جاتی ہے اور قرآن میں فطرتِ انسانی کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ قرآن تو انسان کو صاحب اختیار اور ارادہ کہتا ہے۔ سوچیے کہ کیا وہ کبھی اس کی فطرت کا ذکر کرے گا؟

کیا اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے؟

عزیزانِ من! اور آگے بڑھیے۔ یہ کہتے ہیں کہ اسلام انسان کی فطرت ہے' اسلام دین فطرت ہے اور آگے کہا جاتا ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ اب انسانوں کو دیکھیے کہ وہ کیا کچھ کرتے پھرتے ہیں اور خود قرآنِ کریم میں انسانوں کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے کہ اگر انسانوں کو وحی کی رہنمائی نہ ملے تو وہ کس قدر جاہل ہیں۔ انسان کے متعلق قرآن کریم میں یہ ہے کہ اگر اس کی حالت پہ چھوڑ دیا جائے' وہ خدا کی رہنمائی قبول نہ کرے تو وہ کیا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا (4:28) بڑا کمزور واقع ہوا ہے۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (14:34) ظالم بھی واقع ہوا ہے کفر پسند اور ناشکر گزار بھی۔ هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ (16:4) بے حد جھگڑالو ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا (17:11) بڑا جلد باز واقع ہوا ہے وَ كَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا (17:100) انسان بڑا خود غرض' بخیل اور تنگ نظر واقع ہوا ہے۔ [1] اس کی کیفیت یہ کہ یہ بے صبرا بھی ہے اور ایسا لالچی کہ اس کا پیٹ ہی نہیں بھرتا' اس کے ساتھ یہ بھی کہ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا [2] (70:19) اور اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا [3] (33:72)۔ یہ کچھ کہا گیا ہے اور اس قسم کی دیگر آیات میں ہے کہ اگر انسان کو اس کی اپنی حالت پہ چھوڑ دیا جائے تو وہ اس قسم کا ہوتا۔ یہ تو وحی کی رہنمائی ہے' جس سے وہ انسان سطح کی زندگی پر آتا ہے۔ اگر وہ اس کا اتباع کرے گا تو پھر وہ انسان بنے گا۔ یہ وہی ہے جو غالب [4] نے کہا تھا کہ ''آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا۔'' آدمی کی وہ بات ہے' یہ آدمی کی وہ خصوصیات بیان ہوئی ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پہ پیدا کیا ہے' تو معاذ اللہ پھر خدا کی یہ فطرت ہمارے سامنے آئے گی۔ عزیزانِ من! یہ تمام تصورات بالبداہت غلط ہیں اور قرآن نے ان کی تردید کی ہے۔ جب انسان کو کہا کہ وہ صاحبِ اختیار و ارادہ ہے تو اس کے متعلق

---

[1] یہ تو حیات کی جاودانی کا تصور ہے جو انسان کی نگاہوں میں وسعت اور دل میں کشادہ پیدا کرتا ہے۔

[2] (انسان جب وحی کی راہ نمائی چھوڑ کر' حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتا ہے تو) وہ کس قدر تنگ دل' بھوکا اور بے صبرا ہو جاتا ہے۔ (مفہوم القرآن از پرویزؒ۔ ص 1359)

[3] یہ اس کی کتنی بڑی جہالت ہے' جس کی وجہ سے یہ خود اپنے آپ پر اس قدر زیادتی کرتا ہے۔ (اگر یہ بھی اشیائے کائنات کی طرح' لیکن بطیّب خاطر' وحی کے مقرر کردہ راستے پر چلتا جائے' تو اسے کسی قسم کا نقصان نہ ہو)۔ (مفہوم القرآن از پرویزؒ ص 985)

[4] مرزا اسد اللہ خاں غالب (1869-1797)

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا　　آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

قرآن نے بار بار یہی بات کہی ہے۔ بعض مقامات پہ کہا ہے کہ انسان کو Two Possibilities (دو امکانات) دیئے ہیں۔ قرآن نے اسے ''نجدین'' (90:10) کہا ہے۔ دوسرے مقام پہ ہے کہ ان کی طرف حق آ گیا: فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (18:29) پھر اس کا اپنا اختیار اور ارادہ ہے کہ جونسا راستہ جی چاہے اختیار کر لے۔ ہم نے یہ کہا ہے کہ اگر ہم چاہتے تو تمام انسانوں کو ایسا پیدا کر دیتے کہ ان میں کوئی اختلاف نہ ہوتا یعنی ان کے سامنے Two Possibilities (دو امکانات) نہ رکھتے لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ یہ ہماری مشیت کے خلاف ہے۔ ہماری مشیت انسان کو صاحب اختیار اور ارادہ بنانے کی تھی۔ یہ اس کے خلاف تھا کہ ہم جبراً اس کو ایک ہی نوع کا' ایک ہی فطرت کا' پیدا کرتے۔ سورۃ ھود میں ہے کہ وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ (11:118) اگر تیرے رب کی مشیت میں ہوتا' تو وہ تمام نوعِ انسان کو ایک گروہ کی طرح پیدا کر دیتا اور وہ آپس میں اختلاف نہ کرتے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس بات کے معنی ہیں کہ ہر انسان صاحب اختیار وارادہ ہے۔ یہ اختلاف کیسے رفع ہوں گے؟ یہ آگے چل کر بحث زیرآئیں گے۔ یہ ہدایتِ خداوندی کی رو سے رفع ہوں گے۔ نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا کہ وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا (10:99) خدا کی مشیت میں ہوتا تو کرۂ ارض پر بسنے والے تمام انسان ایک ہی راستے پر چلتے لیکن خدا نے ایسا نہیں کیا۔ کہا کہ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (10:99) اے رسول ﷺ! کیا تو انسانوں کو مجبور کرنا چاہتا ہے کہ وہ ایمان کی راہ اختیار کر لیں۔ ان آیات سے بھی واضح ہے کہ انسان کی کوئی فطرت نہیں' جس پر چلنے کے لیے اسے مجبور پیدا کیا گیا ہو۔ ہر انسانی بچہ ایک صاف اور سادہ لوح لے کر پیدا ہوتا ہے' جس پر وہ جس قسم کے نقوش مرتسم کرنا چاہے' کر سکتا ہے۔ اقبالؒ (1877-1938ء) کے الفاظ میں

تو اپنی سر نوشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

(ضربِ کلیم)

انسان کو صاحب اختیار بنانے کا مقصد عظیم

وحی خداوندی کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسان اس سلیٹ یعنی اپنی ذات پر اپنے اختیار وارادے سے وحی کی رہنمائی میں صحیح خطوط ونقوش مرتسم کرے۔

ان تصریحات سے یہ واضح ہے کہ صحیح راستے کی طرف رہنمائی انسان کے اندر نہیں رکھی گئی' یہ اسے خارج سے ملی۔ حضراتِ انبیائے کرام □ کی وساطت سے اس وحی کی رو سے جو پہلے ان انبیا کو دی گئی اور انہوں نے پھر اسے انسانوں تک پہنچایا۔ یہ تھا وہ طریق جو خدا

نے انسانوں کی طرف رہنمائی بھیجنے میں یا ان کو رہنمائی دینے کے لیے اختیار کیا اور جیسا میں نے عرض کیا ہے اختیار اس لیے کیا کہ انسان کے اختیار و ارادے کو خدا سلب نہیں کرنا چاہتا تھا' ان کو صرف بتانا چاہتا تھا کہ صحیح راستہ یہ ہے۔ اس راستے پہ زبردستی چلانا نہیں چاہتا تھا۔ زبردستی چلانا ہوتا تو اشیائے کائنات کی طرح اسے بھی مجبور پیدا کر دیا جاتا اور اس کے لیے صحیح راستے کی رہنمائی اس کے اندر رکھ دی جاتی۔ قرآن نے کہا کہ یہ رہنمائی وحی کے ذریعے دی گئی ہے جو قرآن میں محفوظ ہے۔ یہ وحی مکمل بھی ہے' غیر متبدل بھی ہے اور اس کے متعلق قرآنِ کریم میں جو آیا ہے اس پر غور فرمائیں۔ یہ طریقہ اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ انسان کے اختیار و ارادے کو سلب نہ کیا جائے۔ یہ چیز قرآنِ کریم کے بیشتر مقامات میں آئی ہے۔ ایک مقام پہ ہے کہ اِنَّآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالۡحَقِّ ۚ فَمَنِ اهۡتَدٰى فَلِنَفۡسِهٖ ۚ وَ مَنۡ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيۡهَا ۚ وَ مَاۤ اَنۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِوَكِيۡلٍ (39:41) ہم نے اس کتاب کو جو مبنی بر حقیقت ہے' اے رسول! تیری طرف نازل کیا ہے تاکہ نوعِ انسانی اس سے ہدایت حاصل کرے۔ ان سے کہہ دو کہ جو یہ ہدایت حاصل کرے گا اس کا فائدہ اس کی ذات کو ہوگا' جو دوسرے راستے اختیار کر کے گمراہ ہو جائے گا' اس کا نقصان بھی اسی کو ہوگا۔ اے رسول! تیرا کام اس رہنمائی کو ان لوگوں تک پہنچا دینا ہے' انہیں زبردستی اس راستے پر چلانا نہیں ہے کیونکہ تجھے ان پر نگران نہیں بنایا گیا۔ یہ بڑی چیز ہے۔ ایک رسول کا کام صحیح راستے کی طرف اشارہ کر دینا ہے' رہنمائی کر دینا ہے' بتا دینا ہے کہ کونسا راستہ کس طرف جاتا ہے۔ رسول کی ذمے داری یہ نہیں ہے کہ وہ جبراً لوگوں کو اس راستے کے اوپر چلائے۔ بار بار کہا گیا ہے کہ تو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا۔

صراط المستقیم کے ہر دو لفظوں کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! اب آگے چلیے۔ سورۃ الفاتحۃ میں اللہ تعالیٰ سے صراطِ مستقیم کی ہدایت چاہی گئی ہے' یعنی اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ (1:5) ان الفاظ کا عام طور پر ترجمہ ''سیدھا راستہ'' کیا جاتا ہے۔ سیدھا راستہ صرف لفظ ''صراط'' کا ترجمہ ہے۔ اگر اتنا ہی کہنا مقصود ہوتا تو صراط ہی کافی تھا لیکن یہاں تو ''الصراط'' کے ساتھ ''المستقیم'' (1:5) بھی کہا گیا ہے۔ ''مستقیم'' کا مادہ ''ق و م'' ہے' جہاں سے ''قیام'' کا لفظ آتا ہے۔ ''قیام'' کے معنی کھڑا ہونا ہے اور ظاہر ہے کہ کھڑا وہی شخص ہو سکتا ہے' جس کا توازن برقرار ہو۔ ذرا توازن بگڑ جائے تو نہ کوئی انسان کھڑا رہ سکتا ہے نہ کوئی اور چیز اپنے مقام پر قائم رہ سکتی ہے۔ توازن بگڑا اور گرا۔ اس میں ''مستقیم'' کے معنی ہوں گے: ''توازن بدوش راستہ'' ایسا راستہ جس میں اس قسم کے نشیب و فراز نہ ہوں کہ انسان چلے تو وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے' اس سے اس کے پاؤں میں لغزش آ جائے اور وہ گر پڑے۔ گویا راستہ سیدھا ہونا چاہیے اور توازن بدوش بھی۔ میں اس لفظ کا ترجمہ کیا کرتا ہوں: ''ایسا توازن بدوش یعنی متوازن ہونا چاہیے کہ اس میں چلتے وقت انسان کو لڑکھڑاہٹ نہ ہو' اس کا توازن نہ بگڑے اور وہ قائم و دائم آگے بڑھتا چلا جائے''۔ یہ ہے صراطِ مستقیم کہ اس راستے میں کوئی پیچ و خم نہ ہو اور وہ ہموار ایسا ہو کہ اس میں کوئی اونچ نیچ نہ ہو۔ یہ ہے وہ

سیدھا راستہ جس کے سامنے آنے کی تمنا دعا بن کے یوں زبان پر آئے۔

مثبت نظریات کی وضاحت کے لیے باطل نظریات کا تقابلی ذکر

اس سے ایک بہت اہم نکتہ سامنے آیا۔ جیسا کہ میں بار بار کہتا چلا آ رہا ہوں کہ الفاظ کے انتخاب میں قرآنِ کریم کا اعجاز مضمر ہوتا ہے۔ صراط کے معنی تو سیدھا راستہ ہی ہے لیکن اس راستہ کے سیدھا ہونے میں ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔ قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ جہاں اپنی طرف سے کوئی مثبت نظریات پیش کرتا ہے' وہاں ساتھ کے ساتھ غلط اور باطل نظریات کی تردید بھی کرتا جاتا ہے اور یہ دونوں باتیں ''الصراط'' (1:5) سیدھا راستہ' کے اندر پنہاں ہیں۔ غور کیجیے کہ وہ کس چیز کی نفی کرتا ہے اور کونسا راستہ ہے جس کے اوپر چلنے کی رہنمائی دیتا ہے؟ سیدھا راستہ یہ ہے جو بات ہو رہی ہے۔

انسانی سوچ کے تحت زندگی کی حرکت کے متعلق نظریہ دوری گردش

فکرِ انسانی نے زندگی کے متعلق جو تصور وضع کیا' اس میں زندگی کی حرکت کو ''دوری گردش'' (Cyclic) سمجھا گیا۔ یونان کے مفکرین نے جب اجرامِ فلکی پر غور کیا تو انہیں گول پایا۔ اس سے ان کے ذہن میں گولائی یا دائرہ کی عظمت قائم ہوگئی اور انہوں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ کائنات اور انسان کی زندگی کی حرکت دوری ہے۔ اس کے کیا معنی ہوئے؟ باالفاظ دیگر یہ معنی ہوئے کہ زندگی دائرے کے اندر گردش کر رہی ہے۔ دائرے کی صورت میں ہوتا یہ ہے کہ جس نقطہ سے کوئی شے حرکت کا آغاز کرتی ہے' پورا دائرہ طے کرنے کے بعد' وہ پھر اسی مقام پر آ پہنچتی ہے' آگے نہیں بڑھتی۔ کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی راستہ پر چکر کاٹتی رہتی ہے یعنی وہ مسافت تو طے کرتی ہے لیکن مسافت طے کرنے سے وہ کسی منزل کی طرف نہیں پہنچ رہی ہوتی' سفر کرتی رہتی ہے اور رہتی ہے اسی مقام کے اوپر۔ پورا چکر کاٹنے کے بعد اس کا ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتا بلکہ وہ پھر اسی مقام کے اوپر آ جاتی ہے۔ ساری عمر قیامت تک وہ اس دائرے سے چکر کاٹتی رہے وہ آگے نہیں بڑھے گی' اسی مقام کے اوپر حرکت کرتی رہے گی۔ یہ تو تصور تھا حرکت کے دوری ہونے کا (Cyclic Movement) کا۔ اس سے یونان کے فلاسفر فیثا غورث [1] نے تناسخ کا نظریہ (Transmigration of Soul) وضع کیا۔

انسانی سوچ کے تحت پروان چڑھنے والے نظریات کا ماحاصل

اس نظریہ [2] کی رو سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ انسان ایک جنم لے کر اس دنیا میں آیا' تو برائیوں' گناہوں کی آلائش سے ملوث ہوگیا۔

---

[1] Pythagoras (C. 580-500 B.C)

[2] مسئلہ تناسخ یا مسئلہ اواگون (Transmigration of Soul)

اس کی موت کے بعد اس کی روح کو کسی دوسرے پیکر میں پھر سے دنیا میں بھیجا جاتا ہے تاکہ وہ اس آلائش کو دور کر سکے۔ یہ عمل ایک آدھ پیدائشی چکر میں ختم نہیں ہوجاتا۔ اس کے لیے کروڑوں' اربوں چکروں یعنی نئے نئے جنموں میں سے گزرنا پڑتا ہے تاکہ انسان پھر سے اپنی پہلی ہیئت میں آجائے (Asyou were)۔ جب ایسا ہوتا ہے تو اس وقت یہ چکر ختم ہوجاتا ہے یعنی ان تمام گردشوں سے مقصد یہ ہے کہ انسان جیسا پہلے تھا اسی قسم کا پھر سے بن جائے۔ یہ ہے دَوری گردش کا منتہیٰ۔ زندگی کا یہ دوری تصور نظریہ تناسخ تک ہی محدود نہیں' مذاہب عالم میں نجات کا نظریہ (Theory of Salvation) اسی تصور کا پیدا کردہ ہے۔ عیسائیت نے کہا کہ ہر انسانی بچہ اپنی پیدائش کے ساتھ اپنے اوّلیں ماں باپ کے گناہ کے آلائش (Original Sin) لے کرآتا ہے۔ اس آلائش سے نجات حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ حضرتِ مسیحؑ کے کفارے (Atonement) پر ایمان لایا جائے۔ اس ایمان سے انسان پھر سے ویسا ہی پاک اور صاف ہوجاتا ہے جیسا پیدائش سے پہلا تھا۔ بالالفاظ دیگر اس میں بھی وہی بات کہی گئی ہے جو نظریہ تناسخ کی بنیاد تھی یعنی پھر سے ویسا ہی بن جانا جیسا پہلے تھا' کسی قدم کا آگے نہیں بڑھنا' چکروں میں سفر کیے چلے جانا اور پھر سے ویسا ہی بن جانا۔

نظریہ ''دوری گردش'' اور نظریہ ''تناسخ'' نے جہنم کو دھوبی کی بھٹی بنا رکھا ہے

جن مذاہب نے یہ دوری حرکت کا تصورِ حیات اختیار کیا' ان کے ہاں جہنم کی مثال دھوبی کی بھٹی سے دی جاتی ہے۔ یعنی کپڑا پہلے صاف ستھرا تھا' اس پہ میل کچیل جم گئی' داغ دھبے پڑ گئے' دھوبی کی بھٹی پہ چڑھایا' اس نے اس کی میل کو اور ان دھبوں کو الگ کیا' اور اس کے بعد کپڑا پھر ویسا ہی صاف ہوگیا جیسا پہلے تھا۔ اس طرح انسان کے پاک اور صاف ہوجانے کا نام نجات ہے۔ آپ نے دیکھا کہ یہاں بھی اسی دوری حرکت (Cyclic Movement) کا تصور کارفرما ہے یعنی اس اتنے طول طویل سفر کے بعد' پھر سے وہیں پہنچ جانا جہاں سے انسان چلا تھا (As you were)۔ یہ اہلِ شریعت کا تصور تھا۔ اہل طریقت نے یعنی اہل تصوف نے اس تصور کو ایک اور رنگ میں پیش کیا۔ ہندوؤں کی ویدانت کی رو سے کہا یہ گیا کہ انسانی روح یا آتما دھرما کی روح پرماتما کا جزو ہے۔ یہ جز اپنی اصل سے الگ ہوکر مادہ کی دلدل میں پھنس گیا ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ اسے اس آلائش سے پاک اور صاف کردیا جائے تاکہ یہ پھر سے اپنی اصل میں جا ملے۔ اسے نجات کہا جاتا ہے۔ اس کے لیے بڑے مشقت طلب مراقبوں کی' جاں کاہ ریاضتوں' بلکہ آرزوکی' مشقوں اور ایذائے خویش کی' روح پرساصعوبتوں کی' ضرورت ہوتی ہے۔ ❶

---

❶ ان نکات کی تشریح کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ النور' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006ء۔

یونان کے مفکرین کے علاوہ بدھ مت کا نزدان، یہودی تصوف اور عیسائیت کی رہبانیت کے بعد اسلامی تصوف کے غیر قرآنی تصورات کی تباہ کاریاں

بدھ مت کا نروان بھی کچھ ایسا ہی تصور پیش کرتا ہے۔ بدھ مت کا یہی نظریہ یہودی تصوف اور عیسائیت کی رہبانیت میں بھی سامنے آیا اور اس کے بعد آپ یہ سن کر متعجب ہی نہیں متاسف ہوں گے کہ وہیں سے مسلمانوں نے بھی اسے مستعار لیا اور اسے اسلامی تصوف کا نام دے دیا۔ یہی وہ نظریہ ہے جسے مولانا رومؒ [1] نے اپنی مثنوی کے پہلے شعر میں یوں بیان کیا ہے کہ

بشنو از نے چو حکایت می کنند
از جدائی ہا شکایت می کنند

یعنی بانسری اس لیے آہ وفغاں کرتی ہے کہ وہ اپنی اصل سے جدا ہوگئی ہے۔ اس کا یہ آہ و نالہ اس وقت ختم ہوگا جب یہ پھر سے اپنی اصل میں جا ملے گی۔ یہی زندگی کی تمام تگ وتاز کا ماحصل ہے۔ غالب کے الفاظ میں

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا [2]

اس طرح انسانی ذات کا ذاتِ خداوندی میں پھر سے جذب اور گم ہو جانے کا نام صوفیا کرام کی اصطلاح میں وصال کہلاتا ہے یعنی خدا کے ساتھ جا کر مل جانا۔ ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ زندگی کے متعلق دوری حرکت کا نظریہ (Theory of Cyclic Movement) کس کس قسم کے عقائد اور تصورات کو محیط ہے اور اس سے انسانی زندگی ہی نہیں بلکہ اس کے پیدا کرنے والے خدا کے متعلق بھی کس قسم کا تصور سامنے آتا ہے۔ تخلیق کائنات، انسان کی پیدائش، آسمانی سلسلہ رشد وہدایت، حضراتِ انبیائے کرام □ کی بعثت، غرضیکہ خدا کی طرف سے اس قدر وسیع وعریض پروگرام کی غایت صرف یہ ہے کہ انسان جیسا پہلے تھا پھر سے ویسا ہی ہو جائے۔ (As you were)

---

[1] مولانا جلال الدین رومیؒ 1207ء میں بلخ میں پیدا ہوئے۔ بچپن کا زمانہ نیشاپور میں گزرا اور خواجہ فریدالدین عطارؒ کے زیر تلمذ رہے۔ پھر قونیہ میں مستقل رہائش اختیار کی اور حضرت شمس تبریزیؒ کی صحبت میں تصوف کے منازل طے کیے۔ مولانا رومؒ وحدت الوجود کے قائل اور پیامبر ہیں۔ وحدت الوجود کا منتہیٰ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی جداگانہ ہستی کو ذاتِ باری تعالیٰ میں فنا کردے۔ یہ اصل سے الگ شدہ ذات، پھر سے اپنی اصل میں جا کر مل جائے۔ واصل بالحق ہو جائے۔ یہی اس کی انتہائی کامرانی ہے: عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا۔

[2] عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا (غالب)

قرآنِ حکیم کی تعلیم ان تمام تصورات کی نفی کرتی ہے

عزیزانِ من! اس قسم کا بے کار بے مقصد پروگرام کسی صورت میں بھی خدا کے شایانِ شان نہیں ہوسکتا۔ قرآنِ کریم نے ان تمام باطل تصورات کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ زندگی کی حرکت دوری نہیں بلکہ صراطی ہے۔ زندگی کا کارواں سیدھے راستے پر گامزن ہے، دائرے کے اندر چکر نہیں کاٹتا رہا۔ سیدھے راستے کا مطلب یہ ہے کہ یہ اپنے ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اس سفر کی غایت پھر سے وہیں پہنچ جانا نہیں، جہاں سے آغازِ سفر ہوا تھا۔ اس کا مقصد اس منزل تک پہنچنا ہے جو اس کے نقطہ آغاز سے بہت آگے اور بہت بلند ہے۔ زندگی کا سفر دوری نہیں، ارتقائی (Evolutionary) ہے۔ اس تگ وتاز کا مقصد مصیبتوں سے چھٹکارا پا کر یا آلائشوں سے پاک اور صاف ہوکر، پھر سے ویسا بن جانا نہیں، جیسا یہ پہلے تھا۔ اس کا مقصد پہلے سے کہیں زیادہ بہتر بن جانا، بلند مقام حاصل کرنا ہے۔ اسی بنا پر اس نے انسانی زندگی کا مقصد نجات (Salvation) نہیں، بلکہ Achievement (فوز) قرار دیا ہے۔ یہ To achieve something (کسی چیز کا حصول) ہے۔ اسے فوز وفلاح کہتے ہیں۔

فوز وفلاح کے پیشِ نظر قدم بقدم انسانی زندگی کی ارتقائی منزل دراصل رفعتوں کا حصول ہے

عزیزانِ من! آپ نجات (Solvation) اور فوز و فلاح (Achivement) دونوں لفظوں میں دیکھیے، فرق کتنا ہے۔ Salvation (نجات) کے معنی ہیں کہ انسان کسی مصیبت میں گرفتار ہے، وہاں سے نجات حاصل کرتا رہا۔ جیسا وہ اس مصیبت میں پھنسنے سے پہلے تھا، ویسا ہوجانا۔ یہ Salvation (نجات) ہے۔ اس کے برعکس قرآن زندگی کے تصور کے لیے لفظ فوز اور فلاح (Achievement) استعمال کرتا ہے۔ یعنی زندگی کے سفر کا مقصد کچھ حاصل کرنا ہے، کچھ مزید آگے بڑھنا ہے، کچھ بن جانا ہے۔

کسی ذات کو بھی ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا

قرآن کے اس تصور کی رو سے انسانی ذات، ذاتِ خداوندی کا جز نہیں، ذات ناقابلِ تقسیم وحدت (Indivisible Unit) ہوتی ہے، Personality (شخصیت) ناقابلِ تقسیم وحدت (Indivisible Unit) کا نام ہے۔ وہ اجزا میں بٹ ہی نہیں سکتی۔ جس شے کا کوئی جز الگ ہوجائے، وہ شے نامکمل رہ جاتی ہے، ناقص ہوجاتی ہے، اس سے وہ ذات، ذات ہی نہیں رہتی۔ لہٰذا انسانی ذات خدا کی ذات کا الگ شدہ حصہ نہیں۔ خدا نے انسان کو غیر نشو ونما یافتہ شکل (Undeveloped Form) میں ایک ذات عطا کی ہے اور انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ اسے نشو ونما دیتے ہوئے اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ مزید ارتقائی منازل طے کر سکے۔ یہ منزل اخروی زندگی میں سامنے

آتی ہے۔[1] آپ نے دیکھا کہ وہ غیر مذاہب ہوں یا غیر مذاہب کا ویدانت ہو‘ یا ہمارے ہاں کا اہل شریعت کا جہنم کا تصور ہو‘ یا اہل طریقت کا تصوف کا تصور‘ اس میں انسان کی زندگی کی غایت الغایت اس جیسا ہی ہو جانا ہے جیسا وہ پہلے تھا۔ تصوف کے متعلق میں آج کل ایک بڑی تحقیقاتی کتاب[2] مرتب کر رہا ہوں جس میں میں تصوف کی تاریخ دوں گا اور اس کے بعد یہ بھی بتاؤں گا کہ مسلمانوں میں تصوف کہاں سے آ گیا اور یہ کس طرح قرآنِ کریم کی تعلیم و پیغام بنا دیا گیا۔ بہرحال بات چلی تھی صراطِ مستقیم پر۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآنِ کریم میں جو صراطِ مستقیم پر چلنے کی ''دعا'' بتائی ہے تو اس سے اس نے انسانی زندگی کے منتہیٰ اور مقصود کے متعلق باطل نظریات کی بھی تردید کر دی ہے اور انسان کے سامنے ایک مثبت تعمیری پروگرام بھی رکھ دیا ہے جو اسے آگے بڑھاتے ہوئے بلندیوں کی طرف لے جائے گا۔ قرآن میں ہے کہ لَتَـرۡکَبُـنَّ طَبَـقًـا عَـنۡ طَبَـقٍ (84:19) تا کہ انسان درجہ بہ درجہ بلندیوں کی طرف ابھرتا چلا جائے۔ یہ ہے صراطِ مستقیم۔

پوری کی پوری کائنات صراطِ مستقیم کی طرف جانب منزل رواں دواں ہے

اب آگے بڑھیے۔ سورۃ ھود میں ایک بڑی عظیم آیت آئی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اِنَّ رَبِّـیۡ عَـلٰـی صِـرَاطٍ مُّسۡتَـقِیۡـمٍ (11:56)۔ اس کے عام معنی تو یہی ہیں کہ خدا بھی صراطِ مستقیم پر چل رہا ہے لیکن اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ پورا نظامِ کائنات قوانین خداوندی کے مطابق صراطِ مستقیم پر چلتا ہوا ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ انسانوں کی دنیا میں اس سیدھے اور متوازن راستے پر سب سے پہلے خدا کا رسول گامزن ہوتا ہے۔ اسی لیے حضور ﷺ کے متعلق فرمایا کہ اِنَّکَ عَـلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (43:43) اے رسول! تو بے شک صراطِ مستقیم پر چل رہا ہے۔ جماعت مومنین سے کہا گیا تھا کہ تم یہ مسلک اختیار کرو کہ اِیَّـاکَ نَعۡبُدُ (1:4) ہم صرف خدا کی محکومیت اختیار کرتے ہیں۔ اس کے بعد انہیں صراطِ مستقیم پر چلنے کا آرزومند بتایا گیا اور ان دونوں کو ملا کر کہا گیا کہ اِنَّ اللّٰہَ رَبِّـیۡ وَ رَبُّـکُـمۡ فَـاعۡبُـدُوۡہُ ؕ ھٰـذَا صِـرَاطٌ مُّسۡتَـقِیۡـمٌ (3:51)۔ اے رسول! ان سے کہہ دو کہ میرا اور تمہارا رب اللہ ہے‘ تم سب اسی کی عبدیت‘ محکومیت اختیار کرو۔ لہٰذا صراطِ مستقیم یہی صراطِ مستقیم ہے۔ اس سے واضح ہے کہ صراطِ مستقیم خدا کی محکومیت اختیار کرنے ہی کا دوسرا نام

---

1. باردیو (Nicholas Bardyeau) کے الفاظ میں ''موت انسان کا خاتمہ نہیں کرتی‘ وہ صرف خارجی دنیا (Human Body) کے وجود کا خاتمہ کرتی ہے۔'' (Slavery and Freedom)

2. اس کتاب کا نام ''تصوف کی حقیقت'' ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ستمبر 1981ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا۔ اب تک اس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں: (۱) تصوف اور اسلام (۲) تصور اور اقبال

ہے۔آپ نے دیکھا کہ قرآنِ مجید کس طرح خود آپ اپنی وضاحت کرتا چلا جاتا ہے۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ❶ (1:4-5)۔

''صراطِ مستقیم''اگر شاہراہ عظیم ہے تو اس تک پہنچنے کے لیے کئی ایک ''سبل'' بھی ہیں

صراطِ مستقیم کے سلسلے میں ایک اور نکتہ کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے۔صراطِ مستقیم جسے آپ شاہراہ اعظم' یعنی ہائی وے کہہ لیجیے' ایک ہی ہے۔یہی وہ شاہراہِ عظیم ہے جس کی طرف تمام انبیائے کرام کی وساطت سے راہنمائی ملتی چلی آ رہی ہے لیکن قرآنِ کریم نے اس کے ساتھ ایک اور لفظ بھی استعمال کیا ہے۔صراطِ مستقیم تو واحد ہے' ایک ہی ہے لیکن اس نے کہا یہ ہے کہ وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا (29:69) جو لوگ ہمارے راستے میں جدوجہد کریں گے' ہماری طرف آنے کے لیے کوششیں کریں گے' ہم انہیں اپنی طرف آنے کے ''سبل'' دکھا دیں گے۔''سبل'' تو سبیل کی جمع ہے اور ''سبیل'' کے معنی بھی راستے کے ہیں۔یہاں سے یہ ہوا کہ وہ جو ہماری طرف آنے کے لیے جدوجہد کریں گے' ہم انہیں راستے دکھا دیں گے۔یہاں یہ جمع کا صیغہ ہے۔یہ کیا معنی ہوئے؟ آپ شاہراہ کا تصور ذہن میں لائیے' کراچی سے چل کر پشاور تک جسے ہم گرینڈ ٹرنک روڈ (GTR) کہتے ہیں' وہ ایک سڑک ہے' شاہراہِ عظیم ہے' صراطِ مستقیم ہے' وہ مسلسل یہاں سے وہاں تک' پورے پاکستان کے اندر سے آخر تک' چلی جاتی ہے۔ظاہر ہے یہ جو کچھ لوگ اس سڑک کے دائیں بائیں قریب قریب رہتے ہیں لیکن یہ تو پورے ملک کے اندر سے ایک واحد سڑک گزرتی ہے جس کے دائیں اور بائیں دُور دُور تک آبادیاں پھیلی ہوئی ہیں۔اگر پاکستان کے اندر صرف یہی ایک سڑک ہو تو آپ سوچیے کہ اس کے دائیں بائیں دُور دراز مقامات پر جو رہنے والے لوگ ہیں' وہ کس طرح پشاور یا کراچی پہنچ سکیں گے؟ وہ کس طرح صراطِ مستقیم پر گامزن ہو سکیں گے؟ اگر یہاں سے وہاں تک آنے کے لیے کوئی راستے اور ہوں نہیں تو یہ تو پھر وہی گمراہی کی بات ہو جائے گی۔دوسری طرف یہ سوچیے کہ اگر کسی ملک میں صراطِ مستقیم یا شاہراہِ عظیم ہو ہی نہیں اور یہ چھوٹے چھوٹے راستے ہی صرف ہوں' تو وہ چھوٹے چھوٹے راستوں پہ چلنے کے بعد انسان کہاں جائے گا اور کہاں پہنچے گا۔لہٰذا لمبی مسافت کے لیے دونوں چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ایک تو وہ گرینڈ ٹرنک روڈ (GTR) شاہراہِ عظیم اور دوسرے وہ چھوٹے چھوٹے راستے' جو اپنی اپنی جگہ سے نکل کر اس صراطِ مستقیم میں آ کر مل جائیں۔چنانچہ اس نے سبل اور صراطِ مستقیم کے اس باہمی

---

❶ یہ نظام ان افراد کے ہاتھوں متشکل ہوگا' جو اس حقیقت کبریٰ کا اعلان اور عملاً اس اعلان کی تصدیق کریں گے کہ ہم خدا کے سوا کسی کی اطاعت اور محکومیت اختیار نہیں کرتے (3:78;12:40)۔اس کا عملی طریق اس کتاب عظیم (قرآن مجید) کے احکام واصول کی اطاعت ہے۔(5:44-48)۔یہ افراد (جماعتِ مومنین) جب سفرِ حیات کے لیے قدم اٹھاتے ہیں تو یہ حسین تمنائیں اور مقدس آرزوئیں' دعا بن کر لبوں تک آ جاتی ہیں کہ: بارِالٰہا! زندگی کا وہ سیدھا اور ہموار راستہ اُبھر اور نکھر کر ہمارے سامنے آ جائے جو ہمیں' بلا خوف وخطر' ہماری منزلِ مقصود تک لے جائے۔(مفہوم القرآن از پرویزؒ ص ص ا تا ب)

تعلق کوخود ہی واضح کر دیا ہے' جہاں کہا ہے کہ يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ يَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (5:16) اس قرآن کے ذریعے' وحی کی رو سے' اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی جو اس کے پروگرام کا اتباع کرتے ہیں' سبل السلام' سلامتی کے راستوں کی طرف رہنمائی کر دیتا ہے اور اس طرح وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتا ہے۔ یہاں اس نے ''سبل'' کہا ہے۔ یہ وہی ہے جو میں نے ابھی عرض کیا ہے جو سبیل کی جمع ہے اور اس کے معنی ''متعدد راستے'' ہیں اور اس کے بعد اگلی بات یہ کہی ہے کہ یہ جو متعدد راستے ہیں' یہ جو چھوٹے چھوٹے راستے چلے آ رہے ہیں' یہ بھی اسے تاریکیوں سے نور کی طرف لیے آ رہے ہیں اور آخر الامر یہ صراطِ مستقیم کے اندر آ کر مل جاتے ہیں۔

''سبل'' کے مفہوم کی مزید وضاحت

اس مثال کا مقصد اور مفہوم کیا ہے؟ اب دین تو شروع سے ایک ہی چلا آیا ہے لیکن اسے عملاً متشکل کرنے کے لیے' مختلف زمانوں میں' اس زمانے کے تقاضوں کے مطابق' طریق اور پروگرام مختلف رہا ہے۔ بالالفاظ دیگر خدا کی طرف سے عطا کردہ اصولی قوانین تو شروع سے غیر متبدل رہے ہیں اور رہیں گے لیکن ان پر عمل پیرا ہونے کے طریق سے زمانے کے تقاضے' ضروریات کے اعتبار سے' بدلتے رہیں گے۔ انہی کو سبل کہا جائے گا یعنی وہ پگڈنڈیاں جو آخر الامر شاہراہِ اعظم میں جا کر مل جاتی ہیں۔ اسی لیے اس آیت میں' جو میں نے ابھی تلاوت کی ہے' سبل السلام کے بعد کہا کہ وَ يَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (5:16) اس طرح خدا ان کی رہنمائی صراطِ مستقیم کی طرف کر دیتا ہے۔ یعنی دین کے نظام پر عمل پیرا ہونے کے لیے جو طریقے بھی اختیار کیے جائیں' ان کی غایت یہی ہو کہ وہ انسان کو اصل دین کی طرف لے جائیں۔

یہاں سے اسلامی نظام یا حکومتِ خداوندی یا اسلام کا سیاسی نظام' جو کچھ بھی اسے کہہ لیجیے' کی بنیادی خصوصیت واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں ایک چیز تو ہو گی صراطِ مستقیم' شاہراہِ اعظم' قرآنِ کریم میں بیان کردہ اصول واقدار جو غیر متبدل ہیں' جن میں کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی' انہی پر انہی کے مطابق' سفر کرنے سے انسان منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے لیکن زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کی رو سے ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے لیے جزوی قوانین بنائے جائیں گے۔ اسلامی حکومت اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزوی قوانین بنائے گی لیکن ان میں شرط یہ ہے کہ ایک تو وہ سبل السلام ہوں۔ وہ جزئیات' وہ چھوٹے راستے' وہ پگڈنڈیاں' وہ خود سلامتی کو لیے ہوئے ہوں۔ ان کے اندر فساد نہ ہو' ان کے اندر گمراہی کی کوئی بات نہ ہو۔ وہ بھی اسی اصول کے تابع چلیں جو اصول شاہراہِ عظیم کا ہے اور پھر وہ چھوٹے چھوٹے طریقِ کار' ان کے صحیح ہونے کا معیار' ان کے صحیح ہونے کا ٹیسٹ' یہ ہے کہ وہ صراطِ مستقیم میں آ کر مل جائیں۔ اگر دین کے مطابق عمل اختیار کیا گیا ہے تو وہ سبل السلام میں آئے گا' وہ انسان کو دین کی شاہراہ کی طرف لے کر آئے گا لیکن اگر وہ پگڈنڈیاں

ایسی ہیں' اگر وہ جزئیات ایسی ہیں جو ان کے خلاف جاتی ہیں تو ان پر سفر کرتے چلے جایئے' آپ کبھی بھی شاہراہِ عظیم تک نہیں آئیں گے۔ جو شاہراہِ عظیم ہے' اس میں ثبات ہے' وہ مستقل (Permanent) ہے' اور اس کی طرف آنے والے جو راستے' چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیاں' جو اس میں آکر مل جاتی ہیں' یہ زمانے کے تقاضے کے مطابق بدلنے والی دین کی جزئیات ہیں' جو اسلامی مملکت اپنے اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق وضع کرے گی۔ یہ جزئیات بھی نہایت ضروری ہیں۔ یہ نہ ہوں تو اس کلیے تک پہنچا ہی نہیں جا سکتا' اس پر عمل پیرا نہیں ہوا جا سکتا اور یہ شاہراہِ عظیم بھی ضروری ہے کہ اگر غیر متبدل سڑک یا راستہ موجود نہ ہو تو آپ کبھی یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ہم منزلِ مقصود تک پہنچنے والے راستے پر گامزن ہیں۔ یہ ہے عزیزانِ من! الصراطِ مستقیم اور سبل کا باہمی تعلق' جسے اقبالؒ (1877-1938ء) Permanent and Change (ثبات وتغیر) کا امتزاج بتاتا ہے۔ سبل السلام یعنی سلامتی کے راستوں سے ذہن میں ایک اور نکتہ بھی آ جاتا ہے۔ یہ تو سورۂ الفاتحہ ہے جس کے درس آپ کے سامنے پیش ہو رہے ہیں۔

''متقی'' کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے حضرت عمر ♦ کی نگاہ بصیرت اور طرزِ بیان

اس سورۃ کے بعد قرآنِ کریم کی جو پہلی سورت آتی ہے وہ سورۃ البقرۃ ہے اور اس کا آغاز' آپ کو معلوم ہے' اس طرح سے ہوتا ہے کہ الٓمّٓ o ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛ صلے فِیْهِ ۛ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ (2:1-2) یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کا شک وشبہ اور اضطراب نفس نہیں ہے اور اس کی غایت هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ (2:2) ہے۔ ترجمہ اس کا کیا جاتا ہے کہ یہ ''ہدایت ہے واسطے متقیوں کے''۔ اس پر اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو لوگ پہلے سے ہی متقی ہیں' انہیں ہدایت کی ضرورت کیا ہے اور اگر یہ متقیوں کے لیے ہدایت ہے تو جو لوگ متقی نہیں ہیں' انہیں اس سے کیا فائدہ ہوا۔ آپ نے غور کیا کہ ایک لفظ کے غلط ترجمے سے یا غیر واضح ترجمے سے بات کہاں تک جا پہنچی ہے۔ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ (2:2)۔ اب سوال یہ ہے کہ متقین کے معنی کیا ہیں؟ کہا جائے گا کہ یہ تقویٰ ہے۔ اور متقی پرہیزگار کا تو مفہوم ہمارے ذہن میں فوراً آ جاتا ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ یہ کتاب (قرآنِ کریم) هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ہے۔

عربوں کے ہاں متقی کس کو کہتے تھے؟ اور یہ لفظ کہاں بولا جاتا تھا؟ ذرا غور سے سنیے۔ حضرت عمر ♦ (581-644/45AD ء) سے ایک مرتبہ دریافت کیا گیا کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ ہدایت ہے متقیوں کے لیے۔ کیا پہچان ہے اس بات کی کہ یہ ان کے لیے ہدایت ہے؟ آپؓ نے کہا کہ کبھی تم کسی ایسی پگڈنڈی سے گزرے ہو' جہاں راستہ ہو چھوٹا سا چوڑا' اور دائیں بائیں خاردار جھاڑیاں ہوں۔ اس راستے سے تم نے گزرنا ہو۔ آپ عربوں کا لباس تو جانتے ہیں۔ انہوں نے تو لباس کے ٹینٹ پہنے ہوئے ہوتے ہیں' ادھر اُدھر اتنے لمبے چوڑے گھیرے کے لباس ہوتے ہیں۔ آپؓ نے پوچھا کہ تمہیں اس راستے پہ چلنا ہو' تو ان کانٹوں سے بچنے کے لیے کیا کرتے ہو؟ اُس نے کہا کہ لباس کو ہم کبھی اِدھر سے سمیٹتے ہیں اور کبھی اُدھر سے سمیٹتے ہیں۔ ان کانٹوں سے بچتے ہوئے' اُس راستے کو طے کرتے ہیں۔

آپؓ نے کہا کہ جو اس طرح راستے کی خاردار جھاڑیوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھتا ہوا سفر کرے اُسے متقی کہا جاتا ہے۔ کیا بات ہے! یعنی جو لوگ راستے کے خطرات سے بچنا چاہتے ہی نہیں ہیں ان کو راہنمائی کی ضرورت کیا ہے۔ جو شخص دریا میں ڈوبنے کے لیے جا رہا ہے خود کشی کرنے کے لیے جا رہا ہے اس سے کہنا کہ بھائی! آگے نہ جانا' پانی گہرا ہے ڈوب جاؤ گے۔ وہ تو چلا ہی ڈوبنے کے لیے ہے۔ یہ راہنمائی تو اس کے کام آئے گی جو دریا میں خودکشی کرنے کے لیے نہیں جا رہا' بلکہ وہ ایسا راستہ ڈھونڈ رہا ہے جو اسے ان خطروں سے محفوظ کر کے دوسری طرف لے جائے۔ خطرات سے محفوظ رہنے کے جو لوگ متمنی ہیں' کہا گیا ہے کہ یہ اُن لوگوں کے لیے راہنمائی کا کام دے گا۔ جو یہ چاہتے ہیں کہ سفرِ زندگی ایک صراطِ مستقیم کے ذریعے ہو' جس میں نہ کوئی بل ہو' نہ پیچ ہو' نہ خم ہو' نہ ابہام ہو' نہ التباس ہو۔ واضح' روشن' سیدھا' متوازن ایک شاہراہ اور اس کی طرف لے جانے والے جو راستے بھی ہوں' اُن کے اوپر بھی جو خاردار جھاڑیاں ہوں' ان سے بچ کر' محفوظ رہ کر' سلامتی کے ساتھ' اس شاہراہِ عظیم کے اوپر ہم آجائیں تو یہ ہوا اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (1:5) کی آرزو کے بروئے کار آنے کا طریقہ جو قرآن نے بتایا۔

عزیزانِ من! یہاں تک گفتگو نظری (Theoretical) سی ہو رہی تھی' محسوس طور پر بات نہیں ہو رہی تھی۔ تو یہ جو کہا ہے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (1:5) تو اس میں اتنا سارا کچھ تو واضح ہو گیا لیکن یہ ذہنی طور پہ واضح ہوا' محسوس طور پر بات سامنے نہیں آئی کہ یہ راستہ کس قسم کا راستہ ہے' کن لوگوں کا راستہ ہے۔ اس کے لیے اگلا لفظ آئے گا: صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (1:6) لیکن آج کے درس کا یہ وقت ختم ہو گیا ہے' اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط



آٹھواں باب: سورۃ الفاتحۃ (آیت 6)



عزیزانِ من! سابقہ درس میں ہم نے دیکھا یہ تھا کہ خدا پر ایمان رکھنے والوں اور اس کے مقرر کردہ نصب العین تک پہنچنے والوں کی یہ شدتِ آرزو 'دعا' بن کر ان کے لبوں پر آئی تھی کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (1:5) ہماری راہنمائی سیدھی، توازن بدوش راہ کی طرف کی جائے۔ اب یہ ایک ایسا اصول یا کلیہ یا نظریہ یا آئیڈیا پیش کیا گیا جو Abstract (بسیط) تھا، محسوس (Concrete) نہیں تھا۔ قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ جہاں ایک کلیہ یا نظریہ پیش کرتا ہے، تو اسے وہ تصوراتی یا صرف آئیڈیل نہیں رہنے دیتا بلکہ محسوس انداز سے اس کی خود وضاحت کرتا ہے تاکہ کوئی شخص خود فریبی میں مبتلا نہ ہو جائے کہ اپنے طور پہ سمجھ لے کہ میں اس کلیہ یا اصول کا اتباع کر رہا ہوں، یا کوئی دوسرا اسے دھوکا نہ دے کہ وہ غلط طریق پر چلا جا رہا ہو اور کہہ یہ رہا ہو کہ یہ وہی چیز ہے کہ جو خدا نے اپنے ہاں کہی ہے۔ دونوں قسم کی گمراہیاں دنیا میں موجود ہیں: خود فریبی کی بھی، اور فریب کاروں کی پھیلائی ہوئی بھی۔ قرآنِ کریم نے ان دونوں سے بچانے کے لیے کیا یہ ہے کہ جہاں وہ کوئی Truth (صداقت) بیان کرتا ہے، کوئی حقیقت بیان کرتا ہے، تو اسے Abstract (غیر محسوس) نہیں رہنے دیتا، Concrete (محسوس) شکل میں اس کی مثالیں پیش کر دیتا ہے تاکہ یہ پرکھنے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہ رہے کہ جس چیز کی ہم آرزو رکھتے ہیں، یہ وہی ہے، کہیں التباس تو نہیں، ابہام تو نہیں، دھوکا تو نہیں، فریب تو نہیں۔

تقابلی انداز کے ساتھ "انعمت علیہم" کے مفہوم کی وسعت

یہ جو صراطِ مستقیم تھی، اس کے متعلق اگلے ہی لفظ میں یہ کہہ دیا کہ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (1:6) یہ اُن لوگوں کا راستہ ہے جنہیں تو نے اپنے انعامات، اپنی نعمتوں، سے نوازا۔ اب آپ یہ چیز دیکھتے ہیں کہ وہ صداقت Abstract (غیر محسوس) سے محسوس شکل میں آ گئی اور پھر اس میں اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (1:6) آیا ہے۔ یہ ماضی کا صیغہ ہے اور اس میں بھی قرآن کی بڑی حقیقت پوشیدہ ہوتی ہے۔ قرآن کا انداز یہ ہے کہ جہاں وہ اپنا کوئی کلیہ یا صداقت یا نظریہ یا اصول پیش کرتا ہے، تو اس کی صداقت کے ثبوت میں تاریخی شواہد پیش کرتا ہے۔ اقوامِ سابقہ کی داستانیں لاتا ہے اور ان سے یہ کہتا ہے کہ تم دیکھو، تاریخ کے اوراق سے پوچھو کہ جس قوم نے اس اصول پر عمل کیا، اس قوم کو کیا کچھ نصیب ہوا، اور جس قوم نے اس کی خلاف ورزی کی وہ کس طرح تباہیوں اور بربادیوں کے عذاب میں مبتلا

ہوئی۔ گویا وہ اپنے پیش کردہ صداقت کے ثبوت میں تاریخی شواہد پیش کرتا ہے اور تاریخ تو Past (ماضی) سے متعلق ہوتی ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم' اپنے اس قسم کے کلیہ کو' جب آگے محسوس شکل میں پیش کرتا ہے تو ہمیشہ Past Tense (زمانہ ماضی) میں یہ کہہ کے کہتا ہے کہ یہ چیزیں ہو چکی ہیں' وہ لوگ گزر چکے ہیں' تاریخ اس قسم کی شہادت دے گی کہ وہ کون لوگ تھے۔ جس طرح اس نے استخلاف فی الارض کے متعلق کہا۔ نظامِ اسلامی یا حکومتِ خداوندی کے متعلق یہ آیت درس میں ایک دفعہ نہیں' میرا خیال ہے کئی دفعہ آ چکی۔

استخلاف فی الارض کے سلسلہ میں تاریخی شواہد کا ذکر

اس وقت استخلاف فی الارض کے متعلق میں عرض کرنا چاہتا ہوں' کہ وہ کس طرح تاریخی شواہد کو پیش کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں کہا تھا کہ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ (24:55) خدا کا یہ وعدہ ہے' یہ قانون ہے کہ تم میں سے جو بھی ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ کے پروگرام پر عمل پیرا ہوتا ہے وہ اُسے اس زمین پر' اس دنیا میں' استخلاف عطا کرتا ہے حکومت عطا کرتا ہے۔ اس کا یہ وعدہ' یہ قانون اٹل ہے۔ اب ہمارے ہاں مذہب اور طریقت میں آ کر استخلاف فی الارض کے بارے انہوں نے کہا کہ یہ روحانیت کے مدارج ہیں جبکہ اہلِ شریعت نے کہا کہ نہیں صاحب! یہ جنت کی ارض ہے وہاں جا کر یہ خلافت ملے گی۔ چنانچہ قرآن نے ان تمام تصورات کی تردید کر دی۔ قرآنِ حکیم میں اس کے فوراً بعد جو اگلا لفظ ہے' وہ ماضی کا صیغہ ہے' اس میں استخلاف فی الارض کے بارے میں کہا کہ کَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ (24:55) جس طرح کی خلافت ارضی اس نے پہلی اقوام کو عطا کی۔ تو اب اسے ہم تاریخ میں دیکھ لیں گے اور قرآنِ کریم پھر ان اقوامِ عالم کی شہادات پیش کر کے کہتا ہے کہ یہ تھی وہ قوم جسے ہم نے استخلاف فی الارض سے نوازا تھا۔ اس کی حکومت کو دیکھو' ان کی مملکت کو دیکھو' ان کی قوتوں کو دیکھو' ان کے اقتدار کو دیکھو۔ تاریخ نے بتا دیا کہ استخلاف فی الارض سے مفہوم کیا ہے۔ اب اس مرئی (Visible) اور محسوس شہادت (Concrete Evidence) کے بعد' نہ کوئی اپنے آپ کو دھوکے میں رکھ سکتا ہے' نہ کسی کے دھوکے میں آ سکتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اپنے اسی اصول کے ماتحت یہ کہا کہ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ (1:6) سابقہ زمانوں میں جن پر تو نے اپنا انعام کیا' جنہیں اپنی نعمتوں سے نوازا۔

قرآنِ حکیم اور تاریخی شواہد کی روشنی میں نعمتوں اور ''منعم علیہ'' کی وضاحت

اب دو چیزیں ہیں جو ہمارے لیے سمجھنے کی ہو گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے نزدیک نعمت سے مراد کیا ہے اور دوسری چیز یہ کہ جن اقوام کو ان انعامات یا ان نعمتوں سے نوازا تھا' تاریخ ان کے متعلق کیا بتاتی ہے کہ ان کی کیفیت کیا ہو گئی تھی۔ اب نعمت کا مفہوم بھی قرآن سے متعین ہو جائے گا اور اس کے بعد جن کو ان نعمتوں سے نوازا گیا' جنہیں منعم علیہ کہتے ہیں' ان اقوام کی داستانوں سے ہی معلوم ہو جائے گا کہ جن قوموں کو خدا کی نعمت' خدا کے انعامات میسر ہوتے ہیں یا میسر ہوتے تھے' ان کی کیفیت کیا تھی۔ اگر ہماری وہ کیفیت ہو جاتی ہے تو

ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا شمار ان میں ہو گیا' ہم وہ قوم بن گئے کہ جن کے متعلق کہا تھا' کہ وہ لوگ جن پر تیرے انعامات ہوئے۔ اور اگر وہ کیفیت ہماری پیدا نہیں ہوئی تو اس کے بعد یا ہم خود فریبی میں مبتلا ہیں یا ہمیں فریب دیا جا رہا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ صرف اتنی سی چیز سے' کہ اس نے یہاں ماضی کا صیغہ کیوں استعمال کیا ہے' کیوں وہ Past (زمانہ ماضی) کی طرف لے گیا' کے اندر کتنی بڑی اہمیت ہے! عزیزانِ من! قرآن کے دعاوی کے پرکھنے کا معیار' تاریخ کی شہادات ہیں' تو یہاں کہا کہ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (1:6) یہ وہ راستہ ہے' وہ صراطِ مستقیم ہے جس پر چلنے سے انعاماتِ خداوندی کی بارش ہوتی ہے۔ انعاماتِ خداوندی کیا ہیں جنہیں ان سے نوازا گیا؟ اُن کی کیفیت تاریخ کے اندر کیسی ملتی ہے؟ یہ تمام چیزیں قرآنِ کریم کے اندر موجود ہیں اور یہی وہ چیزیں ہیں جن میں سے چند ایک وقت کی گنجائش کے اعتبار سے' میں آپ کے سامنے پیش کروں گا کہ انعام یافتہ قومیں' جن کو قرآن نے انعمت علیہم کہا ہے' کی پہچان کیا ہے' اور نعمت کسے کہتے ہیں؟

لفظ نعمت کا مفہوم

پہلے اس لفظ ''نعمت'' کا عربی زبان کے اعتبار سے مفہوم سمجھ لیجیے۔ اس کا مادہ ''ن ع م'' ہے۔ عربوں کے ہاں ایک پودا ہوتا ہے۔ معلوم نہیں آج کل بھی ہوتا ہے یا نہیں کیونکہ میں نے تو بہر حال لغت میں یہ چیز دیکھی ہے' وہ اسے تنعیمۃ کہتے ہیں۔ اس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کے پتے نرم و نازک اور سرسبز و شاداب ہوتے ہیں اور وہ پانی پر اُگتا ہے۔ اس لیے اس کی تر و تازگی میں کبھی فرق نہیں آتا۔ نرم و نازک' سرسبز و شاداب' جس کی تر و تازگی میں کبھی فرق نہ آئے اور اس کے ساتھ ہی غالباً وہ پودا اوپر کی طرف جاتا ہوگا' بلند بھی ہوتا ہوگا۔ اس لیے کہ اُن کے ہاں اسی مادہ ''ن ع م'' میں بلندی اور سرفرازی کا مفہوم بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ النعامۃ اس عمارت کو کہتے ہیں جو پہاڑ پر تعمیر کی گئی ہو' نیز کسی اونچے نشان یا جھنڈے کو بھی' جس سے راستے کا پتہ چلایا جائے۔ ان معانی سے واضح ہے کہ انسانی زندگی کے ہر پہلو کا خوش گوار' کشادہ' ملائم' آسودہ' بلند اور سرفراز ہونا نعمت کا مظہر ہے۔ جن لوگوں کی زندگی اس قسم کی ہوگی انہیں ''منعم علیہ'' کہا جائے گا۔ یعنی وہ جنہیں خدا کی نعمتیں حاصل ہیں۔ اب یہ ہے وہ اجمال جس کی تفصیل قرآنِ کریم کے مختلف مقامات میں ملے گی اور انہی میں سے چند ایک میں آپ کی خدمت میں اس وقت پیش کروں گا۔

قرآنِ حکیم کے اندر قوم بنی اسرائیل کا تذکرہ قوموں کی موت و حیات کے لیے ایک آئینہ ہے

سورۃ البقرۃ میں بنی اسرائیل کی داستان کو بڑی ہی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ قرآنِ کریم کے متعدد مقامات پر اس داستان کو دہرایا گیا ہے کہ اس کے اندر قوموں کے عروج و زوال کے ابدی اصول مضمر ہیں' ان ابدی اصولوں کی تاریخی شہادات اس قوم کی داستان سے ملتی ہیں۔ اس لیے اس قوم کی داستان کو خاص طور پہ بڑی ہی شرح و بسط سے دہرایا ہے اور دوسرے اس لیے بھی کہ زمانہ نزولِ

قرآن کے وقت یہ قوم عربوں کے خود سامنے تھی۔ وہاں عربوں کے ہاں یہ قوم بستی تھی۔ ساری دنیا میں ان کی ذلت ورسوائیاں' ہر قوم کے سامنے تھیں اور آج تک اس قوم کی یہ کیفیت رہی۔ یہ دوسری بات اور آگے چل کے میں یہ بیان کروں گا کہ یہ دوسروں کے سہارے سے انہوں نے ایک چھوٹی سی مملکت قائم ضرور کر لی ہے لیکن پوری تاریخ آپ کو بتائے گی کہ ان کی اصلیت کیا ہے۔ تاریخ کے اندر ان کا نام صحرا نورد خانہ بدوش تھا' جن کا نہ کوئی گھر' نہ گھاٹ تھا لیکن اس سے پہلے ان کے اوپر ایک ایسا دور آیا کہ جس میں یہ سطوتِ داؤدی اور شوکتِ سلیمانی کی حامل بھی تھی۔ تو وہ یہی قوم تھی' وہ عروج بھی انہی کا تھا' یہ زوال بھی انہی کا ہے۔ یہ ہنگامی اور اتفاقی طور سے نہیں ہو گیا' خدا کے اٹل قوانین کی رو سے ہوا ہے اور اسی لیے میں نے یہ کہا ہے کہ جو قوموں کے عروج اور زوال کے اصول ہیں' وہ اس قوم کی تاریخ کے اندر' شہادتوں کے طور پر' ہمارے سامنے آتے ہیں۔ آیئے! دیکھیں' کہ سب سے پہلے قرآنِ کریم نے یہ منعم علیہ کی حیثیت سے' جنہیں نعمتوں سے نوازا گیا' اس قوم کی داستان کا آغاز سورۃ البقرہ سے یہ کہہ کر کیا ہے کہ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ (2:40) اے قوم بنی اسرائیل! تم خدا کی اس نعمت کو یاد کرو' جس سے اس نے تمہیں نوازا تھا۔ بنی اسرائیل فرعون[1] جیسے مستبد بادشاہ کی غلامی اور محکومیت کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ گویا یہ ایک محکوم قوم تھی۔ وہ کون سی چیز ہے' وہ کون سی نعمت ہے' جس کی انہیں یاد دہانی کرائی گئی؟

قومِ بنی اسرائیل کو نعمتوں سے سرفراز کرنے کی یاد دہانی

عزیزانِ من! وہ نعمت یہ ہے کہ وَ اِذۡ نَجَّیۡنٰکُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ یَسُوۡمُوۡنَکُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ یُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَکُمۡ وَ یَسۡتَحۡیُوۡنَ نِسَآءَکُمۡ ؕ وَ فِیۡ ذٰلِکُمۡ بَلَآءٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ عَظِیۡمٌ (2:49) تم اس نعمت کو یاد کرو کہ خدا نے کس طرح تمہیں فرعون جیسے مستبد' ظالم بادشاہ کی غلامی اور محکومی سے نجات دلائی' وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر تمہیں عذاب دیا کرتا تھا اور سب سے بڑا عذاب یہ تھا کہ تمہاری قوم میں جہاں اس نے دیکھا کہ کوئی شخص ایسا پیدا ہو رہا ہے جس میں ابھرنے کی صلاحیتیں ہیں' وہ انہیں ہمیشہ کچل دیا کرتا تھا اور اپنے مقرب اُن لوگوں کو بنایا کرتا تھا جن میں جوہرِ مردانگی مفقود ہوں۔ میں ذبح ابناء استحیاء نساء (2:49) کی تفصیل آگے چل کر سورۃ البقرۃ میں بیان کروں گا۔ اس کے عام معنی تو یہ لیے جاتے ہیں کہ فرعون بنی اسرائیل کے بچوں (لڑکوں) کو پیدا ہوتے ہی ذبح کر کے مار دیا کرتا تھا اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھا کرتا تھا۔ اس کا مفہوم یہ نہیں ہے۔ میں وہاں' آگے چل کر' تفصیل سے بیان کروں گا' یہاں میں نے ویسے ہی مفہوم ادا کر دیا ہے۔ ابناء قوم کہتے ہی اُن کو ہیں جن میں جوہر مردانگی ہوں' جن میں ابھرنے کی' سرفرازیوں کی' مقابلہ کرنے کی'

---

[1] اس کی تفصیل کے لیے یہ دو کتب دیکھیے: (ا) مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004ء' ص 109۔ (ب) مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ طٰہٰ' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص 119۔

صلاحیت ہو اور ''یذبحون'' ذبح کے معنی قتل کر دینا یا ذبح کر دینا ہی نہیں ہیں' پست کر دینا' ذلیل کر دینا' بھی اس کے معنی ہوتے ہیں۔قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ یہ بہت بڑا عذاب تھا کہ اس نے تمہیں غلام بنا رکھا تھا اور پھر تم میں اگر کوئی ایسا شخص پیدا ہو جاتا تھا' جس کے متعلق اس کو شبہ گزرتا تھا کہ یہ ذرا سر ابھارے گا' اس کو وہیں کچل دیتا تھا اور ان لوگوں کو اپنے قریب کرتا تھا' جن میں جوہرِ مردانگی نہیں ہوئے تھے۔ دوسری جگہ یہ ہے کہ وہ اُن لوگوں کو اوپر چڑھاتا تھا جو ہر مردانگی سے عاری ہوتے تھے۔ یہ بڑا ہی سخت عذاب تھا' بہت بڑی ذلت آمیز سزا تھی' یہ وہ عذاب تھا جس میں تم مبتلا تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ نعمت کیا تھی؟ اس کا جواب یہ دیا کہ اِذْ نَـجَّیۡـنٰکُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِـرۡعَوۡنَ ❶ (2:49) اس سے' سب سے پہلے تاریخ میں ہمارے سامنے یہ چیز آئی یا قرآنِ کریم میں ہمارے ہاں یہ آئی کہ کسی قوم کا مستبد حاکم' فرماں روا کے پنجہ استبداد سے نجات حاصل کر لینا' خدا کی نعمت ہے لیکن یہ کسی کی غلامی سے آزادی حاصل کر لینا تو منفی پہلو (Negative Aspect) ہے' تو یہ ایسی قوموں کے اندر اس کا شمار ہو گیا جو کسی کی محکوم نہیں' بلکہ ان کو آزادی ملی ہے۔ تو محکومی سے آزادی ملنا ایک نعمت ہوا لیکن جیسا کہ میں نے نجات (Salvation) کے سلسلے میں پہلے بھی کہا تھا' کہ اس سے کوئی Achievement (فوز و فلاح) نہیں ملی' ایک عذاب سے چھٹکارا ہے' گلوخلاصی ہے' نجات پانا ہے۔ اس کے بعد قرآنِ کریم اس کا Positive Aspect (مثبت پہلو) بھی سامنے لایا۔ وہ Positive Aspect (مثبت پہلو) جو اس نے کہا یہ تھا کہ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَ اَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ (2:47) اے قومِ بنی اسرائیل! تم خدا کی اِس نعمت کو یاد کرو کہ اس نے تمہیں تمہاری ہم عصر اقوام پر افضلیت عطا فرمائی ہے۔ بالفاظ دیگر ''منعم علیہ'' وہ قوم ہے جو اپنی ہم عصر اقوام میں نہایت ممتاز اور بلند و بالا مقام رکھتی ہو۔ یعنی دیگر اقوام کی ہم دوش ہی نہیں' ان کے برابر چلنے والی نہیں' بلکہ ان سے بہت آگے اور سر بلند۔ یہی ہے' جسے قرآن فَـضَّـلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ (2:47) کہتا ہے یعنی اپنی ہم عصر اقوام میں ممتاز حیثیت کے مالک۔ قرآن کریم نے جب امت مسلمہ' جماعت مومنین' کے متعلق کہا تھا کہ اَنۡتُـمُ الۡاَعۡـلَـوۡنَ (3:138)۔ تو اس میں اعلون کے معنی ہیں: سب پر غالب' سب سے اونچے۔ اس سے یہی بات ہوئی کہ یہی نہیں کہ تم باقی قوموں کے ہم دوش چلو بلکہ تمام اقوامِ عالم سے بلند و بالا ہو جاؤ۔ علامہ اقبالؒ (1938-1877ء) کے الفاظ میں:

مومن بالائے ہر بالا ترے

مومن کی غیرت تو یہ بھی گوارا نہیں کرتی کہ کوئی دوسرا اس کی سرفرازی کے ہم پلہ ہو

مومن کی پہچان یہ ہے کہ کوئی کتنا ہی اونچا ہو' وہ اس سے بھی اونچا ہوتا ہے' کوئی قوم کتنی ہی سر بلند ہو' وہ اس سے بھی اوپر ہوتی ہے۔ اس پہ

---

❶ تم نے قوانینِ خداوندی کا اتباع کیا تو اس نے تمہیں سب سے پہلے فرعون کے اس عذاب سے نجات دلائی (مفہوم القرآن از پرویزؒ۔ ص 18)

غالب ہوتی ہے۔ یہ ہے بالائے ہر بالاترے اور آگے کہتا ہے کہ

غیرت او بر نتابد ہمسرے

کسی کا اس سے آگے بڑھ جانا تو کجا' مومن کی غیرت تو اس کو بھی گوارا نہیں کرتی کہ کوئی دوسری قوم اس کے ہم دوش اور ہم سر ہو جائے۔ وہ قوم جو انعاماتِ خداوندی سے' نوازی جاتی ہے' اس کا Negative Aspect (منفی پہلو) تو یہ ہے کہ وہ کسی کی غلامی میں نہیں ہوتی' اسے ہر قسم کی غلامی سے چھٹکارا ملتا ہے اور اس کا Positive Aspect (مثبت پہلو) یہ ہے کہ وہ اپنی ہم عصر اقوام میں سر بلند اور بالاتر ہوتی ہے۔ پہلی چیز تو نعمت کے اندر یہ ہے۔ اسی نعمت کا ذکر لبوں پہ یوں آیا کہ بارالٰہا! ابھر اور نکھر کر صِـرَاطَ الَّـذِيْـنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (1:6) ان لوگوں کا راستہ سامنے آ جائے جو تیرے انعامات سے سرفراز ہوئے۔ اگر یہ قوم' جو یہ تمنا لے کر ابھری ہے' کسی مستبد حاکم کی محکومی میں ہے تو اسے غیر خداوندی احکام اور حاکمیت سے نجات مل جائے۔ انسانی غلامی کے اندر رہنا ہی غلامی ہے' خواہ اس قوم میں خوشحال ہی کیوں نہ ہو بلکہ یہ کہ اپنی حکومت بھی کیوں نہ ہو اور وہ احکامِ خداوندی وہاں نافذ نہ ہو رہے ہوں' تب بھی یہ قوم غلام کی غلام ہی ہوتی ہے۔ اس طرح پہلی چیز تو یہ ہے کہ غیر خداوندی احکام اور حاکمیت سے نجات مل جائے۔ انعام یافتہ قوم کی پہلی شرط یہ چیز ہو گئی اور دوسری شرط یہ ہوئی کہ وہ اپنی ہم عصر اقوام میں سب سے بلند و بالا اور ممتاز ہو۔ یہ اس قوم کی دوسری نشانی ہو گئی' جس پر خدا کی نعمتیں نچھاور ہوتی ہیں۔

''صراطِ مستقیم'' کی سب سے بڑی نشانی احکام اللہ کے تابع زندگی بسر کرنے کے لیے آزاد ہونا ہے

اِهْدِنَـا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ [1] (1:5) میں صراطِ مستقیم کا پہلا نشان' پہلا نصب العین یا پہلی منزل یہ ہے کہ وہ قوم آزاد ہوتی ہے' خدا کے احکام کے تابع زندگی بسر کرنے کے لیے وہ اقتدار رکھتی ہے اور اپنی ہم عصر اقوام میں سب سے بلند و بالا ہوتی ہے۔ عزیزانِ من! قومِ بنی اسرائیل کی داستان میں اس قسم کی افضلیت حضرتِ سلیمان اور حضرتِ داؤد ؑ کے زمانے میں اپنے نکتہ کمال پر پہنچی۔ چنانچہ حضرتِ سلیمان ◆ کا یہ اعتراف بلکہ یہ دعا قرآنِ کریم میں مذکور ہے کہ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَ عَلٰى وَ الِدَيَّ (27:19) اے میرے رب! مجھے اس کی توفیق عطا فرما کہ میں تیری اُس نعمت کا شکریہ ادا کروں' جس سے تو نے مجھے اور میرے والدین کو نوازا ہے۔ اس سے آپ دیکھ لیجیے کہ وہ جو فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (2:47) کہا تھا یعنی ہم عصر اقوام پر افضلیت

---

[1] یہ افراد (جماعتِ مومنین) جب سفرِ حیات کے لیے قدم اٹھاتے ہیں' تو یہ حسین تمنائیں اور مقدس آرزوئیں' دعا بن کر ان کے لبوں تک آ جاتی ہیں کہ: بارِالٰہا! زندگی کا وہ سیدھا اور ہموار راستہ اُبھر اور نکھر کر سامنے آ جائے جو ہمیں' بلا خوف و خطر' ہماری منزلِ مقصود تک لے جائے (مفہوم القرآن از پرویزؒ، ص۔ا۔ب۔

حاصل کرنا' تو وہ کس طرح حضرتِ داؤد اور حضرت سلیمان ؑ کے زمانے میں ہوئی اور انہوں نے کس طرح اس کا اعتراف کیا کہ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَ عَلٰی وَ الِدَیَّ (27:19). حضرتِ سلیمانؑ اور ان کے والد حضرت داؤدؑ کو جس انداز کی سطوت وشوکت' طاقت وقوت اور عفت عطا ہوئی تھی' اسے ''خدا کی نعمت'' کہا گیا۔

انسان کا یہ پیکرِ آب وگل ذاتِ انسانی کی نشو ونما کا ایک ذریعہ ہے مقصود بالذات نہیں

میں پہلے تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ انسانی زندگی کا مقصود بالذات تو یہ چیز ہے کہ اس کے نفس' اس کی ذات' اس کی خودی کی ایسی نشو ونما اور تربیت ہو جائے' اُس میں ایسی پختگی اور نمود پیدا ہو جائے کہ وہ اس زندگی کے بعد کی زندگی کے اگلے مراحل طے کرنے کے بھی قابل ہو جائے لیکن اس کرۂ ارض پر جو خدا کا نظام ہے' اس میں انسانی خودی کی یہ تربیت' یہ نشو ونما' یہ نمود' یہ استحکام' مادی سطح پر ہوتا ہے اور مادی ذرائع سے ہوتا ہے' خود اس کا جسم بھی تو ایک Physical Body (مادی جسم) ہے' اس کے اندر رہتے ہوئے یہ سارا کچھ کر سکتے ہیں' تو گویا یہ مقصود بالذات نہیں۔ جیسا کہ میں نے غالباً مثال میں بتایا تھا کہ گھوڑا ہمیں کسی مقام تک پہنچانے کے لیے ایک ذریعہ ہوتا ہے' مقصود بالذات نہیں ہوتا لیکن سفر کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ گھوڑا تندرست ہو' توانا ہو' تربیت یافتہ ہو۔ اس کا کمزور ہونا یا سرکش ہونا ہمیں سفر کے قابل نہیں رکھتا۔ گھوڑا مقصود بالذات نہیں لیکن ہمارے مقصد کے حصول کا ذریعہ ضروری ہے اور اس ذریعے کا بھی تنومند اور توانا' صحت یافتہ' مناسب اور موزوں ہونا نہایت ضروری ہے۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن نے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً ❶ (2:201) پہلے کہا ہے وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً ❷ (2:201) اس کے بعد کہا ہے۔ اس دنیا کی حسنات' اس دنیا کی نعمتیں' اس دنیا کے اندر جتنے بھی سامان' ذرائع اور وسائل ہیں' ان کا نہایت فراخی نہایت کشادگی اور نہایت آسانی سے ملنا بھی خدا کی نعمتوں میں سے ہے۔

کائنات میں قدم قدم پر انگنت نعمتوں کا بکھیر دینا قدرت کا ایک احسانِ عظیم ہے

اس طرح سورۃ النحل کی ان آیات کو دیکھیے' جن میں کہا ہے کہ یہ پوری نوعِ انسانی کے لیے ہیں' کسی خاص قوم کے لیے نہیں ہیں۔ کہا کہ وَ اللّٰہُ جَعَلَ لَکُمْ مِّنْۢ بُیُوْتِکُمْ سَکَنًا ❸ (16:80) اللہ وہ ہے جس نے تمہیں ایسے مکانات دیئے جن میں تم امن اور اطمینان سے رہ سکتے ہو۔ وَّ جَعَلَ لَکُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُیُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا ❹ (16:80)۔ یہ تو مکان تھے' جو اینٹ اور پتھر

---

❶ اے ہمارے نشو ونما دینے والے! ہمیں دنیاوی زندگی کی خوشگواریاں حاصل ہوں۔

❷ اور اُخروی زندگی کی خوشگواریاں بھی میسر ہوں۔

❸ خدا نے تمہارے گھروں کو تمہارے لیے رہنے کی جگہ بنایا (جو ایک ہی جگہ قائم رہتے ہیں)۔ (مفہوم القرآن از پرویزؒ، ص 613)

❹ مویشیوں کی کھالوں سے تمہارے لیے خیمے بنا دیئے (جنہیں تم جہاں چاہو لیے لیے پھرتے ہو)۔ (مفہوم القرآن از پرویزؒ، ص 613)

کے بنے ہوئے تھے' جو ایک ہی مقام کے اوپر جامد و ساکن رہتے تھے اور یہ جو تو میں تھیں' صحرا نورد تھیں' خانہ بدوش تھیں آج یہاں' کل وہاں تو شہری یا تمدنی زندگی کے لیے تو وہ مکان بتائے جو ساکن و جامد ہیں۔ان کے لیے کہا کہ یہ بھی خدا کی نعمت میں سے ہے کہ تمہیں اس قسم کے مویشیوں سے کھالیں دیں کہ جن سے تم ایسے خیمے بنا سکتے ہو یَوۡمَ ظَعۡنِکُمۡ وَ یَوۡمَ اِقَامَتِکُمۡ ❶ (16:80) جنہیں نہایت آسانی سے' جہاں جی چاہے اپنے کندھے پر اٹھائے' لے جا سکتے ہو۔ یہ ہے مکان اور تمہارے ساتھ چلنے والا مقام۔وَ مِنۡ اَصۡوَافِهَا وَ اَوۡبَارِهَا وَ اَشۡعَارِهَاۤ اَثَاثًا وَّ مَتَاعًا اِلٰی حِیۡنٍ ❷(16:80) اور یہ مویشی' یہ اونٹ' یہ بھیڑیں' اور بکریاں' ان کا دودھ تم پیتے ہو' ان کا گوشت تم کھاتے ہو' ان کی کھالوں سے یہ کچھ بناتے ہو' اور اس کے علاوہ ان کی اون سے تم مختلف قسم کی چیزیں بناتے ہو' کمبل بھی' خیمے بھی' لباس بھی ۔تو دیکھو تو سہی' یہ سارا کچھ خدا کا دیا ہوا ہے' یہ اس کی طرف سے انعامات ہیں' جو تمہاری اس طبعی زندگی کو اس قدر آرام دہ ہی نہیں بناتے بلکہ مقصد کے حصول کے لیے یہ سامان اور ذرائع ایک وقت تک تمہارے کام آتے رہتے ہیں اور آگے بڑھتے۔کہا کہ وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَکُمۡ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنَ الۡجِبَالِ اَکۡنَانًا وَّ جَعَلَ لَکُمۡ سَرَابِیۡلَ تَقِیۡکُمُ الۡحَرَّ وَ سَرَابِیۡلَ تَقِیۡکُمۡ بَاۡسَکُمۡ ❸ (16:81). خدا وہ ہے جس نے تمہارے لیے پہاڑوں کے دامن میں' بلکہ ان کی غاروں کے اندر' سکون آفریں' آرام دہ' آسائش والی پناہ گاہیں اور حفاظت کے مقامات بنا دیئے۔اس نے تمہیں اس قسم کے لباس دیئے جو تمہیں گرمی سے بچاتے ہیں۔اس نے تمہیں اس قسم کی زرہیں دیں جو جنگ میں تمہاری حفاظت کرتی ہیں۔ دیکھو تو سہی کہ اس نے تمہیں جو Physical (طبعی) زندگی عطا کی' اس زندگی کی حفاظت' پرورش' نشوونما کے لیے کیا کچھ نہیں دیا۔اور اگلے الفاظ ہیں کہ کَذٰلِکَ یُتِمُّ نِعۡمَتَهٗ عَلَیۡکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تُسۡلِمُوۡنَ (16:81) کس طرح خدا نے تمہارے لیے' اپنی نعمتوں کا اہتمام کیا ہے اور یہ سب کچھ ایک اور مقصد کے لیے ہے۔وہ مقصد یہ ہے کہ تم قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرو۔دنیاوی زندگی کی تمام پریشانیوں سے نجات پاؤ اور آرام و اطمینان سے تمہیں ہر شے میسر ہو۔

اس کائنات کا وجود صرف اس چیز کا متقاضی ہے کہ انسان احکام خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کر دے

یہ چیزیں تو ایک کافر کو بھی میسر ہو سکتی ہے لیکن کافر اور مومن میں فرق یہ ہے: کہ کافر کو جو چیزیں میسر ہوتی ہیں تو وہ انہیں اپنی مرضی

---

❶ تم کہیں ڈیرا جماؤ یا وہاں سے کوچ کرو' دونوں حالتوں میں یہ خیمے بڑے ہلکے پھلکے رہتے ہیں۔نہ لگانے میں دقت' نہ اٹھانے میں دشواری۔(ایضاً)

❷ پھر بھیڑ اور دنبے کی اون' اونٹ کی پشم اور بکری کے بالوں سے' تمہارے لیے کتنے ہی سامان اور ضرورت کی چیزیں بنا دیں جو ایک وقت تک تمہارے کام آتی رہتی ہیں۔ (ایضاً)

❸ اللہ نے تمہارے لیے اپنے پیدا کردہ درختوں کے سائے بنا دیئے (کہ جہاں نہ مکان ہو' نہ خیمہ' تم ان کے نیچے دھوپ سے پناہ لے سکو)۔نیز پہاڑوں میں تمہارے لیے چھپنے کی جگہیں بنا دیں اور تمہارے لیے کپڑے بنا دیئے جو تمہیں گرمی سے محفوظ رکھتے ہیں اور آہنی لباس (زرہ بکتر) جو تمہیں ہتھیاروں کی زد سے بچاتا ہے۔ (ایضاً)

کے مطابق استعمال کرتا ہے اور یہاں یہ کہا گیا ہے کہ یہ سب کچھ تمہیں اس لیے دیا ہے کہ تم قوانین خداوندی کے سامنے سرِتسلیم خم کرو تا کہ تمہاری اپنی ذات کی بھی نشوونما ہو جائے اور ربوبیت عالمینی بھی ہوتی چلی جائے۔ ربوبیت عالمینی یہ ہے کہ ان چیزوں کو اپنی ذات تک ہی نہ رکھو بلکہ دوسروں کو بھی اس کے اندر شریک کرو۔ اس لیے کہ خدا کی حمد اس لیے تھی کہ وہ رب العالمین تھا۔ تمہیں بھی ربوبیت عالمینی کی روش اختیار کرنی چاہیے۔

ابن النعامۃ (یعنی نعمائے خداوندی کا بیٹا)

عزیزانِ من! اب ایک اور چیز سنیے اور جھوم جائیے۔ خود عربوں کے ہاں نعمت حاصل ہونے کے بعد وہ کون سا انداز تھا جسے وہ کہتے تھے کہ فی الواقع اس نے نعمت کی قدر کی ہے؟ ان کے ہاں ایک لفظ ابــن الــنـعـامـة تھا. یعنی نعمائے خداوندی کا بیٹا۔ یہ کون تھا؟ یہ عرب ابـن الـنـعـامـة اُس شخص کو کہتے تھے جو کنویں کی منڈیر کے اوپر کھڑا ہو اور پیاسوں کو آواز دے دے کر بلا رہا ہو کہ آؤ، ٹھنڈا پانی پیتے چلے جاؤ: یہ پانی، یہ شیریں پانی![1] اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ پانی، کتنی بڑی نعمت تھی لیکن ان کے ہاں یہ پانی اس وقت نعمت بنتا تھا، جب منڈیر پر کھڑے ہو کر بلا بلا کر پیاسوں کو پلایا جائے۔ یہ فرق ہے کافر اور مومن میں، عزیزانِ من! ایک وہ ہیں جو اپنے جذبات اپنے ہی قوانین کے تابع رکھ کر زندگی بسر کرتے ہیں اور دوسرے وہ ہیں جو خدا کی نعمتوں کا استعمال خدا کے بتائے ہوئے اصول واقدار کے مطابق کرتے ہیں۔ ان کے ہاں جسے نعمت ملتی ہے، وہ اس کنویں سے خود ہی پانی نہیں پیتا، دوسروں کو بھی پلاتا ہے اور آوازیں دے دے کر پلاتا ہے۔ عجیب بات ہے ان عربوں کے ہاں! کس قدر کشادہ اور وسیع تصور تھا ان کا کہ کنویں کی منڈیر پہ کھڑا ہے اور راہ چلنے والوں کو آوازیں دے رہا ہے کہ آؤ، اس نعمت میں میرے ساتھ تم بھی شریک ہو جاؤ۔ اور یہ ہے لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ [2] (16:81) جو قرآن نے کہا تھا تا کہ تم ہمارے اقدار اور اصول کے سامنے سرِتسلیم خم کرو اس لیے تمہیں یہ نعمتیں دی جاتی ہیں۔

قرآن کا انداز یہ بھی ہے کہ وہ اپنا مفہوم اضداد کے ذریعے بھی واضح کرتا ہے۔ اگر اس نے بتانا ہوتا ہے کہ دیکھو، روشنی میں کتنے فائدے ہیں، وہ کہتا یہ ہے کہ ذرا سوچو تو سہی کہ تاریکی میں کتنے نقصانات ہوتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں اضداد کے ذریعے بات کو سمجھانا۔ یہاں جنہیں نعمتیں کہا ہے، وہ سارا کچھ زندگی کا ساز وسامان گنا دیا اور یہ کہا کہ ایک قوم وہ ہے کہ اس سارے ساز وسامان کو لے کر ہمارے قوانین کے تابع اسے صرف کرتی ہے، اس سے نعمتوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، افزائش ہوتی چلی جاتی ہے لیکن اگر ایسا نہ کیا جائے، کوئی ان کو دبا کر بیٹھ جائے، چھپا کر بیٹھ جائے، تو پھر کیا ہوتا ہے؟

---

[1] تاج العروس اور محیط المحیط

[2] تا کہ تم اس کے قانونِ ربوبیت کے سامنے جھک جاؤ۔

ان خداداد نعمتوں کو چھپا کر رکھنے کا نتیجہ بالآخر خوف اور بھوک کی شکل اختیار کر جاتا ہے

اسی سورۃ کے اندر ذرا آگے جا کر یہ بتایا ہے کہ وَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا قَرْیَۃً (16:112) خدا مثال کے ذریعے تمہیں بات سمجھاتا ہے کہ ایک بستی تھی۔ کَانَتْ اٰمِنَۃً مُّطْمَئِنَّۃً (16:112) ان کو امن بھی نصیب تھا' اطمینان بھی نصیب تھا۔ امن تو بیرونی خطرات سے ہوتا ہے۔ اطمینان تو قلب کے اطمینان سے ہوتا ہے۔ انہیں یہ دونوں ہی چیزیں میسر تھیں' نہ خوف تھا' نہ حزن تھا۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ یَّاْتِیْھَا رِزْقُھَا رَغَدًا مِّنْ کُلِّ مَکَانٍ (16:112) چاروں طرف سے نہایت باافراط رزق ان کی طرف چلا آتا تھا۔ اس قوم کی یہ کیفیت تھی۔ پھر کیا ہوا؟ ہوا یہ کہ فَکَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰہِ (16:112) انہوں نے خدا کی ان نعمتوں کا کفران کیا۔ کفران کا مادہ (Root) ''ک ف ر'' ہے۔ اسی سے کفر ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں ''کسی چیز کو ڈھانپ کے رکھ لینا'' چھپا کے رکھ لینا۔ انہوں نے ان نعمتوں کو عالمگیر ربوبیت کا ذریعہ بنانے کی بجائے خود ہی چھپا کر رکھ لیا' تاکہ محتاجوں کو یہ نظر ہی نہ آئے' کسی کو دینا ہی نہ پڑے۔ انہوں نے اس سے یہ کیا۔ یہ ہے جسے کفرانِ نعمت کہتے ہیں۔ انہوں نے کفرانِ نعمت کیا۔ یہاں الفاظ آئے ہیں: بِاَنْعُمِ اللّٰہِ (16:112). یہ ہے وہی لفظ نعمت۔ تو نتیجہ کیا ہوا؟ وہ یہ بتایا کہ فَاَذَاقَھَا اللّٰہُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ (16:112) تو ان پر خوف اور بھوک کا عذاب مسلط ہو گیا۔ نعمتوں کے ملنے سے وہ آسائش کی زندگی تھی' نعمتوں کے چھننے سے خوف اور بھوک کا عذاب آ گیا۔ یہ معلوم ہو گیا کہ بھوک اور خوف خدا کے عذاب ہیں۔ وہ اس لیے مسلط ہوتے ہیں کہ قوم خدا کی دی ہوئی ان نعمتوں کو عالم گیر ربوبیت کے لیے کھلا رکھنے کی بجائے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر چھپا چھپا کر رکھتی ہے۔ یہ کفرانِ نعمت ہے۔ اس کا نتیجہ خوف اور بھوک کا عذاب ہے اور اگلے ہی الفاظ میں یہ آ گیا کہ یہ کیوں آیا۔ پہلے کہا تھا کہ یہ تمہیں اس لیے دے رہے ہیں تاکہ تم ہمارے قوانین کے مطابق ان کو صرف کرو' ایسا نظام بناؤ جو ہمارے قوانین واصول کے مطابق ہو اور یہاں کہا کہ یہ اس لیے ہوا کہ بِمَا کَانُوْا یَصْنَعُوْنَ (16:112) یہ سب کچھ ان کے اپنے ہاتھوں کا لایا ہوا تھا۔ خدا نے اپنی بخششیں نہیں روک لی تھی' لیکن انہوں نے اپنے لیے جو غلط نظام قائم کیا' یہ اس کا نتیجہ تھا۔ وہ بخششیں قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرنے کے بجائے ڈھانپ ڈھانپ کر رکھی جاتی تھیں تاکہ عامۃ الناس ''نوعِ انسانی'' کی ربوبیت کا وہ ذریعہ نہ بننے پائیں۔ یہاں یَصْنَعُوْنَ (16:112) بڑی عجیب چیز کے لیے آیا ہے۔

عزیزانِ من! ایک نظام تو حقیقی ہوتا ہے اور وہ خدا کے اصولوں کے مطابق قائم ہوتا ہے اور ایک نظام مصنوعی ہوتا ہے جو انسان اپنے قوانین کے تابع قائم کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس میں یہ نعماء خدا کے ایک خاص طبقے کے اندر محدود ہو کر رہ جاتی ہیں۔ وہ ان کو ڈھانپتا ہے' چھپاتا ہے' محدود کر کے رکھتا ہے تاکہ عالم گیر انسانیت کے کام نہ آ سکے۔ نتیجہ اس کا خوف اور بھوک کا عذاب ہوتا ہے تو یہ دوسری بات نظر آ گئی کہ اس دنیا کی زندگی کی ضرورتیں اور ذرائع رزق کا باآسانی مل جانا اور بلا کسی احسان کے مل جانا' خدا کی نعمت ہے۔

یہ خدا کی نعمت کا چھن جانا' خدا کا عذاب ہے اور اس عذاب کی شکل خوف اور بھوک ہے۔

آگے چلیے' سورۂ لقمان میں اس اجمال کی اور تفصیل بیان کرتے ہیں یعنی اس دائرے کو وسیع تر کر دیا۔ اس کی وسعتیں حدود فراموش کر دیں۔ کس طرح سے؟ کہا کہ اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ (31:20) تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ زمین ہی نہیں' یہ آسمان کے کرّے بھی' تمہارے لیے تابع و تسخیر کر دیئے' خارجی کائنات کی ہر شے تمہارے لیے مسخر کر دی کہ تم فطرت کی قوتوں (Forces of Nature) کو اپنے کام میں لاؤ اور ان سے اپنا کام چلاؤ۔

''اسبغ'' کا قرآنی مفہوم نعمتوں کے دریا بہا دینا

کہا کہ یہ تو جو ہم نے تسخیر فطرت کہا ہے' یہ کا ہے کے لیے ہے؟ وَ اَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً [1] (31:20)۔ اس آیت میں لفظ اسبغ آیا ہے۔ اس کے معنی ہیں: دریا بہا دیئے۔ اس نے انہیں عام کر دیا۔ اس آیت کے معنی ہیں کہ خدا نے اپنی نعمتوں کے' ان نعمتوں کی جو نفع بخشیاں ظاهرة و باطنة' ہیں' جو محسوس طور پر اس وقت تمہارے سامنے آ گئی ہیں وہ بھی' اور وہ بھی جو ابھی پردۂ کائنات کے پیچھے چھپی ہوئی ہیں' جو ابھی محسوس طور پر تمہارے سامنے نہیں آئیں' کے دریا بہا دیئے۔ خدا نے تمہیں اپنی نعمتوں کو بھرپور' کثرت اور فراوانی سے دیا۔

عزیزانِ من! چودہ سو سال پہلے کے انسانوں کو اور ان انسانوں میں سے بالخصوص عربوں کو کہ جن کا علم اس قدر محدود تھا' کہا جا رہا ہے کہ جسے ہم نے تسخیر فطرت کہا ہے' جسے ہم نے تسخیر ارض و سما کہا ہے' ان کے اندر کچھ تو وہ نعمتیں ہیں' جو اس وقت محسوس طور پر تمہارے سامنے آ گئی ہیں اور ابھی ان نعمتوں کا بحر بے کنار ہے جو ابھی تمہاری نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ جوں جوں فطرت کے ان رموز کے اوپر سے پردے اٹھتے چلے جائیں گے' وہ نعمتیں باطن سے ظاہر ہوتی ہوئی تمہارے سامنے آتی چلی جائیں گی اور عزیزانِ من! آپ نے دیکھا ہے کہ اس چودہ سو سال کے عرصے میں کتنی ایسی فطرت کی قوتیں' انسان کے محسوس دائرے کے اندر آ گئیں' جو اس سے پیشتر غیر مرئی (Invisible) غیر محسوس (Abstract) تھیں اور ان سے اس نے کس قدر فوائد حاصل کیے۔ کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے دامن کو اور زیادہ کشادہ و وسیع کر دیا۔ دیکھیے' یہ وسعتیں ابھی ختم نہیں ہوئیں۔ یہ تو بحر بے کنار ہیں' حدود فراموش ہیں۔

---

[1] مقصد اس سے یہ ہے کہ تمہاری نشو و نما کے لیے جس قدر ساز و سامان کی ضرورت ہے' خواہ وہ محسوس اور مرئی اشیاء ہوں یا کائنات کے پردوں میں چھپی ہوئی قوتیں (Forces)' اسے نہایت کشادگی اور فراوانی سے بہم پہنچائے اور اس طرح تمہاری نشو و نما کی تکمیل ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ نے تسخیر فطرت کے لیے پوری کائنات کو قانون کی زنجیروں میں باندھ رکھا ہے

سورۂ ابراہیم میں ہے کہ اَللّٰہُ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجَ بِہٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّکُمۡ (14:32) اللہ وہ ہے جس نے اس ارض وسمٰوات کو پیدا کیا' بعد میں اس سے پانی برسایا' اس سے قسم قسم کے پھل اور کھیتیاں اگائیں' اس میں تمہارے لیے رزق ہے۔ وَ سَخَّرَ لَکُمُ الۡفُلۡکَ لِتَجۡرِیَ فِی الۡبَحۡرِ بِاَمۡرِہٖ (14:32) اور تم دیکھتے نہیں ہو کہ پانی میں لوہے کی ایک سوئی بھی اگر پھینک دی جائے تو ڈوب جاتی ہے لیکن اس کا قانونِ تسخیر فطرت یہ ہے کہ ہزاروں من وزن کے لوہے کے جہاز کس طرح سے اس کے قانون کے مطابق بط کی طرح سطح بحر پر تیرتے پھر رہے ہیں اور ان میں تم اپنا سامان' یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں لیے چلے جا رہے ہو' کس طرح اس نے ان چیزوں کو مسخر کیا!!

وَ سَخَّرَ لَکُمُ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ دَآئِبَیۡنِ (14:33) سورج اور چاند تک کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے۔ وہ ایک مقررہ قاعدے کے مطابق برابر چلے جا رہے ہیں اور یہ اس لیے کر دیا کہ اس سے اس کی تسخیر آسان ہوتی ہے۔ آپ کسی پرندے کو' کسی جانور کو' پکڑنا چاہیں تو وہ کبھی ادھر نکل جاتا ہے اور کبھی اُدھر نکل جاتا ہے۔ اس کے پکڑنے میں بڑی دقت ہوتی ہے اور اگر کبھی کوئی ایسی صورت ہو کہ وہ کسی دوسرے راستے پہ جا ہی نہ سکے' ایک ہی راستے کے اوپر جا رہا ہو تو اس کی تسخیر آسان ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ چاند اور سورج بڑے عظیم القدر کرّے ہیں۔ سورج کا تو پوچھیے نہیں' زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑا کرّہ ہے اور اس قسم کے کرّے لاانتہا پڑے ہوئے ہیں۔ یہ سورج اور قمر کی تسخیر کے متعلق کہا کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اپنے راستے پر ہی چلتے جاتے ہیں' اِدھر اُدھر نہیں ہٹتے۔ اس لیے ان کا تسخیر کرنا بڑا آسان ہے۔

کائنات کے متعلق چودہ سو سال پہلے کے انکشافات

عزیزانِ من! چودہ سو سال پہلے تو کوئی کیا بتائے گا' آج کا سائنٹسٹ' جو اس وقت چاند پہ جا رہا ہے اور مریخ پہ جا رہا ہے' وہ اسی لیے جا رہا ہے [1] کہ یہ سارے کرّے ایک متعین راستے پر چل رہے ہیں' ورنہ اگر یہ ہو کہ یہاں اپنے حساب اور قاعدے کے مطابق یہ ایک راستہ لیں اور چل پڑیں' اور جب آدھے راہ میں پہنچیں یا قریب پہنچیں تو وہ دوسری طرف نکل جائے' یہ اس کا پیچھا ہی نہیں کر سکتے۔ یہ ہے دَآئِبَیۡنِ (14:33)۔ اور آگے کہا کہ وَ سَخَّرَ لَکُمُ الَّیۡلَ وَ النَّہَارَ (14:33) دن اور رات کو مسخر کیا۔ وَ اٰتٰکُمۡ مِّنۡ کُلِّ مَا

---

[1] ان کی کچھ تاریخ یوں ہے کہ 4 اکتوبر 1957ء میں روس (سابقہ یو ایس ایس آر) نے اسپٹنک نامی مصنوعی سیارہ پہلی بار خلا میں بھجوا کر ایک عالم کو ورطۂ حیرت میں غرق کر دیا۔ 28 فروری 1959ء میں امریکا نے پہلا مخبر سیارہ خلا میں بھیجا۔ ہوا یوں کہ جب 2 دسمبر 1942ء کو ایٹم (Atom) توڑا گیا تو اس سے بے پناہ توانائی حاصل ہوئی یہ تسخیر چاند اور خلا اسی توانائی کا کرشمہ ہے۔

سَاَلْتُمُوْهُ (14:34) اور جس قدر بھی تمہاری اس فزیکل لائف میں احتیاج اور ضروریات کی چیزیں تھیں' اس محسوس دنیا میں اپنی پرورش کے لیے جس جس چیز کی بھی تمہیں ضرورت تھی' اس نے تمہیں دیں۔

قدرت نے انسان کو کیا کچھ نہیں دیا اور اس نے پھر کیا کچھ نہیں کیا

کتنا کچھ دیا ہے؟ اس کے لیے سنیے کہ قرآن کریم کیا کہتا ہے وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (14:34) خدا کی نعمتوں کو گننا چاہو تو تم انہیں گن نہیں سکتے۔ یہ سامانِ رزق ہم نے تمام انسانوں کی پرورش کے لیے دیا تھا لیکن انسانوں نے اسے اپنے قبضے میں لے کر ایسی دست درازیاں شروع کر دیں کہ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (14:34) ہر ایک دوسرے کے حقوق چھیننے لگا اور جو کچھ کسی کے ہاتھ آیا' اسے دبا کر بیٹھ گیا۔ جب تک یہ قومیں تیرے متعین کردہ راستے پر چلتی رہیں' زندگی کی شادابیوں سے بہرہ یاب رہیں۔ جب ان کے نظریہ حیات میں تبدیلی آ گئی تو یہ نعمتیں ان سے چھن گئیں اور وہ دنیا میں ذلیل وخوار ہو گئیں۔ ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس کر راکھ کا ڈھیر بن گئیں اسی لیے اس سے بچنے کے لیے کہا کہ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ (1:7)۔ عزیزانِ من! یہ بات آگے جا کر میں عرض کروں گا کہ نعمتوں کے چھننے کے بعد کسی قوم کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔

خدا کی طرف سے ان پیدا کردہ نعمتوں کا حصول آخر کس طرح ممکن ہوگا

اب سوال یہ ہے کہ خدا کی نعمتیں ملتی کس طرح ہیں؟ یعنی خدا نے ان کو مخلوق کے فائدے کے لیے پیدا تو کر دیا ہے' کرّہ ارض کے دسترخوان پر ان کو بچھا دیا ہے' لیکن یہ ملتی کس طرح سے ہیں اور کن کو ملتی ہیں؟ کیا ایسے ہی بیٹھے بٹھائے مل جاتی ہیں' یونہی مفت میں بلا محنت کے مل جاتی ہیں' بلا مشقت کے مل جاتی ہیں' بغیر کچھ کام کیے ہوئے مل جاتی ہیں؟ جواب میں کہا کہ نہیں' ایسے نہیں ملتیں۔ سورۃ الزمر میں یوں تو الجنۃ کے اعتبار سے بات کہی گئی ہے لیکن میں آگے چل کر عرض کروں گا کہ اخروی زندگی کی جنت پر ہمارا ایمان ہے لیکن جنت صرف اخروی زندگی ہی میں نہیں ملتی۔ جن نعمتوں کا ذکر خدا نے جنت کے حوالے سے کیا ہے' اس دنیا میں ان نعمتوں کے میسر آ جانے' دنیا میں اس پہ صرف قوانینِ خداوندی کے نظام کے قائم ہو جانے اور اس کے تابع زندگی گزارنے کو بھی قرآن جنت کی زندگی قرار دیتا ہے۔ کہا ہے کہ جنت کی زندگی کے اندر جو نعمتیں میسر ہوں گی' انہیں ملنے کے بعد' ان سے متمتع ہونے کے بعد' وہ قوم یہ کہے گی کہ وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا (39:74) وہ کہیں گے کہ مستحقِ حمدیت خدا کی ذات ہے کہ جس نے اپنے وعدوں کو پورا کیا۔ جو کچھ وہ کہتا تھا کہ یہ "کرو گے تو یہ ملے گا" وہ سب کچھ ہمیں ملا۔ وَ اَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ [1] (39:74)۔ ہمیں وہ خطہ زمین عطا

---

[1] اور ہمیں دنیا میں مملکت اور حکومت عطا ہو گئی (24:55;33:27) اور ہمیں اس میں ایسی آزادی مل گئی کہ ہم اس میں جہاں چاہیں رہ سکیں۔ (مفہوم القرآن)

کر دیا' وہ مملکت عطا کر دی جہاں ہمیں کلی اختیار حاصل ہے' جہاں ہمیں کامل آزادی حاصل ہے۔ ہمیں یہ کچھ ہے عطا کر دیا اور آگے ہے کہ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ (39:74) کام کرنے والوں کا بدلہ کتنا انعام والا ہے' کتنی بڑی نعمت والا ہے' کتنا بڑا اچھا ہے! یہ نعم ہے۔ اسے اجر العاملین کہا ہے یعنی کام کرنے والوں کے کام کا اجر ہے۔ تو یہ کام کے اجر کے طور پہ ساری نعمتیں حاصل ہوتی ہیں اور کام بھی پھر ایسا نہیں ہے کہ یونہی اطمینان سے' آرام سے ایک فیکٹری کے اندر بیٹھے ہوئے' دکان کے اندر بیٹھے ہوئے' دفتر کے اندر بیٹھے ہوئے' اس طرح سے ان کاموں سے مل جائے۔

قدرت کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کی خاطر متواتر تگ و تاز کرنا ہوگی

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ کام بھی ضروری ہیں لیکن اس اصول جنت کے راستے میں تو بڑی بڑی دشوار گھاٹیاں آتی ہیں' بڑے خطرات کے میدان آتے ہیں' ایسے خطرات کے میدان کہ جان تک چلی جاتی ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ ان کی زندگی میں ایسا وقت بھی آ جاتا ہے کہ اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ (3:173) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب لوگوں نے ان سے کہا کہ تمہیں کچھ معلوم ہے کہ تمہارے مخالفین نے تم پر چڑھائی کرنے کے لیے' تمہارے مقابلے کے لیے' کتنا بڑا لشکر جمع کر رکھا ہے۔ تمہیں اس کا کچھ علم بھی ہے؟ فَاخْشَوْهُمْ (3:173) اس سے خوف کھاؤ' اس سے ڈرو کہ انہوں نے اتنا بڑا اجرا لشکر تمہارے مقابلے کے لیے اکٹھا کر دیا ہے' یہ خبر سن کر فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا (3:173) ان کے ایمان میں اور اضافہ ہو گیا: بجائے اس کے کہ اس سے وہ خوف کھاتے' ہمت ہار دیتے' ان کا ایمان اور بڑھ گیا۔ وَ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ [1] (3:173)۔ انہوں نے کہا کہ اگر انہیں اپنے اور اپنے لاؤ لشکر پر' ساز و سامان پر اتنا بڑا فخر اور بھروسہ ہے' تو ہمیں بھی اللہ پر بھروسہ ہے۔ ہمارا قوانین خداوندی کی محکمیت پر ایمان ہے اور ہمیں اس پر ایمان ہے کہ جو حق و صداقت کی علم بردار قوم کے ہاں اگر ساز و سامان کی کچھ کمی بھی ہو' افراد کی کچھ قلت بھی ہو' تو اس کے قوانین اور ضابطے کا اتباع اس کمی کو پورا کر دیا کرتا ہے۔ ہمیں اس لیے اس کے قوانین پہ پورا پورا بھروسہ ہے۔ یہ نِعْمَ الْوَكِیْلُ (3:173) ہے اور بھروسے کا یہ سامان اتنا اچھا ہے جو ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھے اور کہا کہ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ (3:174) وہ اللہ کی نعمتوں کی جھولیاں بھر بھر کر میدان جنگ سے واپس لوٹے' انہیں کسی قسم کا نقصان نہ ہوا' انہیں کوئی تکلیف نہ اٹھانی پڑی۔ وہ اس لیے کہ وَّ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ (3:174) انہوں نے اتباع کیا انہوں نے وہ راستہ اختیار کیا جو خدا کا پسند کیا ہوا راستہ تھا۔ اور اس طرح فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ (3:174) وہ اللہ کی نعمتوں سے جھولیاں بھر بھر کر آئے۔ وَ اللّٰهُ

---

[1] اور وہ دل کے پورے اطمینان سے کہتے ہیں کہ دشمن کا لشکر بڑا ہے تو ہوا کرے' ہمارے ساتھ قانونِ خداوندی کی تائید و نصرت ہے اور یہ وہ قوت ہے جس کے بعد کسی اور قوت کی حاجت نہیں رہتی' اور جس پر پورا پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ (مفہوم القرآن)

ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ (3:174) اس کے پاس بہت ساز وسامان ہے تو اس کے ذخیرے میں کوئی کمی نہیں آ جاتی ۔اتنا کیا اتنے سے زیادہ بھی اگر کوئی لے جائے یا ہم ان کو دے دیں تو ان میں کبھی کمی نہیں آتی ۔ہماری نعمتیں تو' جیسے کہا ہے' لا انتہا واقع ہوئی ہیں۔

قرآنی نظام اور سیکولر نظام میں ایک بنیادی فرق ہے

عزیزانِ من! آپ نے دیکھا کہ یہ نعمتیں ملتی کس طرح سے ہیں۔اس مقام پر' دنیا کے سیکولر نظام اور نظامِ خداوندی میں ایک بنیادی فرق سامنے آتا ہے۔نظام کے معنی یہ ہیں کہ انسان' انسانوں کی جماعت' پارٹی' قوم گروہ' اپنے بنائے ہوئے قوانین کے تابع' ایک نظام قائم کرتا ہے' نعمتیں حاصل کرنے میں بھی' وہ اقدار وقوانین خداوندی کی پرواہ نہیں کرتا' سلب اور نہب سے' ظلم اور ستم سے' کمزوروں اور غریبوں کی' ہر متاع کو چھین کر لے جاتا ہے۔

دانا ایں می کارد آں حاصل برد

زمین میں بوتا یہ ہے' فصل وہ کاٹ کے لے جاتا ہے۔

امتے بر امتے دیگر چرد

ہر قوم کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے کھیت سے نہ چرے' دوسرے کے کھیت سے چرے' اور کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

دانا ایں می کارد آں حاصل برد

زمین میں بیج یہ بوتا ہے اور فصل وہ کاٹ کر لے جاتا ہے۔یہ تو ہے نعمتیں حاصل کرنے کا ان کا انتظام ہے۔اور اس کے بعد پھر جس طرح سے جی چاہے' اپنے مفاد کی خاطر' ان کو تصرف میں لائیں' استعمال کریں' نہ یہ کوئی پوچھنے والا کہ تم نے انہیں حاصل کیسے کیا' نہ کوئی یہ پوچھنے والا کہ تم نے انہیں استعمال کس طرح سے کیا۔اسے کہتے ہیں سیکولر نظام۔یہ ہے جسے آپ Sovereign State کہتے ہیں۔اس کی Definition (تعریف) یہ ہوتی ہے کہ وہ Sovereign State ہے جو اپنا حساب کسی کو نہیں دیتی' اس کے اوپر کوئی ایسا نہیں ہوتا ' جو اس سے حساب مانگ لے' یہ پوچھ لے کہ تم نے کیسے لیا' کہاں سے لیا' کہاں صرف کیا؟ یہ جو Sovereignty (حاکمیت) کی آخری اتھارٹی ہے' وہ یہ ہے کہ اس میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا اور اس کے برعکس جو نظامِ خداوندی ہے' اس میں یہ سب نعمتیں حاصل ہوتی ہیں' ملتی ہیں' لیکن آخر الامر یہ سیکولر اسٹیٹ نہیں بنتی۔قرآنِ حکیم نے غلط نظام کے نتائج کو بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔سورۃ التکاثر میں اس غلط نظام کا انجام کچھ اس طرح بیان کیا کہ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ o ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ (102:6-7) یہ وہ جحیم ہے جہاں انسان صلاحیتوں کو' جھلسا دینے والی مار کو' اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔اور پھر انہیں یقین ہو جائے گا کہ واقعی ہمارا غلط نظام' غلط عمل' جو غلط مسلک پر تھا' وہ کس قسم کی تباہی لے کر آیا ہے' وہاں وہ مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہوں گے' زنجیریں پہنائی ہوئی ہوں گی' ان قوموں کو

باز پرس کے لیے عدالت خداوندی میں حاضر کیا جائے گا۔

قرآنِ حکیم نے غلط نظام کے نتائج کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے

عزیزانِ من! بات سمجھانے کا قرآن کا یہ انداز دیکھیے کہا کہ وہاں زنجیروں میں جکڑنے کے بعد پوچھا کیا جائے گا کہ ثُمَّ لَتُسۡئَلُنَّ یَوۡمَئِذٍ عَنِ النَّعِیۡمِ (102:8) ان سے یہ پوچھا جائے گا کہ یہ جو نعمتیں تھیں، تم نے کس طرح حاصل کیں اور پھر ان کو استعمال کس طرح کیا؟ پوچھا جائے گا وہ جو تم اپنے متعلق سمجھتے تھے کہ ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ٹھیک ہے، اس دنیاوی زندگی کے اندر تو تم نے ایسا انتظام کر لیا تھا کہ تمہیں کوئی پوچھنے والا نہ ہو، لیکن تمہیں معلوم ہے کہ وہ خدا کا ایک قانونِ مکافاتِ عمل بھی ہے، جو تمہارے انتظامات سے بلند اور بالا ہے اور وہ خدا کا مکافاتِ عمل ہے، جس کی رو سے جسے ہم تباہی کہتے ہیں آتی ہے اور تباہی کے متعلق کہا کہ وہ ان سے پوچھے گا کہ یہ نعمتیں کیسے حاصل کیں، کہاں خرچ کیں۔ یہی ایک فقرہ تھا۔

حضرت عمر کے الفاظ میں خلافت کی تعریف

عزیزانِ من! جس میں حضرت عمر ♦ (581-644/45AD) نے سمجھا دیا۔ اُن سے پوچھا گیا کہ استخلاف فی الارض یا خدا کی حکومت کسے کہتے ہیں؟ آپ نے کہا کہ جس میں یہ پوچھا جائے کہ کہاں سے کیسے لیا تھا اور کہاں صرف کیا تھا۔ یہ اس قدر جامع ہے کہ دو لفظوں کے اندر ساری بات بتا دی کہ نظامِ حکومت خداوندی کے اربابِ اقتدار کو حساب دینا ہوگا۔ یہ وہی ہیں جنہیں ہم ذمے دار کہیں گے، ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ ایک ایک پائی کے متعلق یہ سمجھیں گے کہ ہمیں اس کا حساب دینا ہوگا، ہم سے ان کے متعلق پوچھا جائے گا۔ ان کی کیفیت مرزا اسد اللہ خاں غالب (1797-1869) کے الفاظ میں یوں ہے کہ

اِک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

نعمتوں کا مل جانا، خدا کا فضل عظیم ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس کی دعا کی گئی تھی، تمنا کی گئی تھی لیکن نعمتوں کے ملنے کے بعد جو اگلا قدم ہے، وہ بڑا سخت ہے۔ پھر ایک ایک کے متعلق پوچھا جائے گا کہ انہیں خدا کے قوانین اور اقدار کے مطابق صرف کیا تھا یا نہیں تو جیسا میں نے شروع میں کہا تھا کہ منعم علیہ وہ قوم ہوگی، جنہیں یہ تمام نعمائے خداوندی حاصل ہوں اور وہ انہیں اقدارِ خداوندی کے مطابق صرف کرے گی۔ یہ جو تم سے پوچھا جائے گا، والی بات ہے، اس کے لیے سورۃ الانبیاء کی دو تین آیات میرے سامنے آ گئیں۔ جی نہیں چاہتا کہ اس قدر جامع، اس قدر بلیغ آیات، ذہن میں آئیں تو میں انہیں زبان پر لائے بغیر آگے بڑھ جاؤں اور آپ احباب کو اس میں شریک نہ کروں۔ کہا کہ وَ کَمۡ قَصَمۡنَا مِنۡ قَرۡیَۃٍ کَانَتۡ ظَالِمَۃً وَّ اَنۡشَاۡنَا بَعۡدَہَا قَوۡمًا اٰخَرِیۡنَ (21:11) کتنی ہی بستیاں تھیں جن کو برباد

کر دیا گیا اور ان کی جگہ دوسری قوموں نے آ کر لے لی۔ یہ کیوں کیا؟ اس لیے کہ كَانَتْ ظَالِمَةً (21:11) وہ ظالم تھیں، ظلم اور استبداد کی بنا پر وہ تباہ و برباد ہوگئیں اور ان کی جگہ دوسری قوموں نے لے لی۔ ان تباہ و برباد ہونے والوں کی کیفیت کیا تھی؟ اس کے لیے کہا کہ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ (21:12) [1]۔ یہاں بڑی عجیب بات قرآن کہہ گیا ہے۔ کہا کہ یہ تباہی یکا یک Over night (شباشب) نہیں آ جایا کرتی۔

مکافاتِ عمل کی گرفت انسانوں کے بنائے ہوئے قانون سے بالاتر بھی ہے اور مضبوط بھی

یہ تو قوموں کے غلط نظام کے تباہ کن نتائج، یا اثرات، آہستہ آہستہ مرتب ہوتے رہتے ہیں اور وہ بڑے بڑے غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے رہتے ہیں: مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ (39:25) ان کا بظاہر پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ تباہیاں مرتب ہو رہی ہیں۔ وہ قوم خوش ہو رہی ہوتی ہے، مگن ہو رہی ہوتی ہے، فخر کر رہی ہوتی ہے کہ ہمیں کون پوچھنے والا ہے۔ کہا کہ جب ان کی اس غلط روش کے غیر محسوس نتائج، آہستہ آہستہ اس مقام پہ پہنچے کہ جہاں ان کا جو نتیجہ تھا، وہ محسوس شکل میں ان کے سامنے آئے تو اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ (21:12) تو وہ وہاں سے بھاگ اٹھے کہ اس تباہی سے بچ جائیں۔

سنیے، عزیزانِ من! قرآن نے کیا نقشہ کھینچا ہے۔ کہا کہ وہ بھاگ رہے تھے اور پیچھے سے ہمارا قانونِ مکافاتِ عمل آوازیں دے رہا تھا کہ لَا تَرْكُضُوْا (21:13) مت بھاگو، تم بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے، رک جاؤ اور رک ہی نہیں جاؤ بلکہ وَ ارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَ مَسٰكِنِكُمْ (21:13) لوٹو، چلو واپس، وہی محلات کے اندر کہ جو تم نے سر بفلک تعمیر کیے ہوئے تھے، جن کی رنگینیاں ان کے خون کی سرخیوں سے آویزاں تھیں، چلو تم، ان میں کہ جن میں تم نے عیش سامانیاں اس طرح جمع کر رکھی تھیں، جن میں تم عیش و عشرت کی زندگی بسر کیا کرتے تھے، چلو: وَ ارْجِعُوْٓا (21:13) لوٹو، چلو، وہاں۔ کاہے کو چلو؟ وہاں کیا ہوگا؟ کہا لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُوْنَ (21:13) تاکہ وہاں تم سے پوچھا جائے کہ یہ کہاں سے لیا تھا، یہ کیسے حاصل کیا تھا، یہ کس کے خونِ جگر کی محنت کا نتیجہ ہے۔ یہ کون سے محنت کش تھے، جن کے پسینے سے یہ بنیادیں کھڑی ہوئیں، جن کی ہڈیوں کے کچومر سے یہ چیزیں کامیاب ہوئیں۔

نعمتوں کا حاصل کرنا اگر مشکل ہے تو پھر ان کو قانونِ خداوندی کے مطابق صرف کرنا مشکل ترین ہے

کہا کہ تم سے پوچھا جائے۔ لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُوْنَ o قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (21:13-14). تباہی دیکھنے کے بعد جب

---

[1] (ان کی غلط روش کے نتائج، غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے چلے جا رہے تھے۔ انہیں ان کے انجام سے آگاہ کیا جاتا تھا کہ وہ اس روش سے باز آ جائیں، لیکن وہ اس تنبیہ پر کان نہیں دھرتے تھے۔ چنانچہ وہ غیر محسوس نتائج، آہستہ آہستہ، آگے بڑھتے گئے، حتیٰ کہ) جب وہ محسوس طور پر سامنے آ گئے تو وہ لگے بھاگنے (7:182;16:26)۔ (مفہوم القرآن از پرویزؒ۔ ص729)

پوچھا جائے گا کہ کہاں سے لیا' تو وہاں اعتراف پہ مجبور ہو جائیں گے کہ ہاں! ''واقعی ہم نے ظلم کیا تھا' سلب ونہب سے یہ چیزیں حاصل ہوئیں تھیں''۔ یہ کہتے چلے جائیں گے لیکن جب تباہی سامنے آ جاتی ہے' جب یہ روش انجام تک پہنچ جاتی ہے تو اس وقت فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰهُمْ (21:15) وہ یہ پکارتے چلے جائیں گے' اس کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ یہ چیختے چلے جائیں گے۔ اگلے الفاظ سنیئے عزیزانِ من! حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ (21:15) تا آنکہ ان کی وہ بستیاں ایسے ہو جائیں گی' جیسے کٹا ہوا کھیت ہو جیسے بجھا ہوا شعلہ ہو۔ یہ ہے لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُوْنَ ❶ (21:13) نعمتوں کے مل جانے سے آدمی بڑا خوش ہوتا ہے لیکن اس کی جو ذمے داریاں ہیں ان کے احساس سے تو انسان کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں سے سرفراز ہونے والوں کی کیفیت اور ذمہ داریاں

عزیزانِ من! اب صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (1:6) کی طرف آئیں۔ اس نعمتِ کبریٰ کی طرف آیئے کہ جس سے اس امت مسلمہ کے افراد خیر امت (3:109) بنے' یہ منتشر ذرے ایک چٹان بنے' وہ جن کے متعلق کہا کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ❷ (48:29) وہ جن کے متعلق اعلان کیا کہ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّ سَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ❸ (2:143). انہیں کہا گیا کہ یہ ہماری کتاب کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نتیجہ تھا کہ تم اس طرح سے ایک امت واحدہ اور امت وسطیٰ بن گئے۔

یاد رکھو! تمہیں تاکید کی جاتی ہے کہ وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا (3:103) تم تمام کے تمام خدا کے اس سہارے کو تھامے رکھو' خدا کی اس کتاب کے ساتھ متمسک رہو' جمیعا رہو: انفرادی طور پہ نہیں' اجتماعی طور پر' ایک نظام کی حیثیت سے' جماعت کی حیثیت سے' ایک امت واحدہ کی حیثیت سے (جمیعا) اور آگے عزیزانِ من! جمیعا ہی صرف نہیں بلکہ وَّ لَا تَفَرَّقُوْا (3:103) فرقوں میں نہ بٹ جانا' پارٹیوں میں تقسیم نہ ہو جانا' ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جانا' گروہ گروہ نہ ہو جانا۔ اس لیے کہ قرآن کے بندھن کا مقصد یہ تھا کہ تمہارے تنکے ایک جگہ مضبوطی سے بندھے ہوئے رہیں۔ ''حبل'' اسی لیے کہا ہے۔ اسی حبل اللہ کے تمسک کا نتیجہ تھا کہ تم ایک امت واحدہ بن گئے تھے۔

---

❶ تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ کچھ کس کی محنت سے بنا تھا اور تمہارا اس پر کیا حق تھا؟ (102:8)۔ (مفہوم القرآن از پرویزؒ)

❷ محمد رسول اللہ اور آپ کے رفقائے کار کی کیفیت یہ ہے کہ یہ حق کے مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت ہیں' لیکن باہم دگر بڑے ہی نرم دل اور ہمدرد (5:54) (ایضاً)

❸ اور تمہیں ایک ایسی قوم بنا دیا جائے جسے تمام دنیا میں بین الاقوامی پوزیشن حاصل ہو۔ جس سے دنیا کی ہر قوم یکساں فاصلے پر ہو۔ وہ نہ کسی کی طرف جھکی ہوئی ہو' نہ کسی سے کھنچی ہوئی اور اس کا فریضہ زندگی یہ ہو کہ وہ تمام اقوامِ عالم کے اعمال کی محاسب و نگران ہو۔ (ایضاً)

خونی رشتہ تو صرف جسموں کو اکٹھا کرتا ہے جبکہ نظریاتی اور ایمانی قوت دلوں کو جوڑ دیتی ہے

یاد رکھو! اس کے ساتھ متمسک رہو گے تو یہ کیفیت ہوگی: جمیعا' اجتماعی طور پر' ولا تفرقوا' کہیں فرقوں میں نہ بٹ جانا اور اس کے بعد کہا کہ وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ (3:103) خدا کی اس نعمت کو یاد کرو اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً (3:103) جب تم ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے' جنہیں ہم مخاطب کر رہے ہیں۔ یہ کوئی پہلی نسل' پہلی قوم نہیں' تمہاری کیفیت یہ تھی کہ تم ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ (3:103) تو خدا نے یہی نہیں کہ تم میں ایک ظاہرہ قسم کی جماعتی زندگی کا اجتماعی نظام قائم کیا' تمہارے دلوں کے اندر ایک دوسرے کی محبت ڈال دی' اس نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا۔ ایمان کا رشتہ ایک ایسی شے ہے کہ وہ جسموں کو صرف اکٹھا ہی نہیں کرتا' وہ دلوں کو اکٹھا کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ (3:103) تم ذرا اپنی پچھلی حالت کو یاد کرو جب تم اجتماعی زندگی کے بجائے' فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ تم ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے' خدا نے اس حالت میں تمہیں ایسا نظامِ زندگی عطا کیا۔ یہ خدا کی نعمت تھی کہ فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ (3:103) تمہارے دل ایک دوسرے سے جڑ گئے۔ تمہارے دلوں کے اندر اس نے باہمی تالیف پیدا کر دی' باہمی جڑنے کی صلاحیت پیدا کر دی' اور اس طرح فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا (3:103)۔ اور اس طرح اپنی نعمت کے صدقے سے تمہیں بھائی بھائی بنا دیا۔

عزیزانِ من! اللہ کی نعمت پر غور فرمایئے کہ تم پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا۔ یہ اللہ کی نعمت ہے کہ اس نے تمہیں بھائی بھائی بنا دیا۔ کہا کہ تمہاری کیفیت کیا تھی؟ وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ (3:103) تو تباہی اور بربادی کے جہنم کے کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا (3:103) ہم تمہیں وہاں سے کھینچ کے واپس لائے۔ ہماری نعمت نے اس جہنم سے تمہیں بچایا' خیر امت بنایا' امت واحدہ بنایا' دنیا بھر میں ''اعلون'' کا مقام عطا فرمایا۔ یہ خدا کی نعمت تھی۔ کیسے حاصل ہوئی تھی؟ صرف حبل اللہ کے تمسک کے ذریعے سے۔ قرآنِ کریم کے اتباع کے ذریعے اور وارننگ دی کہ یاد رکھو! کہیں فرقوں میں نہ بٹ جانا' ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جانا۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (3:103) اس طرح سے خدا اپنی آیات کو نہایت واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ زندگی کا صحیح راستہ تمہارے سامنے آ جائے۔ تم نے کہا تھا کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (1:5) یہ اس لیے ہے کہ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (3:103) کہ تم صحیح راہنمائی کے اوپر چلو۔ آپ نے غور فرمایا' عزیزانِ من! کہ خدا کی یہ نعمت کون سی تھی؟ یہی ہے وہ سب سے بڑی نعمت' عزیزانِ من! کہ جس کے تابع تمام نعمتیں آ جاتی ہیں: ''حبل اللہ کے تمسک کے ذریعے امت واحدہ''۔ اس بات کو سن رکھیے' میں یہ باتیں اس وقت کہہ رہا ہوں کہ جب میں زندگی کے آخری دور میں پہنچ رہا ہوں۔ اس لیے ممکن ہے کہ یہ چیزیں کہنے کا پھر موقع نہ ملے۔

اسلام امت واحدہ کا نام ہے جبکہ فرقوں میں بٹ جانا شرک عظیم

میں یہ عرض کر دوں کہ اسلام نام ہے امت واحدہ کا۔ امت واحد بنتی ہے' خدا کی کتاب قرآنِ کریم کے ساتھ تمسک سے۔ یہی حبل اللہ ہے' اسی سے ان کی جمعیت ہوتی ہے۔ اگر امت' امت واحد نہیں رہی' تو اس میں اسلام نہیں رہتا۔ اگر یہ فرقوں میں بٹ جاتی ہے' ان میں تفرقہ آ جاتا ہے' یہ پارٹیوں میں بٹ جاتی ہے' مختلف مملکتیں بن جاتی ہیں' مختلف قومیں بن جاتی ہیں تو امتِ واحدہ نہیں رہتی۔ سن رکھیے کہ اسلام نہیں آ سکتا جب تک یہ امت واحدہ نہ بن جائے اور امت واحدہ بننے کا ذریعہ صرف قرآن نے بتایا ہے: ''حبل اللہ کے ساتھ تمسک رکھنا''۔ پہلے بھی یہ اسی قرآن کے ذریعے امت واحدہ بنی تھی' اب بھی یہ اسی کے ذریعے امت واحدہ بن سکتی ہے۔ کہا کہ یاد رکھنا' یہ ہے ان تمام نعمتوں کے ملنے کی بنیاد۔ یہ اجتماعی نظام' امت واحدہ' قرآن سے تمسک' اس کے مطابق زندگی کے ہر شعبے کے اندر فیصلے دینا ہے' تو یہ امت واحدہ کی کیفیت ہے' خدا کی طرف سے نعمتیں ملنے کی کیفیت ہے۔

ذرا سورۃ الفاتحۃ کے ایک ٹکڑے سے پیچھے چلیے۔ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ (1:4) اور پھر اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ (1:4) پھر اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ (1:5) اس کے بعد ہے۔ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡھِمۡ (1:6).

''ایاہ تعبدون'' کا عملی ثبوت یہ ہے کہ خدا کی نعمتوں کو کھلا رکھا جائے

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ (1:4) ہم صرف تیری ہی محکومیت اختیار کیے ہوئے ہیں۔ کہا کہ وَّ اشۡکُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ اِیَّاہُ تَعۡبُدُوۡنَ (16:114)۔ تم نے کہا تھا اِیَّاکَ نَعۡبُدُ (1:4) ہم صرف تیری محکومیت اختیار کرتے ہیں۔ کہا کہ اگر تم نے یہ صرف زبان سے نہیں کہا' اگر یہ حقیقت ہے کہ اِیَّاہُ تَعۡبُدُوۡنَ (16:114) واقعی تم اس کی محکومیت اختیار کرتے ہو تو پھر اس کا محسوس ثبوت یہ ہے کہ وَّ اشۡکُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ (3:102) جتنی نعمتیں خدا نے دی ہیں انہیں اس کے بتائے ہوئے اقدار اور اصول کے مطابق صرف کرو۔ اگر تمہارا یہ دعویٰ سچا ہے کہ تم صرف اسی کی محکومیت اختیار کیے ہوئے ہو' تو پھر تم پر خدا کی نعمتوں کا شکر یہ واجب ہو جائے گا اور اگر شکر یہ واجب ہو جائے گا تو پھر کیا ہوگا؟ اس کے لیے کہا کہ وَ اِذۡ تَاَذَّنَ رَبُّکُمۡ لَئِنۡ شَکَرۡتُمۡ (14:7) خدا نے تمہارے لیے یہ اعلان کر دیا کہ اگر تم نے اس کی نعمتوں کو اس کے بتائے ہوئے اقدار کے مطابق صرف کیا تو نہ صرف یہ کہ وہی نعمتیں قائم رہیں گی بلکہ لَاَزِیۡدَنَّکُمۡ (14:7) ہم اور زیادہ بڑھاتے جائیں گے' ان نعمتوں میں اضافہ کرتے چلے جائیں گے۔ وَ لَئِنۡ کَفَرۡتُمۡ اِنَّ عَذَابِیۡ لَشَدِیۡدٌ (14:7) اور اگر تم نے ان سے کفران برتا' ان کو ان طریقوں کے مطابق صرف نہ کیا' تو پھر ہمارا عذاب بڑا ہی سخت ہوا کرتا ہے۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

سورۃ فاتحہ کی آخری وہ آیت جس میں ہمیں اپنا چہرا دیکھتے ہوئے کچھ اپنا علاج بھی کرنا ہوگا

عزیزانِ من! آگے پھر آخری ایک آیت ہے جس حالت میں آج ہم ہیں۔ جب ہم آگے چلیں گے۔ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ (1:7) تو ہم دیکھیں گے کہ بعینہٖ وہی آج ہماری کیفیت آجائے گی۔ یہ خدا کا وہ معیار ہے جسے ہم استعمال کر کے دیکھ سکیں گے کہ ہم ہی مَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ ہیں۔ منعم علیہ نہیں ہیں۔ خدا کی کون سی نعمت ہم کو حاصل ہے' کوئی بھی نہیں اور یہ کہ اب ان حالات میں وہ نعمتیں حاصل کرنے کے لیے کیا کیا جائے؟ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ یہی تو اصل بات ہے۔ دروس تو سارے سن لیے' وعظ بھی سارے سن لیے' قرآن بھی پڑھ لیا' سمجھ بھی لیا' سوال یہ ہے کہ خدا کی نعمت کو حاصل کیسے کیا جائے۔ اس کے لیے اس نے بتا دیا کہ یاد رکھو! ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ لَمۡ یَکُ مُغَیِّرًا نِّعۡمَۃً اَنۡعَمَہَا عَلٰی قَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ ۙ وَ اَنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ (8:53)۔ یہ بڑی اہم اور بنیادی آیت ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ یاد رکھو! خدا کسی قوم سے اپنی دی ہوئی نعمتوں کو نہیں چھینتا تاوقتیکہ وہ قوم خود اپنے اندر ایسی تبدیلی نہیں پیدا کر لیتی۔ انسان کے اندر خارجی دنیا کا انقلاب اور تبدیلی داخلی نفسیاتی تبدیلی کا مظہر ہوتا ہے لہٰذا اگر تم موجودہ حالت میں جب کہ وہ نعمتیں تم سے چھن چکی ہیں' انہیں حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا کرو۔

اب سوال یہ ہے کہ اس نفسیاتی تبدیلی کے معنی کیا ہیں۔ اس کے لیے پہلے یہ سمجھو کہ خدا کے اقدار و اصول و احکام کون سے ہیں۔ انہیں اچھی طرح سے ذہن نشین کرو' پھر انہیں دل کی گہرائیوں میں اتارو۔ اب اگلا سوال یہ ہے کہ دل کی گہرائیوں میں اتارنے کے معنی کیا ہیں؟ آپ پہلے کسی کتاب سے پڑھ کے' حکیم سے پوچھ کے' لوگوں سے سن کے' یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ سنکھیا ہلاکت آفرین ہے' مہلک ہے' اس سے انسان مر جاتا ہے۔ یہ آپ نے ذہنی طور پہ سمجھا ہے اور اس کے بعد پھر آپ اسے اپنے دل کی گہرائی میں لے جاتے ہیں کہ اگر میں نے سنکھیا کھا لیا تو میری ہلاکت ہو جائے گی۔ اس سے آپ کے اندر یہ ایک تبدیلی پیدا ہوتی ہے کہ مجھے سنکھیا نہیں کھانا چاہیے۔ صرف قرآن کے یہ پیغامات اور اس کے اقدار اور اس کے وعظوں کو سننا اور ذہنی طور پہ کہنا کہ ''سبحان اللہ'' کیا بات ہے صاحب! یوں کہیے قرآن کی یا یہ کہہ لیجیے کہ پرویز صاحب! کس طرح قرآن کے حقائق کو سمجھاتے ہیں! ذہنی طور سے تو آپ اس سے مطمئن اور خوش ہو جائیں گے لیکن یہ دل کے اندر اترنے والی بات نہیں ہوگی۔ دل کے اندر اترنے والی بات اس وقت ہوگی جب آپ کے اپنے اندر یہ تبدیلی پیدا ہو کہ اگر میں نے اپنے ہی جذبات کے ماتحت زندگی بسر کی' تو میں تباہ ہو جاؤں گا اور اگر میں اس تباہی سے بچنا چاہتا ہوں تو اس کی ایک ہی شرط ہے' ایک ہی ذریعہ ہے کہ میں خدا کے اقدار کے مطابق اپنے اندر ایک تبدیلی پیدا کر لوں۔ یہ تبدیلی پیدا ہوگی تو پھر خدا کی چھنی ہوئی نعمتیں واپس مل سکیں گی۔

قوم کے اندر یہ تبدیلی پیدا کرنا' عزیزانِ من! میں نے اپنی زندگی کا مشن قرار دیا ہے کیوں؟ اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ کے متعلق بھی

قرآن کریم میں یہی بتایا گیا ہے کہ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ (2:129) آپ کتاب کی' قرآنِ کریم کی' انہیں علیٰ وجہ البصیرت تعلیم دیتے تھے' ان کو حکمت کی باتوں کی' اور قرآن کی تعلیم دیتے تھے اور اس کے بعد ان کی ذات کے اندر ایک تبدیلی پیدا کرتے تھے جس سے ان میں حیاتِ نو پیدا ہو جاتی تھی۔

خدا اور اس کے فرشتے صدیوں سے اسی انتظار میں ہیں کہ ہم اپنی حالت کب بدلتے ہیں

آج بھی یہی طریقہ ہے' کہ عزیزانِ من! قرآن کی اقدار کی تعلیم اس انداز سے دی جائے کہ انسان دل کی گہرائیوں تک میں محسوس کرنے لگ جائے کہ واقعی اس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے مجھے زندگی مل سکتی ہے۔ اگر میں نے اس کی خلاف ورزی کی تو پھر میری تباہی یقینی ہے۔ عزیزانِ من! ان تفصیلات سے آپ سن لیجیے کہ جب ہم کہتے ہیں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (1:6) اور پھر اس کے بعد کہتے ہیں کہ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (1:7) جن پہ تو نے اپنا انعام کیا تھا' تو قرآن کس طرح تفصیلاً بتاتا ہے کہ ہمارے انعامات ہیں کیا؟ جن قوموں کو یہ ملتے ہیں' ان کی کیفیت کیا ہوتی ہے' جن سے یہ نعمائے خداوندی چھن جاتی ہیں' ان کی حالت کیا ہو جاتی ہے؟ پھر اس کے لیے جو اگلے الفاظ ہیں' جو قرآن کی اگلی آیت ہے' اس کا انتظار کیجیے۔ وہ آیت ہے: غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ (1:7)۔ اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط



نواں باب: سورة الفاتحة (آیت 7 اور خلاصہ)



عزیزانِ من! آج کے درس میں ہم سورۃ الفاتحہ کی آخری یعنی ساتویں آیت پر آ گئے ہیں: غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡهِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ (1:7)۔ اس سے پہلے کی دو آیات یہ تھیں: اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ o صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡهِمۡ (1:5-6) یعنی یہ شدتِ آرزو دعا کی شکل میں ہمارے لبوں پر (آئی تھی) کہ اے ہماری ربوبیت کے ذمے دار! تو ہماری رہنمائی ایک توازن بدوش سیدھے راستے کی طرف کر۔ چونکہ یہ چیز Abstract (غیر محسوس) شکل میں سامنے آئی تھی، اُسے ایک محسوس (Concrete) شکل میں پیش کرنے کے لیے یہ کہا کہ یہ اُن لوگوں کی راہ ہے جسے قرآن کریم نے اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡهِمۡ کہا ہے یعنی ان کی راہ جن پر تیری نعمتوں کی، تیرے انعامات کی نوازشِ بے بہا ہوئی۔ اُس کے ساتھ اگلی آیت ہے کہ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡهِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ(1:7). ان آیتوں کا ترجمہ عام طور پر ہمارے ہاں یہ کیا جاتا ہے کہ "دکھا ہم کو راہ سیدھی، راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے اپنا انعام کیا، نہ اُن کی جن پر تیرا غضب ہوا یا جو گمراہ ہوئے۔"

قرآنِ حکیم کے مروّجہ تراجم سے پیدا ہونے والی غیر قرآنی سوچ

نظر بظاہر اس ترجمہ میں کوئی بات قابلِ اعتراض نظر نہیں آتی لیکن ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو اس سے خدا کے متعلق بڑا غلط تصور سامنے آتا ہے یعنی ہم خدا سے یہ کہتے ہیں کہ ہمیں اُن لوگوں کی راہ دکھا، جن پر تیرا انعام ہوا۔ یہاں تک تو بات صاف ہے لیکن اس کے بعد ہم اس سے یہ بھی کہتے ہیں کہ ہمیں ان لوگوں کی راہ نہ دکھا دینا، جن پر تیرا غضب ہوا اور جو گمراہ ہو گئے یعنی معاذ اللہ، ہم کہہ یہ رہے ہیں کہ خدا جہاں ان لوگوں کو اس راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے، جو اس کے انعامات سے نوازے گئے ہیں، وہ ان کی طرف بھی راہنمائی کر دیا کرتا ہے، جن پر اس کا غضب وارد ہوا اور جو گمراہ ہوئے۔ تو ہم اُس سے کہہ رہے ہیں کہ ہماری راہنمائی ان کی طرف کرنا، جن پر تیرا انعام ہوا، دیکھنا کہیں ان کی طرف راہنمائی نہ کر دینا، جن پر تیرا غضب ہوا اور جو گمراہ ہو گئے۔ معاذ اللہ، معاذ اللہ، خدا کے متعلق آپ نے دیکھا کہ یہ تصور کس قدر غلط اور گمراہ کن ہے کہ خدا اُن لوگوں کی طرف راہنمائی کرے گا جن پر اُس کا غضب ہوا اور جو گمراہ ہوئے۔ اسی

ترجمے پر کیا موقوف ہے' آگے چل کر اگر آپ نے میرے دوسرے دروس بھی سنے یا اورلٹریچر بھی پڑھا' تو آپ کے سامنے اس قسم کی خونچکاں داستانیں بھی آئیں گی' جن میں خدا کی ایک صفت ''المضل '' بھی بیان کی گئی ہے یعنی گمراہ کرنے والا :استغفر الله ۔ قرآن کی کئی آیات کی اس قسم کی تفسیریں دی گئی ہیں' جن میں بتایا گیا ہے کہ خدا جسے چاہتا ہے' ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔ اس قسم کی آیات کی صحیح تفسیر کا صحیح مفہوم آپ کو ''مفہوم القرآن'' میں ملے گا اور میری ''کتاب التقدیر''[1] میں بھی اس قسم کی تمام آیات کا صحیح مفہوم مل جائے گا۔

قرآن حکیم کے حقائق کو سمجھنے کے لیے اس کے پیش کردہ تقابلی جائزہ ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے

میں اس وقت کہنا صرف اتنا چاہتا ہوں کہ اگر یہ ترجمہ کیا جائے کہ ''دکھا ہم کو ان لوگوں کی راہ' جن پر تو نے انعام کیا' نہ کہ ان لوگوں کی جن پر تو نے اپنا غضب کیا اور وہ گمراہ ہوئے'' تو اس سے خدا کے متعلق ایک بڑا غلط اور گمراہ کن تصور ذہن میں آتا ہے۔ لہٰذا ان دونوں آیات کا یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ قرآنِ کریم اپنے حقائق و معارف کو' جیسا میں نے پہلے بھی کہا تھا' اضداد کے ذریعے واضح کرتا ہے اور یہ طریقہ بڑا دلنشیں اور مؤثر ہوتا ہے۔ مثلاً وہ نور اور ظلمت' تاریکی اور روشنی' دھوپ اور سایہ' نابینا (اندھا) اور بینا اس قسم کے الفاظ ایک دوسرے کے مقابل لا کر اپنے مقصد کی وضاحت کرتا ہے۔ یہی انداز اس نے زیرِ درس آیت میں بھی اختیار کیا ہے۔ ان دو آیات میں اس کے صحیح معنی یہ ہیں کہ ''ہمیں ان لوگوں کی راہ دکھا' جو منعم علیہ تھے۔ وہ لوگ مغضوب علیہ اور ضالین نہیں تھے۔ یعنی وہ ایسے تھے' ایسے نہیں تھے''۔ جن لوگوں کی راہ ہم دیکھنا چاہتے ہیں' ایک طرف ہم نے Positive (مثبت) طریق پر ان کی خصوصیت بیان کی کہ وہ منعم علیہ تھے' ان پر تیرے انعامات کی بارش ہوئی تھی' اور دوسری طرف ہم منفی (Negative) طور پر بھی یہ کہتے ہیں کہ وہ لوگ وہ نہیں تھے کہ جن پر تیرا غضب ہوا' جو گمراہ ہوئے تھے۔ یہ نہیں کہ تو ہمیں ان لوگوں کی راہ نہ دکھا دینا جن پر تیرا غضب ہوا اور جو گمراہ ہو گئے بلکہ کہا یہ ہے کہ ہم جن لوگوں کی راہ کی طرف راہنمائی چاہتے ہیں یہ وہ لوگ تھے جن پر تیرے انعامات کی بارشیں ہوئیں' یہ وہ لوگ نہیں تھے کہ جن پر تیرا غضب ہوا اور جو گمراہ ہو گئے۔ اس سے مفہوم واضح ہو گیا: ہماری آرزو' ہماری تمنا' ہماری دعا یہ ہوئی کہ ہم اُن لوگوں کے راستے سے بچنا چاہتے ہیں' جن پر خدا کا غضب ہوا یا جو ضالین تھے۔

---

[1] ''کتاب التقدیر'' (دنیا کے مشکل ترین مسئلہ کا' قابل فہم' بصیرت افروز' حل)۔ اس کتاب کے مضامین کی مزید وضاحت کے لیے دیکھیے اس کتاب کے ابواب: قانونِ مشیت (ص ص 235-195)' تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ (ص ص 319-302)' اور یغفر لمن یشآء ویعذب من یشآء (ص ص 341-320)

اللہ تعالیٰ کی نسبت سے غضب کا وہ مفہوم جو انسانوں کے لیے سمجھا جاتا ہے درست نہیں

لفظ ''غضب'' کے بنیادی معنوں میں شدت' قوت' حرارت' غلبہ' استیلا [1] اور گرفت کی محکمیت پائی جاتی ہے۔ جب یہ لفظ انسانوں کے لیے بولا جائے گا تو اس میں غصہ اور غضب آلود جذبات کا ہیجان مقصود ہوگا۔ ہمارے ہاں ''مغضوب الغضب'' ایک عام سی ترکیب ہے جو اس شخص کے لیے بولی جاتی ہے جو اپنے شدتِ جذبات سے پاگل ہو گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ تو انسانی جذبات سے بلند اور منزہ ہے' اس لیے جب اس لفظ کی نسبت خدا کی طرف کی جائے گی تو اس سے مراد خدا کے قانونِ مکافات کی محکم گرفت ہو گی۔ خود اقبالؒ (1877-1938ء) نے کہا ہے کہ

حذر اے چیرہ دستاں' سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

غضب کا مفہوم قانونِ مکافات کی گرفت کا نتیجہ ہے

یہی جو تعزیرات فطرت ہیں' انہیں ہی خدا کا غضب کہا گیا ہے' کیونکہ ہم نے دیکھا ہے کہ اس لفظ کے اندر شدت اور قوت کے ساتھ گرفت اور مواخذہ کے معنی بھی پائے جاتے ہیں۔ قرآنِ کریم کے دیگر مقامات پر اسی مفہوم کو دیگر الفاظ میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ ایک جگہ کہا ہے کہ اِنَّ بَطۡشَ رَبِّکَ لَشَدِیۡدٌ (85:12) یاد رکھو! خدا کی گرفت بڑی محکم ہوتی ہے۔ دوسرے مقام پہ فرعون [2] کے متعلق کہا ہے کہ فَاَخَذۡنٰہُ اَخۡذًا وَّبِیۡلًا (73:16) ہم نے فرعون کو بڑی محکم گرفت سے پکڑ لیا۔ یہی مفہوم خدا کے غضب کا بھی ہے یعنی وہ تباہی اور بربادی جو اس کے اٹل قانونِ مکافات کی رو سے ان قوموں پر واقع ہوتی ہے یا ہوئی ہے' جنہوں نے اس کے صحیح اقدار اور اصولوں سے سرکشی برتی اور تباہ کن' روش پر چلتے رہے۔ اس کے نتیجے میں ان پر تباہی آئی' جسے خدا نے گرفت سے تعبیر کیا ہے' یہ خدا کا غضب ہے۔ جب وہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی گرفت میں آئے تو کہا گیا ہے کہ وہ ''مغضوب علیہ'' تھے' ان سے مواخذہ ہوا تھا' وہ پکڑے گئے تھے' ان کی گرفت ہوئی تھی اور اس گرفت کے نتیجے میں ان قوموں کی تباہی [3] ہوئی۔

---

[1] غلبہ

[2] (ا)۔ پرویزؒ: مطالب الفرقان جلد دوم' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور' 1983ء' ص ص 155 تا 156۔
(ب) کشمکش حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ طٰہٰ' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء

[3] غضب الٰہی کی مستوجب قوم کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں کہ وہ برائیوں میں مبتلا ہیں لیکن کوئی کسی کو اس سے منع نہیں کرتا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک بہت بڑا فریضہ ہے' لیکن جب کسی قوم میں عیوب اس قدر عام ہو جاتے ہیں کہ سوسائٹی ان عیوب کو عیوب ہی نہیں سمجھتی' کوئی کسی کو روکتا ہی نہیں یا اخلاقی جرأت اتنی کمزور ہو جاتی ہے کہ کسی کو روکنے کی ہمت ہی نہیں پڑتی یا منافقت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ انسان ہر دلعزیز ہونے کے لیے ہر ایک کی ہاں میں ہاں ملاتا چلا جاتا ہے تو اس وقت اس قوم کو خدا کا غضب گھیر لیتا ہے۔

مغضوب علیہ کی پہچان خوف وحراس، غلامی کی لعنت میں گرفتار اور غور وتدبر سے عاری ہونا ہے

عزیزانِ من! اس مفہوم کے بعد اب ہم وہ چند آیات سامنے لاتے ہیں، جن میں ''مغضوب علیہ'' کا یہ لفظ استعمال ہوا ہے یا بتایا گیا ہے کہ اس کی تفصیل وتشریح کیا ہے۔ جن قوموں پر خدا کا غضب ہوتا ہے، وہ کس طرح پہچانی جاتی ہیں، ان کی کیفیت وحالت کیا ہوتی ہے، ان کا انجام کیا ہوتا ہے؟ یہ بات صرف تاریخی شواہد سے، سب سے پہلے، ہمارے سامنے آئے گی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے درس اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ (1:4) میں جب ہم نے سب سے پہلے بنی اسرائیل کی داستان کا ذکر کیا تھا اور اس میں یہ کہا تھا، کہ پہلی نعمت جس کی یاد ان کو دلائی گئی، وہ یہ تھی کہ انہیں فرعون کے پنجہ غلامی سے رستگاری نصیب ہوئی، اس سے نجات ملی، تو یہ ایک منفیانہ سی چیز تھی۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کسی مستبد حاکم کے پنجہ غلامی سے نجات حاصل ہونا خدا کا پہلا انعام ہے لیکن جیسا کہ میں نے کہا تھا یہ منفیانہ چیز ہے۔ مثبت طور پر کہا کہ پھر اس قوم کو ہم نے وَ اَنِّیۡ فَضَّلۡتُكُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِيۡنَ (2:47) ان کی ہم عصر اقوام، پر فضیلت اور برتری عطا کی۔ گویا کسی قوم کا آزاد ہونا اور اس کے بعد اپنے ہم عصر اقوام کے مقابلے میں برتری، غلبہ، فضیلت حاصل ہونا، خدا کا انعام بتایا گیا ہے اور اس کے بعد اسی قومِ بنی اسرائیل کے متعلق کہا کہ جب انہوں نے خدا کے بتائے ہوئے راستے کو چھوڑ کر خود ساختہ راستے اختیار کیے، اس کے قوانین واقدار سے سرکشی برتی، تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وَ ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَ الۡمَسۡكَنَةُ ۗ وَ بَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (2:61) ان پر ذلت ومسکنت کا عذاب نازل ہو گیا اور یہ خدا کا غضب تھا۔ دوسری جگہ اس کی مزید وضاحت کر دی۔ اسے ذِلَّةٌ فِی الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا (7:152) کہا یعنی اس سے یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ جو ذلت اور مسکنت کا عذاب ہے وہ اسی دنیا میں ان کے اوپر وارد ہو گیا تھا اور یہ تھا خدا کا غضب۔

ذلت کے مقابلے میں حیاتِ سعی وپیہم اور حرکتِ مسلسل کی اہمیت وافادیت

''ذلت'' کا لفظ ہر قسم کی محتاجی، کمزوری، محکومی، بے کسی، بے بسی، بے چارگی، درماندگی اور پستی کے معنوں میں آتا ہے۔ وہاں (2:47) میں انعام کے طور پر دیگر ہم عصر اقوام پر افضلیت بتائی گئی تھی اور یہاں (2:61) میں کہا کہ ان پر ذلت اور پستی کی مار ماری گئی۔ یہاں پہلا لفظ قرآن نے ''ذلت'' کہا ہے۔ وہ قوم ذلیل ہو گئی، دوسرا لفظ مسکنت کہا ہے۔ (2:61) میں یہ لفظ بڑے گہرے غور وتدبر کا محتاج ہے۔ زندگی حرکت اور حرارت کا نام ہے یعنی شاہراہِ حیات پر مسلسل رواں دواں چلتے رہنے کا نام۔ اسی کو سعی پیہم یا جد وجہدِ دوام کہا جاتا ہے۔ اقبالؒ (1938-1877) کے الفاظ میں ''حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں''۔ [1] یہ چلتے چلے جانا، چلتے چلے جانا ہے اور اس

---

[1] ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں (اقبالؒ: بالِ جبریل)

طرح زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے اپنے نصب العین کی طرف بڑھتے چلے جانا۔ زندگی نام ہی حرکت کا ہے۔

فکری جمود کی بنا پر زندگی کی ارتقا کے رک جانے کا دوسرا نام جہنم ہے

جو قوم کسی مقام پر رک کر کھڑی ہو جائے، وہ زندگی کی حرارتوں سے محروم ہو جاتی ہے۔ یہ ایک مقام پر رک کر کھڑی ہونے والی قوم، درحقیقت، اسی مقام پہ کھڑی نہیں ہوتی بلکہ غور سے دیکھا جائے تو وہ پیچھے ہٹ رہی ہوتی ہے چونکہ چلنے والی قومیں اس سے بہت آگے بڑھ جاتی ہیں۔ لہٰذا ''مسکنت کسی قوم کی ایسی حالت کا نام ہے جہاں وہ آگے بڑھنے سے رک جائے۔'' آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ قرآنِ کریم میں جہنم کے لیے لفظ جحیم بھی آیا ہے اور جحیم کے معنی ہوتے ہیں ''راستے کی روک، جہاں کوئی آگے بڑھنے سے رک جائے''۔ جہنم اس کیفیت کا نام ہے ''جہاں کسی انسان کی ذات یا کوئی قوم آگے بڑھنے سے رک جائے''۔ ایک مقام پر ٹھٹھر کر رہ جائے۔ خدا کے اس اصول کو ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ جو نعمتیں کسی قوم کو حاصل ہوں وہ ان سے کبھی نہیں چھینی جاتیں، جب تک وہ قوم اپنی نفسیاتی دنیا میں تغیر پیدا نہ کرے۔ لہٰذا جو قوم کسی ایک مقام پر رُک جاتی ہے، اُس سے یہی مراد نہیں کہ اس کے پاؤں چلنے سے رُک جاتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اس میں فکری جمود پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھنا، سوچنا چھوڑ دیتی ہے۔ وہ تقلید کا مسلک اختیار کر لیتی ہے۔ وہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتی ہے کہ زندگی کے حقائق اور مسائل کے متعلق جو کچھ سوچا جانا تھا، وہ سوچا جا چکا ہے، سفرِ حیات میں جس قدر مسافت طے کرنا تھی، وہ طے کی جا چکی ہے، یہی ہماری منزل اور منتہائے مقصود ہے، ہمیں اس سے آگے نہیں بڑھنا۔ اس کے لیے ان کے پاس سند صرف یہ ہوتی ہے کہ یہ وہ مسلک ہے جسے ہمارے آباءواجداد یعنی اسلاف نے اختیار کیا تھا۔ قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر اس عقیدے کی شدت سے تردید کی ہے اور واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ جو قوم سمجھنا، سوچنا چھوڑ کر، ذہنی اور فکری طور پر، مسکنت اور جمود کے عذاب میں گرفتار ہو جائے، وہ قوم موجبِ غضب الٰہی ہو جاتی ہے۔ مثلاً قرآنِ کریم میں قومِ عاد کی تباہی کی داستان کے سلسلے میں فرمایا کہ جب ان کی طرف خدا کے پیغمبر حضرت ہود ◆ نے انہیں خدائے واحد کی محکومیت اختیار کرنے کی دعوت دی، تو انہوں نے اس کے جواب میں کہا کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم اپنے اسلاف کا مسلک چھوڑ دیں؟ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ہود ◆ کی زبان سے یہ کہلوایا کہ تمہاری یہ روش اور اس پر قائم رہنے کی ضد اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ وَقَعَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ رِجۡسٌ (7:71) تم خدا کے غضب میں آ چکے ہو، تم مغضوب علیہ ہو چکے ہو۔

قرآن حکیم کی آئینہ نما تعلیم ہمیں قدم قدم پر دعوت فکر دیتی ہے

عزیزانِ من! جو قوم آگے بڑھنے سے انکار کرے، جس کی نگاہیں صرف ماضی کی طرف رہیں، جو کسی ایک مقام پر جامد اور ساکن کھڑی ہو جائے، اور اس کے جواز میں سند یہ پیش کرے کہ یہ ہمارے اسلاف کا راستہ ہے، ہم اس کو نہیں چھوڑنا چاہتے، تو قرآن نے کہا

ہے کہ ان سے کہہ دو کہ یہ اس امر کی شہادت ہے کہ تم پر خدا کا غضب نازل ہو چکا ہے، تم مغضوب علیہ قوم بن چکے ہو۔ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ سنو! اس قسم کی روش پر ضد کرنے والی قوم جب مغضوب علیہ ہو جاتی ہے تو اس کے متعلق کہہ دیا جاتا ہے کہ وَ قَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ❶ (7:72) وہ چونکہ ہمارے قوانین کی تکذیب کرتی تھی، اس لیے اس قوم کی جڑ کٹ گئی۔ اس طرح مغضوب علیہ قوم وہ ہے جو زندگی کی تمام شادابیوں اور سرفرازیوں سے محروم ہو جاتی ہے، جس میں حرکت اور حرارت باقی نہیں رہتی اور اس کے شجر حیات کی جڑ تک کٹ جاتی ہے۔ یہ ہوتی ہے نشانی اس قوم کی، جو خدا کے غضب کی مستحق ہو چکی ہو۔

منعم علیہ قوم کی جرأت و استقلال ہمیشہ بمثل چٹان ہوتی ہے

اب ذرا آگے بڑھیے۔ آپ کو یاد ہے کہ ''منعم علیہ'' قوموں کے سلسلے میں قرآن نے یہ بھی کہا تھا کہ ان اقوام کے افراد مجاہدین ہوتے ہیں۔ جب ان سے کسی نے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے خلاف تمہارے دشمنوں نے کتنا بڑا لشکر جرار تیار کر رکھا ہے، ان سے ڈرو تو اس سے ان کا ایمان اور بڑھ گیا۔ انہوں نے کہا کہ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ (3:173) اگر انہوں نے اتنا لشکر عظیم جمع کر رکھا ہے تو ہم اس سے ڈرتے نہیں ہیں، ہمارے پاس وہ سر و سامان اور وہ قوت و تقویت ہے جو ان لوگوں کو حاصل ہی نہیں ہو سکتی جو خدا کے قوانین اور اقدار کے خلاف چلتے ہیں۔ اس لیے ہمیں ان سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس کے بعد یہ ہے کہ یہ لوگ صرف میدانِ جنگ سے خدا کی نعمتوں کی جھولیاں بھر بھر کر واپس لوٹے۔ ایک نقشہ یہ تھا۔ اس کے برعکس متضاد مثال دینے کے لیے قرآن نے یہ کہا کہ کشمکش حق و باطل میں، یہ جو کفر اور اسلام کی جنگ ہوتی ہے، اس میں اگر کوئی میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگ اٹھتا ہے، تو اس پر خدا کا غضب وارد ہو جاتا ہے۔ جنگِ بدر کا واقعہ ❷ اس کی بہترین مثال ہے۔

جنگِ بدر کا میدان منعم علیہ قوم کی ایک لازوال مثال ہے

عزیزانِ من! غور کیجیے کہ قرآنِ کریم نے یہاں پہنچ کر کس قدر محسوس (Concrete) مثال دی ہے۔ جنگ بدر کا واقعہ ❷ ہماری تاریخ میں ہی نہیں، دنیا کی تاریخ کے اندر بھی ایک نادر واقعہ ہے۔ حق و صداقت کی علمبردار یہ قوم، مکے کو چھوڑ کر مدینے آ گئی لیکن مخالفین نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ ایک لشکرِ جرار لے کر ان کے پیچھے آ گئے۔ یہی تھا وہ لشکرِ جرار جس کے متعلق اس آیت میں مخالف لوگوں نے حق و صداقت کی اس علمبردار قوم کے متعلق کہا تھا کہ ان سے ڈرو۔ یہ مدینے میں، یوں کہیے کہ پناہ گزینوں کی ایک مختصر سی جماعت تھی، اتنی مختصر کہ وہ میدانِ جنگ میں پہنچی ہے، تو تاریخ کے اعتبار سے تین سو یا تین سو بارہ کے قریب ان کے کل سپاہی تھے۔ اس حالت میں یہ اتنی مختصر سی

---

❶ اور جن لوگوں نے ہمارے قوانین کو تسلیم نہیں کیا تھا، انہیں جھٹلایا تھا، ان کی جڑ کاٹ ڈالی۔

❷ 17 رمضان 2ھ بمطابق 13 مارچ 624م۔

جماعت تھی: بے کس و بے بس، بے سروسامان، پناہ گزین، لیکن یہ وہ جماعت تھی، جسے قرآن نے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ؕ وَ الَّذِیْنَ مَعَہٗٓ (48:29) کہہ کر پکارا ہے۔ یہ وہ جماعت تھی جنہوں نے خدا کے ہاتھ اپنی جان اور مال بیچ دی ہوئی ہے۔ یہ وہ تھی کہ دشمنوں کے لشکر جرار سے ان کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ یہ جماعت اس میدان میں گئی۔ اب ظاہر ہے کہ اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس جماعت میں سے کوئی فردِ دشمن کے مقابلہ سے منہ موڑ کر، پیٹھ دکھا کر، میدانِ جنگ سے بھاگ جائے لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ ہمارے لیے، آنے والوں کے لیے، یہ بتانے کے لیے، کہ حق و باطل کے معرکے میں پیٹھ دکھانے والے کا کیا حشر ہوتا ہے، میدانِ جنگ بدر کا نقشہ سامنے لاکر یہ کہا کہ یاد رکھو، سن رکھو! اس صف میں کھڑے ہونے والے دشمن کے مقابلے میں، ایک بنیانِ مرصوص کی طرح، یہاں کھڑے ہیں۔ قرآن نے ان کو بنیان مرصوص کہا ہے، سیسہ پلائی ہوئی دیوار، کہ جس میں کوئی اینٹ کسی دوسری اینٹ سے الگ ہو ہی نہیں سکتی۔ ان کے متعلق کہا ہے کہ وَ مَنْ یُّوَلِّھِمْ یَوْمَئِذٍ دُبُرَہٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَۃٍ (8:16) یاد رکھو، آج اگر کوئی شخص اس میدان سے پیٹھ دکھا کر، پیچھے کی طرف لوٹا، سوائے اس کے کہ وہ پینترا بدلنے کے لیے ایسا کرے یا اپنی جماعت میں ملنے کے لیے ایسا کرے، یعنی فوج کی تکنیک کے اعتبار سے ایسا کرے، تو وہ تو بات نہیں ہے کہ میدان کو چھوڑ دے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی شخص آج پیٹھ دکھا کر بھاگا، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ (8:16) خدا کا غضب اس پر وارد ہو جائے گا۔ وَ مَاْوٰہُ جَھَنَّمُ (8:16) اور وہ سیدھا جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

جنگ بدر کے دوران نبی اکرم کی موجودگی میں صحابہ کرامؓ جیسی سیسہ پلائی ہوئی منعم علیہ جماعت کو خالق کائنات کی طرف سے ایک تاریخی وارننگ

عزیزانِ من! آپ نے دیکھا کہ حق و باطل کی آویزش اور کشمکش اس قوم کے ایمان کا کتنا بڑا Test (امتحان) ہوتی ہے۔ اس کے لیے مثال وہ دی کہ جہاں اس کا وقوع ہی ناممکنات میں سے تھا لیکن کہا یہ کہ عام مومنین اور تم تو ایک طرف رہے، یہاں صحابہ کی جماعت ہے، میدانِ جنگ ہے اور نبی اکرم ﷺ قائد ہیں۔ اس وقت بھی یہ کہا کہ یاد رکھو! آج اگر تم میں سے کوئی شخص بھی پیٹھ دکھا کر، اس میدان سے بھاگا، تو اللہ کا غضب اس کے اوپر وارد ہو جائے گا اور وہ سیدھا جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ یہاں پہلی آیت میں جسے منعم علیہ بتایا تھا دکھا دیا کہ وہ قوم کون سی تھی اور دوسری میں جسے مغضوب علیہ بتا دیا، وہ قوم کون سی ہوتی ہے۔

پچھلے درس میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ منعم علیہ قوم یا جماعت کی علامت یہ ہوتی ہے کہ فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ (3:103) ان میں محبت اور مودّت اس قدر گہری اور شدید ہوتی ہے کہ ان کے جسم ہی نہیں، ان کے دل ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہوتے ہیں اور فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا (3:103) خدا کی نعمت ہے کہ جس کی بنا پہ وہ بھائی بھائی بن گئے۔ دوسری طرف یہ کہا کہ یاد رکھو! وَ مَنْ

يَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا (4:93) جس شخص نے کسی دوسرے مومن کو بالارادہ قتل کر دیا' کسی ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان کو بالارادہ قتل کر دیا' تو فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيۡهَا (4:93) اس کی سزا جہنم ہے' جس میں وہ رہے گا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ (4:93) اور خدا کا غضب اس پہ نازل ہو جائے گا۔ وَ لَعَنَهٗ (4:93) اور وہ اس کی تمام نوازشات سے محروم ہو جائے گا۔ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيۡمًا (4:93) اور وہ سخت ترین عذاب میں مبتلا ہو جائے گا۔ ایک مسلمان اگر بالارادہ دوسرے مسلمان کو قتل کرتا ہے' باقی الفاظ کو چھوڑ دیجیے' اسی کو دیکھیے کہ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ (4:93) اس پر خدا کا غضب نازل ہو جاتا ہے' وہ قوم مغضوب علیہ ہو جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ منعم علیہ وہ قوم تھی' جن کے دل باہم جڑے ہوئے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے بھائی بھائی تھے اور اگر کسی ایک مومن کو بھی کسی دوسرے نے بالارادہ قتل کر دیا تو وہ قوم مغضوب علیہ ہو جاتی ہے' اس کے اوپر اللہ کا غضب نازل ہو جاتا ہے' پھر اس کا مسکن جہنم ہوتا ہے۔

قرآن حکیم کی شہادت کے باوجود صحابہ کرامؓ کے سلسلہ میں جنگ جمل اور جنگ صفین کے متعلق ہماری تاریخ کا کردار

عزیزانِ من! اگر آپ اجازت دیں تو اس مقام پہ میں بتاؤں کہ ہماری تاریخ نے ہمارے ساتھ کیا غضب کر رکھا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہماری صدرِ اوّل کی تاریخ[1]' یعنی عہدِ رسالت مآب اور عہدِ صحابہ ؓ کی تاریخ (610-661AD)' قریباً اڑھائی سو سال بعد' بغیر کسی Previous written (سابقہ تحریری) ریکارڈ کے مرتب ہوئی اور جنہوں نے مرتب کی' میں ان کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اس تاریخ کی بے شمار مثالیں میں نے پیش کی ہوئی ہیں لیکن اس تاریخ کی ایک مثال میں پھر آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ یہاں کہا یہ گیا ہے کہ کسی ایک مومن نے کسی ایک دوسرے مومن کو ارادۃً قتل کر دیا تو اس پر خدا کا غضب نازل ہوگا' وہ جہنم میں جائے گا' اس کے اوپر لعنت ہوگی' عذابِ عظیم ہوگا۔ ایک ہی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک مومن کے بالارادہ قتل پر اتنا کچھ کہا ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ ہماری تاریخ ہمیں کیا بتاتی ہے؟ عام مومن نہیں' بلکہ صحابہ کبار کی جماعت کے متعلق قرآن کی شہادت یہ ہے کہ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ (5:119) وہ اللہ سے راضی ہو گئے' اللہ ان سے راضی ہو گیا۔ ان کے متعلق بالفاظ صریح قرآن نے یہ کہا ہے کہ ان کے لیے جنت انتظار کر رہی ہے' ان کے لیے بشارتیں ہیں۔ ان کے لیے' جنہیں محمد رسول اللہ والذین معہ کہہ کر پکارا ہے' خدا کی طرف سے یہ کہا ہے کہ اَشِدَّآءُ عَلَى الۡكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيۡنَهُمۡ (148:29) یہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ نہایت محبت وسلوک رکھنے والے ہیں اور دشمن

---

[1] 610-661ء جس میں عہد محمد صلی اللہ علیہ وسلم 610-632AD' (23 سالہ دور نبوت) جس میں 610-622AD صدر اول اور 632-622 عہدِ رسالت مآب، 632-661AD عہد صحابہ کرامؓ یعنی 634-632ء حضرت ابوبکر صدیقؓ کا دور' 645-634ء حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دور' 645-656AD کا عہد حضرت عثمان غنیؓ اور 656-661AD کا حضرت علیؓ کا دور مبارک شامل ہے۔

کے مقابلے میں ایک سخت چٹان کی حیثیت رکھنے والے اور رُحَمَآءُ بَیۡنَهُمۡ (148:29) یہ صحابہ کبار پورے کے پورے بھائی ہیں، ایک دوسرے کے دل ملے ہوئے ہیں۔

حضرت علیؓ، حضرت عائشہ صدیقہ اور پھر حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہ کے مابین جنگ میں 10 ہزار اور 70 ہزار صحابہ کی شہادت معاذ اللہ!

اب آپ انہیں ہماری اس تاریخ کی رو سے دیکھیے۔ ان کی یہ تاریخ ہمارے سامنے کس قدر غلط پیش کی گئی ہے۔ یہ تاریخ بتاتی ہے کہ صحابہ کی یہ پوری جماعت، حضرت عثمان ◆ کی شہادت (661AD) کے بعد، یہ پورے صحابہ، دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ کی قیادت حضرت عائشۃ الصدیقہ ◻ کر رہی تھیں۔ دوسرے گروہ کی قیادت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کر رہے تھے۔ سارے صحابہ ان دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ یہ دونوں گروہ میدانِ جنگ کے اندر آپس میں جنگ و جدال میں مصروف ہوئے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس ایک جنگ کے اندر دس ہزار کے قریب صحابہ شہید ہوئے، استغفر اللہ، اور اس سے تھوڑے ہی عرصے کے بعد پھر جو اگلی جنگ صفین ہوئی، اس میں ایک طرف حضرت علی ◆ اور دوسری طرف حضرت معاویہ ◆ تھے۔ اس میں بھی دونوں طرف سارے صحابہ ہی تھے۔ ان کی کیفیت کیا تھی؟ اس کے بارے میں تاریخ بتا رہی ہے کہ میدان جنگ میں ہماری فوج کے ستر ہزار سے بھی زیادہ افراد شہید ہوئے۔ معاذ اللہ! سوچیے، عزیزانِ من! جب یہ تاریخ ہم دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں تو ہم سے پوچھتے ہیں کہ یہی تھا وہ درختِ طیب جو نبی اکرم ﷺ نے لگایا تھا اور اس کے یہی تھے پھل، کہ قرآن ایک مومن کے بالارادہ قتل کے متعلق یہ کہتا ہے اور یہاں کیفیت یہ ہے کہ یہ سارے مومنین ایک دوسرے کے مقابل میں کھڑے ہیں، ایک جنگ میں دس ہزار ایک دوسرے کے ہاتھوں سے مارا جاتا ہے، دوسری جنگ میں ستر ہزار ایک دوسرے کے ہاتھوں سے قتل کیا جاتا ہے اور سارا بالارادہ ہے۔ معاذ اللہ، معاذ اللہ۔ عزیزانِ من! یہ ہے وہ تاریخ جس کی رو سے میں انکار کرتا ہوں کہ یہ بہت بڑی سازش ہے جو ہمارے خلاف کی گئی ہے۔ بہرحال یہ تو ایک ضمنی نکتہ تھا۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ اگر کوئی مومن دوسرے مومن کو بالارادہ قتل کر دے تو خدا کا غضب اس کے اوپر نازل ہو جاتا ہے۔

قرآن حکیم کے مکمل ضابطہ حیات کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے آئین کا نفاذ بغاوت ہوگی

قرآنِ کریم کی ایک اور حقیقت بھی بڑی ہی جامع اور عبرت آموز ہے۔ قرآن ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور مکمل ضابطہ حیات ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اسے پورے کا پورا اختیار کیا جائے گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ اس میں سے کچھ حصہ ہم اختیار کر لیں اور دوسرے حصے کو چھوڑ دیں یا اس کی جگہ اپنے بنائے ہوئے قوانین یا دوسروں سے مانگے قوانین شامل کر لیں۔ یہ روش ایمان کی روش نہیں ہے، یہ شرک کی روش ہے۔ اسلام کو اختیار کرنا ہے تو کافتہً پورے کا پورا ضابطہ، اختیار کرنا ہوگا۔ کبھی آپ نے یہ سنا ہے کہ کسی مملکت میں رہتے ہوئے کوئی شخص اس

مملکت کے آئین کے ایک حصے کو تو مانے اور دوسرے حصے سے انکار کر دے۔ کیا آپ اُسے اس مملکت کا وفادار شہری تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوں گے؟ وہ تو مملکت کا غدار کہلائے گا' باغی کہلائے گا۔ جرم اور چیز ہے' لغزش اور چیز ہے' خطا اور چیز ہے لیکن کسی مملکت کے آئین کے کسی حصے سے اس کی ایک شق سے بھی' انکار کرنا کہ میں اسے نہیں مانتا' میں اس کی جگہ دوسری مملکت کا جو آئین ہے' اس کی شق یہاں رکھنا چاہتا ہوں' بغاوت ہے۔ اسی کو قرآن شرک کہتا ہے۔

قرآن حکیم کے ضابطہ حیات کو مکمل طور پر تسلیم نہ کرنے کی ایک قرآنی مثال

عزیزانِ من! اس کی مثال سورۃ البقرۃ میں دیکھیے جہاں یہودیوں کا قصہ آیا ہے۔ وہاں قرآن نے بڑی عمدہ مثال دے کر کہا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ پہلے تو اپنے میں سے کمزور اور غریب لوگ' جو ذرا سا بے سہارا رہ جاتے ہیں' ان کو یہ اپنے گھروں سے نکال دیتے ہیں اور اس نکالنے کے بعد جب انہیں دوسری قوم کے افراد پکڑ کر لے جاتے ہیں اور غلام بناتے ہیں' تو پھر یہ باہمی مل کر چندہ اکٹھا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چلیے' ان کا کفارہ دے کر ان کو چھڑا لائیں اور کہتے یہ ہیں کہ قیدیوں کو چھڑانا بڑا ثواب کا کام ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ قیدیوں کو چھڑانا تو ثواب کا کام ہے اور وہ جو تم نے ان کو گھروں سے نکالا تھا' اس کے متعلق کیا خیال ہے؟ خدا کا قانون تو یہ ہے کہ جو اپنے ہیں' ان کو ان کے گھروں سے نہ نکالو۔ اگلی چیز یہ ہے کہ اگر کوئی اتفاق سے' کسی دوسرے کی گرفت میں آ جائے تو اسے اس سے چھڑاؤ۔ دونوں چیزیں اکٹھی کرو۔ لیکن تمہاری کیفیت یہ ہے کہ جو قانون کا پہلا حصہ ہے' اس سے تو علی الرغم سرکشی برتتے ہوئے ان کو گھروں سے نکالتے ہو' اور جہاں یہ لکھا ہے کہ قیدیوں کو چھڑانے سے ثواب ہوتا ہے' بھاگ کر اس کے متعلق آگے جاتے ہو۔ کہا کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَ تَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (2:85) کیا تمہاری یہ کیفیت ہے کہ تم خدا کے ضابطہ قانون کے ایک حصے کو تو مانتے ہو اور دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو۔

قرآن حکیم کا آئین ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے

قطعی طور پر ذہن میں تو یہ آئے گا کہ ٹھیک ہے جی' اس سے انکار کرنے سے جو سزا ہے وہ تو ملنی چاہیے لیکن اس کا جو حصہ مانا ہے اس کی تو جزا' اس کا تو بدلہ' ملنا چاہیے۔ قرآن کہتا ہے کہ تم نے یہ سمجھا ہی نہیں ہے کہ آئین یا قانون ناقابلِ تقسیم وحدت (Indivisible Unit) ہوتا ہے۔ آپ کسی طبیب سے کوئی نسخہ (Prescription) لیجیے اور اس میں سے اس نسخے کے کچھ اجزا تو وہ رکھیے جو اس طبیب نے لکھے ہیں اور کچھ اجزا دوسرے کسی اور کے ہاں سے' مثلاً ایلو پیتھک ڈاکٹر کے ہاں سے' وید کے ہاں سے' لے کر شامل کر دیجیے اور پھر یہ دونوں ملا کر اس نسخے کو پی لیجیے اور پھر دیکھیے کہ آپ کا حشر کیا ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ ہے تمہاری روش۔ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَ تَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (2:85) ایک حصہ پر ایمان رکھتے ہوئے دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ فما جزاء

مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (2:85) جو بھی ایسی روش اختیار کرے گا' یاد رکھو! اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ اس دنیا کی زندگی میں بھی وہ ذلیل اور خوار ہوگا وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ (2:85) اور قیامت کے دن اس سے زیادہ شدید عذاب کے اندر وہ گرفتار ہوگا۔ یہ جو ثنویت (Dualism) ہے' قرآنِ کریم نے اسے شرک کہہ کر پکارا ہے اور اسی لیے اس نے یہ کہا ہے کہ وَ مَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُھُمْ بِاللّٰہِ اِلَّا وَ ھُمْ مُّشْرِکُوْنَ (12:106) اکثر لوگوں کی کیفیت تم یہ دیکھو گے کہ وہ مومن کہلاتے ہوئے بھی مشرک کے مشرک ہی رہتے ہیں۔

کسی مغضوب علیہ قوم سے کسی قسم کی مصالحت کرنا خود کو مغضوب علیہ بنانا ہے

قرآنِ کریم نے ''غضب'' کے لیے ایک اور لفظ بھی اپنے ہاں استعمال کیا ہے۔ وہ ہے ''سخط''۔ اس کا مادہ ''س خ[1] ط'' ہے۔ قرآنِ کریم نے سخط اللہ (5:80) کہا ہے کہ یہ لوگ جو خدا کے اس قانون کا کچھ حصہ تو تسلیم کرتے ہیں اور وہ لوگ جو خدا کے اس قانون سے متنفر ہوتے ہیں' اس سے منکر ہوتے ہیں ان سے یہ کہتے ہیں کہ سَنُطِیْعُکُمْ فِیْ بَعْضِ الْاَمْرِ [2] (47:26-47-26) کوئی بات نہیں ہم اسے بھی مانتے رہتے ہیں اور بعض امور میں ہم تمہاری بھی اطاعت کریں گے۔ ان کے ساتھ وہ اس قسم کا معاملہ اور سازشیں کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ اس وقت تمہیں کیا بتائیں کہ ان کی حالت کیا ہوگی جب موت ان کے سامنے آ کھڑی ہوگی' اور ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج عذاب بن کر ان پر مسلط ہو جائیں گے اور ان کا کچومر نکال دیں گے (47:27)۔ یعنی جو خدا کے منکرین ہیں' ان کو جب اس دنیا سے لے جا رہے ہوں تو اس وقت جو ان کی کیفیت ہوگی وہ اس وجہ سے ہوگی کہ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰہَ وَ کَرِھُوْا رِضْوَانَہٗ (47:28) انہوں نے ان کا اتباع کیا جن پر خدا کا غضب نازل ہوا ہے۔ تو یہاں سے یہ نظر آیا کہ خود اس قسم کا جرم کرنا تو ایک طرف رہا' جو خدا کی مغضوب علیہ قوم ہو' اس کے ساتھ اس قسم کا Compromise (مصالحت) کرنا بھی' اس قوم کو خدا کا مغضوب علیہ بنا دیتا ہے۔

سوسائٹی کے اندر رزق کی مساویانہ تقسیم نہ رکھنے کے نتائج

اب آیئے اس میدان کی طرف' جو ویسے ہی پوری تاریخِ انسانیت میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ہمارے اس دور میں تو اس نے بہت

---

[1] ناپسندیدگی' کراہت' نارضامندی' غضب' غصہ' سخط علیہ وہ اس پر ناراض ہوا۔ سخط اس نے ناپسند کیا' کراہت کی۔ اسخطہ اس نے اسے ناراض کر دیا۔ صاحبِ تاج کے حوالے سے لغات القرآن' جلد سوم' ص860 پر یہ معنی دیئے گئے ہیں۔ ماسخط اللہ کے معنی ہیں ''وہ امور جو قوانینِ خداوندی کے مطابق نہیں اور جن کا نتیجہ حبطِ اعمال ہے۔ (حوالہ لغات القرآن جلد سوم از پرویزؒ' ص861)

[2] ہم بعض امور میں تمہاری اطاعت کریں گے۔

ہی اہمیت اختیار کر رکھی ہے۔ یہ اکنامکس یا معاشیات کا دور ہے۔ پچھلے درس میں' میں نے عرض کیا تھا کہ ''منعم علیہ'' انہیں کہتے ہیں' جنہیں خدا کی نعمتیں میسر ہوں اور وہ خود تنہا اپنے لیے ان کو سمیٹ کر نہ رکھ لیں' بلکہ محتاجوں کو اوران لوگوں کو جنہیں ان کی ضرورت ہے۔ آوازیں دے دے کر بلائیں' اوران کے اندر شریک کریں۔ یہ تو رزق کی تقسیم کا طریق تھا۔ یہ تھا متوازن طریق یعنی پوری قوم کا پورا توازن برقرار رہے۔ یہ صورت نہ ہو کہ اس میں کوئی طبقہ تو ایسا ہے کہ جس کو اس قدر فراوانی سے یہ چیزیں حاصل ہیں اور دوسرا طبقہ ایسا ہے جو نانِ شبینہ تک سے بھی محتاج ہے۔ اس سے تو آپ نے دیکھا کہ توازن بگڑ جاتا ہے۔ اسے قرآن نے بڑے عجیب انداز میں کہا ہے۔ پچھلی دفعہ آپ نے یہ تو سن لیا تھا کہ خدا نے کہا تھا کہ اس کا غضب خوف اور بھوک کی شکل میں نازل ہوتا ہے۔ یہاں ایک اور چیز کہی ہے کہ وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ ۢ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا (28:58) بہت سی قومیں مفلسی اور غریبی کی وجہ سے تباہ نہیں ہوئیں بلکہ دولت کی فراوانی کی وجہ سے تباہ ہوگئیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اس فراوانی میں انہوں نے کیا کیا' جس کی وجہ سے وہ تباہ ہوگئیں؟ سنیئے' عزیزانِ من! کیا الفاظ ہیں! کہا کہ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ (20:81) خدا کے عطا کردہ رزق کو حلال اور طیب طریق سے کھاؤ۔ حلال اور طیب طریق کی تشریح آگے کردی کہ وَ لَا تَطْغَوْا فِيْهِ (20:81) ایسا طریق اختیار نہ کرو جس سے تقسیم رزق غیر متوازن ہوجائے۔ وَ لَا تَطْغَوْا فِيْهِ (20:81) کا یہ مفہوم سورۃ الرحمٰن کی اس آیت سے واضح ہے جہاں کہا گیا ہے کہ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ (55:8) تم ترازو میں' میزان میں' عدمِ توازن نہ پیدا ہونے دو۔ رزق کی تقسیم میں ڈنڈی نہ مارو' ترازو میں عدم توازن نہ پیدا ہونے دو۔ کیا الفاظ ہیں' عزیزانِ من! اگر ایسا کرو گے تو کیا ہوگا؟ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ (20:81) ہمارا غضب تم پر نازل ہوجائے گا وَ مَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى (20:81) اور جس پر ہمارا غضب نازل ہوجائے' وہ قوم پست سے پست تر درجے کے اندر چلی جاتی ہے' پستیوں کی انتہا تک پہنچ جاتی ہے۔ تو یہ غضب کس وجہ سے نازل ہوا؟ کہ رزق کی فراوانی تو تھی لیکن تقسیم رزق میں توازن نہیں برقرار رکھا گیا تھا اور راستہ تو' ہم نے کہا' کہ دیکھا تھا۔ یہ صراطِ مستقیم سیدھا ہی نہیں' متوازن راستہ بھی ہے۔ راستے کا توازن اور نعماء کی تقسیم' اس انداز سے کی جائے کہ معاشرے کا توازن نہ بگڑنے پائے۔ اس کے اندر طبقات نہ ہونے پائیں' اس کے اندر اونچ نیچ نہ پیدا ہو۔ یہ عجیب الفاظ ہیں' اگر ایسا کرو گے تو ہمارا غضب تم پر نازل ہوجائے گا اور جن پر ہمارا غضب نازل ہوا کرتا ہے فَقَدْ هَوٰى (20:81) پھر وہ زندگی کی پست ترین سطح پر جا پہنچتے ہیں۔

''مغضوب علیہ'' کے بعد لفظ ''الضالین'' کا مفہوم قرآن حکیم کی روشنی میں

اب آگے بڑھیے۔ اتنا ہی نہیں کہ قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے تو یاد کرو' بلکہ یہ کہا کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ

عَلَيْهِمْ (60:13) اے جماعت مومنین! تم ان لوگوں کو اپنا دوست مت بناؤ جو غضبِ خداوندی کے معتوب ہیں۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ جب ایک عبدمومن اپنی اس آرزو کا اظہار کرتا ہے کہ میں کہیں ان لوگوں کے راستے پر گامزن نہ ہو جاؤں، جو مغضوب علیہ ہیں، تو اس سے اس کا مقصود کیا ہوتا ہے اور قرآنِ کریم کا اس باب میں منشا کیا ہے؟ اتنا ٹکڑا واضح ہو گیا۔ اب دو قسم کے لوگ تھے جن کے متعلق کہا گیا تھا کہ ہم ان کی روش کے اوپر نہیں چلنا چاہتے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم اپنی غلطی سے، سہو سے، التباس سے، ابہام سے، کہیں ان کے راستے کے اوپر گامزن ہو جائیں۔ ایک تو تھے غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ (1:7) اور دوسرے تھے وَ لَا الضَّآلِّيْنَ (1:7)۔ جس طرح قرآنِ کریم ''منعم علیہ'' کے مقابلے میں ''مغضوب علیہ'' لایا ہے، اسی طرح اس نے ہدایت کے مقابلے میں ''ضلالت'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ترجمہ تو اس ''ضلالت'' کے لفظ کا ہمارے ہاں عام طور پر ''گمراہ'' کرتے ہیں لیکن اس کے معنی اس سے کہیں زیادہ وسیع بھی ہیں اور عمیق بھی۔ اس کے معنی ہیں ''حیران و پریشان ہونا، سرگرداں پھرنا یا کسی چیز کا پوشیدہ اور غائب ہو جانا یا مختلف چیزوں کا اس طرح مل جانا کہ پھر انہیں الگ الگ نہ کیا جا سکے، جس طرح دودھ میں پانی مل جاتا ہے''۔ چونکہ صحرا میں راستہ کھو دینے والا اپنی تمام تگ و تاز کے باوجود منزل تک نہیں پہنچ سکتا اس لیے محنت اور کوشش کے ناکام رہ جانے اور رائیگاں چلے جانے کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے جیسے قرآن میں ضَلَّ سَعْيُهُمْ (18:104) آیا ہے کہ ان کی تمام کوششیں رائیگاں چلی گئیں۔ غلط راستے پر چلنے والا یا وہ کہ جس کو صحیح راستہ نہیں ملا، وہ اپنی پریشانی میں کبھی اس راستے کو صحیح سمجھتا ہے، کبھی اس راستے کو صحیح سمجھتا ہے، تو اس طرح ہر غلط راستہ اس کو دھوکا دے دیتا ہے۔ وہ غلط راستے کو بھی صحیح سمجھ لیتا ہے۔ اس طرح سے حیران اور پریشان ہونے والا، سراب کو پانی سمجھ لینے والا، عربوں کے ہاں سراب کو ''الـمُضّل'' کہا جاتا تھا، گمراہ کرنے والا نہیں، بلکہ اس طرح اپنے آپ کو دکھانے والا کہ جیسا حقیقت میں وہ نہیں ہے، اور اس لیے وہ یوں دیکھنے والا Confuse حیران ہو جاتا ہے، Confusion (ابہام، التباس) کے معنی میں یہ چیز آتی ہے۔ یعنی کسی معاملے کے اندر Confuse ہو جانا اور راستے کی تلاش میں سرگرداں پھرنا بڑی چیز یہ ہوتی ہے۔

نبی اکرمؐ کی سیرت کے سلسلہ میں مروجہ تراجم کے برعکس لفظ ''ضالاً'' کا پیش کردہ قرآنی مفہوم

مغضوب علیہ تو وہ ہیں جن کے سامنے راستے تو دونوں آ گئے تھے، صحیح بھی اور غلط بھی، اور انہوں نے غلط راستے کو چنا اور اس کے اوپر دانستہ چلے اور تباہ و برباد ہو گئے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں کہ جن کے سامنے راستہ ہوتا نہیں لیکن حقیقت کی تلاش کی تڑپ ان کے دل میں ہوتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح حقیقت مل جائے۔ یہ جو راستے کی تلاش میں اس طرح حیران اور سرگرداں پھرنا ہے، اسے بھی ''ضالاً'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (93:7)۔ عام طور پر اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے معاذ اللہ، کہ ہم نے تمہیں گمراہ پایا اور سیدھی راہ دکھائی۔ اس میں شبہ نہیں کہ نبی نبوت ملنے سے پیشتر اسی معاشرے کا ایک فرد ہوتا ہے لیکن اس میں ایک خصوصیت ہوتی ہے۔ اسے از خود خدا کی طرف سے ابھی وحی نہیں ملی ہوتی۔ وہ اس معاشرے میں ہوتے

ہوئے بھی ان میں کا نہیں ہوتا۔ وہ ان باتوں سے، جو معاشرے میں عام ہو رہی ہوتی ہیں، مطمئن نہیں ہوتا۔ لیکن جو چیز اطمینان دینے والی ہے، وہ اسے نظر نہیں آتی، وہ اسے ملتی بھی نہیں ہے۔ اب اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جو حاضر و موجود ہے، اس سے اطمینان نہیں، اور جو چیز باعث اطمینان ہے، وہ موجود نہیں، وہ سامنے نہیں، وہ ملتی بھی نہیں۔ اس کے قلب کی کیفیت اضطرابی ہوتی ہے کہ اس موجود سے عدمِ اطمینان ہے اور جو اطمینان بخش چیز ہے، اس کی تلاش میں وہ حیران اور سرگرداں ہے۔ عزیزانِ من! نبی کی یہ کیفیت باقی معاشرے سے مختلف ہوتی ہے۔ باقی معاشرہ ان غلط راستوں کے اوپر، جن پہ وہ چل رہا ہوتا ہے، مطمئن ہوتا ہے۔ وہ انہیں صحیح سمجھ کر، ان پر چل رہا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس نبی ان راستوں کو غلط سمجھتا ہے لیکن صحیح کونسا ہے، اس کا اسے علم نہیں ہوتا۔ یہ علم اسے وحی کے ذریعے ملتا ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کے متعلق جو کہا گیا کہ وَ وَجَدَکَ ضَآلًّا فَهَدٰی (93:7) ہم نے تجھے تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا، تیرے سینے میں حقیقت کی تلاش کی تڑپ تھی، ایک اضطراب تھا کہ تمہیں صحیح راستہ ملے، اس تڑپ اور تلاش کا نتیجہ تھا کہ ہم نے تمہیں صحیح راستہ دکھا دیا۔

صحیح منزل کے حصول کے لیے معاشرہ کی غلط روش سے بیزاری کا اظہار پہلی شرط ہے

عزیزانِ من! صحیح راستہ تک پہنچنے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ معاشرے میں جو غلط چیزیں موجود ہیں، اُن سے اسے عدمِ اطمینان ہو۔ جب ان سے عدمِ اطمینان ہوگا تو پھر آپ کے دل میں صحیح راستے کی تلاش کے لیے تڑپ پیدا ہوگی اور وہاں آپ کو ہدایت ملے گی اور اگر آپ اس پر مطمئن ہیں جو کچھ ہو رہا ہے تو اس کے بعد اس کا سوال ہی نہیں کہ آپ اسے چھوڑ کر کسی دوسرے راستے پر چلے چلیں۔ تقلید [1] میں ہوتا یہی ہے کہ جو کچھ معاشرے میں ہو رہا ہوتا ہے یا جو اسلاف سے چلا آ رہا ہوتا ہے، وہ اس سے مطمئن ہوتے ہیں، وہ اس پر غور و فکر ہی نہیں کرتے۔ غور و فکر وہ کرتا ہے جسے اس پر اطمیان نہ ہو جو کچھ ہو رہا ہے۔ ہمارے ہاں کا ایک بہت بڑا فلاسفر [2] ہے۔ ابھی حال ہی میں گزرا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اپنے دور کے مروّجہ معتقدات و نظریات کو علیٰ ہٰذہٖ تسلیم کر کے، ان پر جم کر بیٹھے رہنا، بت پرستی کہلاتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ خود عربوں کے ہاں بھی بت پرستی میں یہ مفہوم مضمر تھا۔ ان کی زبان میں بت کے لیے ''وثن'' [3] کا لفظ استعمال

---

[1] Society divinised

[2] Erich Fromm (1900-1980)

[3] وثن بالمکان وہ کسی جگہ قیام پذیر ہو گیا۔ الواثن مقیم اور جما ہوا، جو حرکت نہ کرے۔ اسی سے وثن بت کو کہتے ہیں جو حرکت نہیں کر سکتا۔ (تاج و راغب) اس کی جمع اوثان (29:17) ہے) تاج نیز صاحب کتاب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ وثن چھوٹے صنم (بت) کو کہتے ہیں۔ اس بنیادی مفہوم کی رو سے ہر وہ تصور یا نظام جس میں حرکت نہ رہے اور جامد ہو جائے وثن ہے۔ ذہنی جمود کہ جسے تقلید کہتے ہیں، بدترین قسم کا وثن ہے۔ جس کی پرستش ہر مردہ قوم میں ہوتی رہتی ہے......اگر نظام کسی ایک مقام پر رک جائے، اس میں جمود پیدا ہو جائے، تو یہ ''وثنیت'' ہوگی۔ یہ وہ وثن (بت) ہے جس کی پرستش وہ قومیں کرتی ہیں جن میں ذہنی جمود اور عملی تعطل چھا چکا ہو۔ (لغات القرآن، جلد چہارم از پرویزؒ۔ ص 1685)

ہوتا تھا اور ''وثن'' کے معنی ہیں ''غیر متحرک اور جامد''۔ اسی کو تقلید یا جمود کہا جاتا ہے۔ اس روش کا پیرو کار کبھی صحیح راستہ اختیار نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ وہ جس راستے پر ہے' اسے وہ صحیح سمجھتا ہے' اس کو پرکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا اور اسی پہ وہ چلا جاتا ہے۔ یہ جو تقلید ہے [1] وہ انسان کو کبھی صحیح راستے کی طرف آنے ہی نہیں دیتی۔ اس میں پہلی چیز تو یہ ہوتی ہے کہ اس سے انسان سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کھو بیٹھتا ہے اور یہی ہیں وہ لوگ جن کے متعلق کہا کہ ان کی روش بتا رہی ہوتی ہے کہ وہ جہنمی ہیں۔

تقلید پرستی کا دوسرا نام جہنم ہے

قرآنِ کریم میں ہے کہ وَ لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ (7:179) تم شہری آبادیوں اور صحرانوردوں میں اکثریت ان لوگوں کی دیکھو گے جن کی روش بتا رہی ہوتی ہے کہ یہ اہلِ جہنم ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان کی وہ کون سی روش ہے' جو یہ بتا رہی ہوتی ہے؟ اس کے لیے کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا (7:179) سینے میں دل تو رکھتے ہیں لیکن ان سے سمجھنے' سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا (7:179) ماتھے میں آنکھیں بھی رکھتے ہیں' ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا (7:179) کان بھی ان کے ہوتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ (7:179) یہ لوگ انسان نہیں' یہ حیوان ہوتے ہیں۔ پھر کہا کہ نہیں' حیوان بھی نہیں بَلْ هُمْ اَضَلُّ (7:179) حیوانوں سے بھی زیادہ گئے گزرے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (7:179) اس لیے کہ یہ غفلت برتتے ہیں۔ ان کے دل میں کوئی تڑپ پیدا نہیں ہوتی' حقیقت تک پہنچنے کے لیے کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو اس کے دل میں پیدا ہوگا جو سمجھ' سوچ' سماعت' بصارت' قلب سے کام لے گا۔ یہ وہ ہے جو غفلت کے پردے پھاڑ کر حقیقت کی تلاش میں نکلے گا' اور جو اس طرح تلاش میں نکلے گا' یاد رکھیے! پھر وہ ہے جو صحیح راستے پہ جائے گا' ورنہ جو اس قسم کے لوگ ہیں ان کے متعلق نبی اکرم ﷺ کو کہا گیا کہ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى (27:80) جو مردے ہیں' تم انہیں نہیں سنا سکتے ہو۔ وَ لَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ (27:80) بہرے کو کیا سنا سکتے ہو۔ بہرہ بھی کچھ اشاروں سے سمجھ سکتا ہے' کوئی تھوڑی بہت توجہ دے گا تو کچھ نہ کچھ پلے پڑ جائے گا۔ وہ بات کرنا چاہیں تو بہرہ منہ موڑ کے چل دے' وہ بہرہ کیا سن سکے گا؟ وَ مَآ اَنْتَ بِهٰدِی الْعُمْیِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ (27:81) یہ جو ان کی ضلالت ہے' اس سے اندھوں کو نہیں نکال سکتے۔

عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کو قرآنِ کریم نے اصولی طور پر دو شقوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ جو زندگی کے دوراہے پر پہنچ کر' نہ یہ دیکھنے کی ضرورت محسوس کریں کہ انہیں کس راستہ کی طرف مڑنا چاہیے' نہ کسی سے ایسا پوچھنے کی حاجت ہو۔ جس راستہ پر ہجوم چلا جا رہا ہو' وہ بلا سوچے سمجھے انہی کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ اس کی سند ان کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ یہ وہ راستہ ہے جسے ہمارے اسلاف نے اختیار کیا ہے اور وہ ہم تک متواتر چلا آ رہا ہے۔ یعنی پچھلی بھیڑ سے پوچھیے کہ تم اس راستے پہ کیوں جا رہی ہو تو اس کا جواب یہ ہوتا ہے کہ اگلی بھیڑ جو اس

راستے پر جا رہی ہے، میں اس کے پیچھے ہوں۔ ہمارے ہاں محاورے میں بھیڑ چال کہتے ہیں۔ بھیڑوں کو دیکھ کر تو ہم اس قدر متنفر ہوتے ہیں، کبھی نہیں سوچتے کہ پوری کی پوری قوم صدیوں سے بھیڑ چال پہ چلی ہوئی ہے۔قرآنِ کریم ان کے متعلق کہتا ہے کہ جب وہ اس راستے پر چلتے چلتے جہنم میں جا پہنچیں گے اور ان سے پوچھا جائے گا کہ تم نے یہ راستہ کیوں اختیار کیا تھا تو وَ قَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ کُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِیْلَا (33:67) وہ کہیں گے کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں ہمارے ان بڑے بڑے بزرگوں، مذہبی راہنماؤں، اور لیڈروں نے گمراہ کیا اور ہمیں صحیح راستہ سے بھٹکا دیا۔پہلی قسم تو ان کی ہے۔دوسری قسم ان لوگوں کی ہوتی ہے جو صحیح راستہ کو جانتے تو ہیں لیکن ان کی مفاد پرستیاں انہیں اس راستہ پر آنے نہیں دیتیں۔وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر اندھے ہو جاتے ہیں اور ان کی عقل وفکر اور علم وبصیرت ان کے کسی کام نہیں آتی جیسے اچھا بھلا، دانا وبینا، عقل مند، ہوشیار و دانشور جب شراب کے نشے میں مخمور ہو جاتا ہے تو اس کی ساری کی ساری عقل وفکر مفقود ہو جاتی ہے۔اس میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں تو ہوتی ہیں، سمجھ سوچ بھی سکتا ہے، جانتا بھی ہے لیکن نشے میں مغلوب ہو جاتا ہے۔یہ جو نشہ ہے اسے قرآن نے جذبات کہہ کر پکارا ہے، وہ جذبات جو وحی کی رہنمائی میں کام نہیں کرتے بلکہ اس کے خلاف اپنی مفاد پرستی کے تابع چلتے ہیں، یعنی جذبات کے نشے میں مخمور۔قرآن کہتا ہے کہ یہ بھی عقل وفکر کو کھو بیٹھتا ہے: اَفَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا ہے، جس نے خود اپنے جذبات ہی کی پرستش اور محکومیت اختیار کر لی، اپنے جذبات کو اپنا الٰہ بنا لیا؟ یعنی اس کے تابع چلنے لگ گیا اپنے جذبات سے مغلوب ہو گیا، اس طرح وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ (45:23) خدا کے قانون کے مطابق، یہ شخص اس علم کے باوجود، جاننے بوجھنے کے باوجود صحیح راستہ کھو کر، غلط راستے پہ چل پڑا، اس کے اندر صحیح اور غلط کا امتیاز باقی نہ رہا وَّ خَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً (45:23) اور جیسا کہ نشے میں مدہوش انسان سے ہوتا ہے، نہ اس کی آنکھ صحیح دیکھتی ہے، نہ کان صحیح بات سنتا ہے، نہ دماغ صحیح سوچتا ہے، ان تمام پہ مہریں لگی ہوئی ہوتی ہیں۔کہا کہ فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ (45:23) جو اس طرح عقل وفکر کھو بیٹھے، کہیے کہ خدا کے قانون کے علی الرغم وہ کون ہے جو انہیں صحیح راستہ دکھا سکے؟ انسان کے پاس سب سے بڑی قوت عقل ہی کی ہے لیکن جب اس پر جذبات غالب آ جاتے ہیں تو عقل خود ان جذبات کی لونڈی بن جاتی ہے اور ان کے بروئے کار آنے کے لیے سامان و ذرائع بہم پہنچاتی، ان کے جواز کے لیے فریب آمیز دلیلیں وضع کرتی ہے۔ان حالات میں کوئی ایسی قوت ہی اس کی راہ نمائی کر سکتی ہے جو عقل اور اس کے سطحی جذبات سے بلند ہو اور یہ قوت، وحی خداوندی کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتی۔اس لیے کہا کہ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (45:23) کیا لوگ اس بات کو سوچتے نہیں کہ ضلالت کا یہ پہلو کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ایک وہ ہیں، جو جانتے نہیں ہیں، بھیڑ چال کی طرح چلے جاتے ہیں۔ایک یہ ہیں جو جانتے بوجھتے ہوئے، اپنی عقل کھو دیتے ہیں کیونکہ جذبات پرستی کے تابع وہ مدہوشی کے عالم میں ہوتے ہیں، جو چلے جا رہے ہوتے ہیں۔انہیں کون صحیح راستے پہ لا

سکتا ہے؟

میں پھر دہرا دوں۔ یہ بات پہلے بھی آ چکی ہے کہ انسانی جذبات ایسے نہیں ہیں جو قابل نفرت ہوں اور یہ کہ قرآن نے ان کی بڑی مذمت کی ہے۔نہیں، قطعاً نہیں۔جذبات تو بڑی قوت ہیں۔ انسان کے اندر قوتِ عمل تو جذبات ہی ہوتے ہیں۔یہ انسان کے عمل کے محرک ہوتے ہیں۔ جو جذبات، خدا کی اقدار سے سرکش ہو کر، سیلاب کی شکل اختیار کر لیں، اور انسان کی عقل وفکر پر غالب آ جائیں، تو یہ وہ جذبات ہیں جو قابلِ نفرت ہیں ورنہ جو دوسرے جذبات ہیں، ان کے لیے یہ نہیں کہا۔وحی خداوندی سے سرکش جذبات ان کے متعلق قرآن نے کہا کہ وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ [1] (28:50)۔یہ لوگ جن میں علم وعقل رکھنے کے باوجود صحیح راستے کی، صحیح اور غلط کی، تمیز اٹھ جاتی ہے، وہ کنفیوز ہوئے پھرتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں، جو وحی کی روشنی کے بغیر اپنے جذبات سے کام لیتے ہیں۔دیکھا! اب قرآنِ کریم نے کس طرح دونوں میں تمیز کر کے رکھ دی۔

انسانیت کے لیے موجودہ جمہوریت کا تصور ایک خطرناک مرض ہے

اب آگے چلیے۔ہمارے زمانے میں گمراہی کی ایک اور شکل بھی ہے جو اس وقت ساری دنیا میں عام ہو رہی ہے اور اسے عصرِ حاضر کا بہت بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔یہ وہ روش ہے جسے ڈیموکریسی یا جمہوریت کہہ کر پکارا جاتا ہے اور جس کی بنیاد اس نظریئے پر ہے کہ جو بات اکیاون فیصد کہہ دیں وہ صحیح ہوتی ہے۔آپ سوچیے کہ یہ معیار کیا ہے یعنی اگر اس پارٹی کے دو ووٹ کم ہو گئے، یہ انچاس میں رہ گئی، تو یہ کتنی ہی صحیح بات کیوں نہ کہے یہ غلط ہے اور اگر کسی طرح انہوں نے دو ووٹ اپنے ساتھ ملا لیے تو کتنی ہی غلط بات کیوں نہ کہے وہ صحیح ہے۔قرآنِ کریم کہتا ہے کہ یہ تو صحیح اور غلط کا کوئی معیار نہیں ہے۔یہ تو گمراہی کی بدترین شکل ہے۔مثلاً 1961ء کے فیصلے کو قانون صحیح قرار دیتا ہے، قوم صحیح قرار دیتی ہے۔اسے دنیا کہتی ہے کہ ڈیموکریسی کے تحت فیصلہ ہو رہا ہے تب جمہوریت کے نظام کے تابع یہ فیصلہ ہو رہا ہے، کوئی اس کو چیلنج نہیں کرتا، کوئی اس کو برا نہیں سمجھتا۔کہا کہ سوچیے تو سہی، جو اکیاون فی صد کا فیصلہ لے کر اس راستے پر چلیں، محض اس سند کے ساتھ کہ 51 فی صد نے اس کے حق میں ووٹ دیا ہے، اس قسم کے گمراہ کو، راستہ کھو دینے والے کو، صحیح راستے پہ کون لائے گا؟ کہا کہ وَ اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ (6:116) اگر تو انسانوں کی اکثریت کا اتباع کرے گا تو وہ تجھے خدا کی طرف لے جانے والے راستے سے گمراہ کر دیں گے۔یہ لوگ ظن وتخمین کا اتباع کرتے ہیں اور قیاسات پر چلتے رہتے ہیں۔حق کا کوئی خارجی معیار ان کے پاس نہیں ہوتا۔ان کے برعکس اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ یَّضِلُّ عَنْ سَبِیْلِهٖ ۚ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ (6:117) غلط اور صحیح، حق اور باطل، کا معیار صرف خدا کی رہنمائی ہے۔یہی وہ راہنمائی

---

[1] جو شخص، خدا کی رہنمائی کو چھوڑ کر اپنے جذبات کے پیچھے لگ جاتا ہے، اس سے زیادہ راہ گم کردہ اور کون ہو سکتا ہے؟ (مفہوم القرآن از پرویزؒ ص896)

ہے جس کے متعلق نوع انسان سے کہا گیا تھا کہ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَ لَا یَشْقٰی (20:123) جو میری راہنمائی کا اتباع کرے گا تو نہ وہ صحیح راستہ سے بھٹکے گا اور نہ ہی جگر پاش مشقتوں میں مبتلا ہو کر سعادتوں سے محروم رہ جائے گا۔

مذہبی پیشوائیت دین اللہ کے اندر خود ساختہ مذہب کو ملا کر فروخت کرتی ہے

عزیزانِ من! میں نے شروع میں بتایا تھا کہ جو ضلال یا ضلالت کا مادہ ہے' اس کے ایک معنی یہ بھی ہوتے ہیں کہ دو چیزوں کا اس طرح آپس میں مل جانا کہ انہیں الگ الگ کرنا ممکن نہ رہے' جس طرح دودھ میں پانی مل جاتا ہے تو وہ نظر دودھ ہی آتا ہے' پانی اس کے اندر گم ہو جاتا ہے اور اس کے بعد آپ دودھ اور پانی کو الگ نہیں کر سکتے' اسے دودھ ہی کہا جاتا ہے۔ یہ ضلالت کون سی ہے؟ جیسا کہ میں پہلے درسوں میں بتا چکا ہوں جب حضرات انبیائے کرام □ کا پہنچایا ہوا دین خداوندی مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس میں تلبیس حق و باطل کی یہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہو جاتے ہیں کہ ان کا الگ الگ کرنا تو ایک طرف' ان کی شناخت بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ پھر جس طرح ایک گوالا پانی ملے ہوئے دودھ کو خالص دودھ کہہ کر بیچتا ہے' مذہبی کاروبار کرنے والے مذہبی' خود ساختہ متاعِ کاشت کو' دین کا زرِ خالص بتا کر بیچتے ہیں اور اس کی بڑی بڑی قیمتیں وصول کرتے ہیں۔ یہی ہیں جن کے متعلق کہا گیا کہ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِیْثِ لِیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ ۖ وَّ یَتَّخِذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِکَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ (31:6) یہ لوگ اپنے وضع کردہ افسانوں اور خواب آور داستانوں سے لوگوں کو مبتلائے فریب رکھتے ہیں تا کہ انہیں خدا کے راستے سے گمراہ کیے رکھیں۔ یہ ہوتے تو ہیں جاہل لیکن اپنے آپ کو بہت بڑے عالم کہہ کر لوگوں کے مقتدا[1] بن جاتے ہیں۔ وہ یہ سب کچھ روٹی کی خاطر کرتے ہیں' اور اس خود ساختہ مذہب کو دین کا لباس اوڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ وہ بڑا مضحکہ انگیز ہوتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا اسے ہی حقیقی دین سمجھ لیتی ہے۔ چونکہ دنیا اسے دین خداوندی سمجھتی ہے' اس لیے جو روش حقیقی دین کے متعلق ہوتی ہے' دنیا وہی روش اس خود ساختہ مذہب کے متعلق اختیار کر لیتی ہے۔ کہا کہ جو قوم دین کے ساتھ اس قسم کا کھیل کھیلے' وہ بڑے ہی ذلت آمیز عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ آپ اقوامِ عالم پر پھیلتی ہوئی نگاہ ڈالیے۔ آپ دیکھیں گے کہ جس قدر کوئی قوم مذہب میں ڈوبی ہوئی ہو گی' اسی قدر جاہل اور پسماندہ ہو گی۔ یہی خدا کا عذاب ہے۔ مذہب توہم پرستیوں کا مجموعہ ہوتا ہے اور توہم پرستی کا لازمی نتیجہ نکبت و افلاس ہوتا ہے۔ یہ ضلالت کی پست ترین اور بدترین شکل ہوتی ہے۔

مذہب کے اندر امیری اور غریبی خدا کے ہاتھ ہوتی ہے

ہم نے' عزیزانِ من! غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ (1:7) کے درس کے سلسلے میں آخری نکتہ یہ پیش کیا تھا کہ جو قوم رزق کی غیر

---

[1] وہ شخص جس کی لوگ پیروی کریں' پیشوا' رہ نما

متوازن تقسیم کرتی ہے' اس پر خدا کا غضب نازل ہوتا ہے اور وہ اسے خوف اور بھوک کے عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ آپ دیکھیے کہ قرآنِ کریم نے اسی معاشی نکتے کو لیا کیونکہ اس میں ضلالت کا پہلو آتا ہے۔ معاشی گوشے میں ضلالت کا پہلو ہے' غضب کا پہلو ہے۔ یہاں ضلالت کا ایک اور پہلو آتا ہے۔ آپ کسی سے بھی وعظ سنیئے' ناصح سے نصیحت سنیئے' جس شخص سے بھی یہ بات کیجیے' کسی سرمایہ دار سے ہی گفتگو کیجیے' وہ نہایت مقدس الفاظ میں یہ کہے گا کہ بابا! رزق کی تقسیم خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہوئی ہے' وہ جسے چاہے امیر بنا دے، جسے چاہے غریب کر دے' اس میں کسی انسان کا کوئی دخل ہی نہیں ہے۔ یہ کوشش کرنا بھی کہ کوئی غریب امیر ہو جائے گویا خدا کو چیلنج کرنا ہے' وہ اسے غریب رکھنا چاہتا ہے' تم اس کے علی الرغم کہتے ہو کہ نہیں' ہم اسے دولت مند بنا دینا چاہتے ہیں۔ معاذ اللہ وہ کہتے ہیں کہ یہ خدا کے خلاف اتنا بڑا چیلنج ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ آپ اسی نقشے کو دیکھیے کہ لوگوں کو گمراہی میں رکھنے والے کیا تکنیک اختیار کرتے ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وَاِذَا قِيْـلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّارَزَقَكُمُ اللّٰهُ (36:47) جن لوگوں کے پاس ضرورت سے زیادہ رزق ہوتا ہے' جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس فاضلہ رزق کو ان لوگوں کے لیے کھلا رکھو' جنہیں اس کی احتیاج ہے تو وہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ تم ہمیں کس قدر غلط راستہ اختیار کرنے کی تلقین کر رہے ہو۔ **قال الذین کفروا للذین امنوا انطعم من لو یشاء الله اطعمه** (36:47) تو یہ لوگ اس قسم کی نصیحت کرنے والوں سے' اس قسم کا مطالبہ یا تقاضا کرنے والوں سے' کہتے ہیں کہ تم کیا کہہ رہے ہو' کیا تم چاہتے ہو کہ ہم ان کی روٹی کا انتظام کریں' جنہیں خدا بھوکا رکھنا چاہتا ہے' انہیں امیر بنانے کی کوشش کریں' جنہیں خدا غریب رکھنا چاہتا ہے' تم ہمیں خدا سے لڑانا چاہتے ہو، اس کے خلاف آمادۂ جنگ کرنا چاہتے ہو۔

رزق کی تقسیم کا فریضہ اسلامی مملکت کے ذمہ ہوتا ہے

خدا کی طرف سے ان کے اس اعتراف کا جواب یہ ملتا ہے کہ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (36:47) ان سے کہو کہ تم اس قدر کھلی ہوئی گمراہی یا فریب دہی میں مبتلا ہو۔ خدا کسی کو یوں رزق نہیں دیا کرتا۔ یہ رزق کی تقسیم اسلامی نظام کے ہاتھوں سے ہوتی ہے اور وہ نظام جس میں اس قسم کی طبقاتی تفریق نہیں رہتی' خدا کی رہنمائی کے مطابق متشکل ہوتا ہے۔ یہ ''منعم علیہ'' لوگوں کی راہ ہے۔ اور یہ جو تم کہتے ہو' یہ تم اپنی مفاد پرستانہ سرمایہ داری کا تحفظ کرتے ہو اور اس کو خدا کی مرضی کے اس مقدس نقاب میں چھپاتے ہو۔ آپ نے دیکھا کہ کس طرح یہ دودھ اور پانی ایک دوسرے کے ساتھ مل گیا ہے۔ نظر بہ ظاہر یہ دلیل بڑی ہی قوی اور بڑی ہی مقدس نظر آتی ہے کہ خدا کی مشیت یہ ہے' کہ یہ لوگ اس حالت میں رہیں' خدا انہیں اس حالت میں نہ رکھنا چاہتا تو دنیا کی کون سی طاقت تھی جو انہیں مجبور کر کے اس حالت میں رکھ سکتی تھی۔ خدا کے حکم کے بغیر تو پتہ بھی نہیں ہل سکتا لہٰذا جس حالت میں جو جہاں ہیں وہ سب خدا کی مشیت کے مطابق ہے۔ آپ نے دیکھا' عزیزانِ من! یہ جو دودھ میں ملا ہوا پانی ہے یہ کس قسم کی ضلالت ہے۔ بہرحال ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم

نے جب جماعت مومنین کو یہ دعا سکھائی تھی کہ ہم ان لوگوں کے راستے پر نہ چلیں جو ''ضالین'' ہیں تو اس سے کیا مقصود تھا۔ اسی بنا پر اس نے تاکید کی کہ وَ لَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ (5:77) تم ان لوگوں کے جذبات کا اتباع مت کرنا جو اس سے پہلے خود بھی گمراہ ہو گئے اور انہوں نے دوسروں کو بھی گمراہ کیا اور اس طرح یہ تابع اور متبوع، خود چلنے والے اور ان کے پیچھے جانے والے، دونوں خدا کی طرف لے جانے والے سیدھے اور متوازن راستہ سے بھٹک گئے۔

''مغضوب علیہ'' اور ''ضالین'' کوئی خاص قوم نہیں ہوتی

آخر میں، میں ایک چیز اور بھی واضح کرنا چاہتا ہوں۔ آپ قرآنِ کریم کے ترجمے یا تفسیر میں دیکھیں گے کہ وہاں لکھا ہوا ہوتا ہے کہ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ (1:7) میں مغضوب علیهم سے مراد یہودی ہیں اور ''ضالین'' سے مراد عیسائی ہیں۔ یعنی ان سے مراد ہم نہیں ہیں۔ اپنے متعلق تو ہم خود فریبی میں مبتلا ہیں کہ ہم ''منعم علیہ'' ہیں تو غیر المغضوب علیہم میں، مغضوب علیہ یہودی ہیں ضالین عیسائی ہیں۔ عزیزانِ من! ''مغضوب علیہ اور ضالین'' سے کوئی خاص قوم مراد نہیں ہے۔ اس کا اطلاق تو ان تمام قوموں پر ہوگا جو غلط راستوں پر چلنے کی وجہ سے نعمائے خداوندی سے محروم ہوں گی اور اس طرح تباہی اور بربادی کے جہنم میں جا گریں گی، خواہ وہ زمانۂ نزولِ قرآن سے پہلے کی قومیں تھیں، خواہ خود اس زمانے کی قومیں ہوں، اور خواہ قیامت تک آنے والی قومیں ہوں۔ اور پھر آگے یہ بات کہ خواہ اس قوم نے اپنا نام کچھ بھی کیوں نہ رکھ دیا ہو، بات تو ان خصوصیات کی ہے، جو قرآن نے بیان کی ہیں۔ جس قوم میں وہ خصوصیات ہوں گی، وہ مغضوب علیہ ہو گی، اس کا شمار ضالین کے زمرے میں ہوگا۔ یہی نہیں کہ ہم مغضوب علیہ یہودیوں کو کہتے ہیں اور ضالین عیسائیوں کو اور سمجھتے ہیں کہ ہمارا شمار ان میں نہیں ہوتا۔

آج ہم مسلمانوں نے قرآن حکیم کی منزہ اور مشہود تعلیم کو مختلف فرقوں میں بانٹ رکھا ہے

ہم نے تو پورے کے پورے قرآن کو اسی طرح مختلف فرقوں میں بانٹ رکھا ہے۔ جہاں جہاں تباہیوں اور بربادیوں کا ذکر آتا ہے، ہم یہ کہہ کر خود فریبی میں مبتلا ہو جاتے اور مبتلا رہتے ہیں کہ یہ یہود کے متعلق تھا، یہ نصاریٰ کے متعلق تھا، یہ مشرکین مکہ کے متعلق تھا، یہ کفارِ عرب وغیرہ کے متعلق ہے۔ یہ سب جہنمی ہیں اور جنت صرف ہمارے لیے تیار کی گئی ہے لیکن خود فریبی سے حقیقتیں تو بدل نہیں جایا کرتیں۔ ہم اس خود فریبی سے اسی صورت میں نکل سکتے ہیں کہ ہم خدا کی کتاب کو معیار قرار دے کر یہ دیکھیں، سمجھیں اور پرکھیں کہ ہمارا شمار منعم علیہ کے زمرے میں ہوتا ہے یا مغضوب علیہ اور ضالین کے گروہ میں۔ اس معیار پر اپنے آپ کو، اپنی قوم کو، پرکھنے سے جو نتیجہ سامنے آتا ہے، اس سے تو روح میں کپکپی پیدا ہو جاتی ہے۔ عزیزانِ من! یہاں پر سورۃ الفاتحۃ کی آخری آیت کا درس اب ختم ہوتا ہے۔

خلاصہ سورۃ الفاتحۃ

عزیزانِ من! میں چاہتا ہوں، کچھ تھوڑا سا وقت بھی ہمارے پاس ہے، کہ میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور اس سورۃ الفاتحۃ کی ساتوں آیات کا خلاصہ آپ کے سامنے پیش کر دوں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہر کتاب کے شروع میں مقدمہ یا پیش لفظ لکھ دیا جاتا ہے۔ اس سے اس کتاب کے موضوع یا مندرجات کا تعارف کرانا مقصود ہوتا ہے۔ موزوں ترین مقدمہ یا پیش لفظ اسے سمجھا جاتا ہے جو نہایت مختصر لیکن جامع الفاظ میں اس حقیقت کو سامنے لے آئے، جو اس کتاب کا مقصود و مطلوب ہے۔ سورۃ الفاتحۃ کو فاتحۃ الکتاب کہا جاتا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ سورۃ الکتاب یعنی قرآن کریم کا یوں سمجھیے گویا پیش لفظ یا تعارف ہے۔ اسے دیکھیے تو یہ سات آیات پر مشتمل سورت ہے اور آیات بھی ایسی مختصر کہ دو دو چار چار الفاظ پر مشتمل ہیں۔ لیکن ان کی جامعیت کا یہ عالم ہے کہ قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم اور دین کے نظام کا ملخص اس کے اندر یوں سمٹ کر آ گیا ہے جیسے آنکھ کے تل میں آسمان۔ یہ قرآنِ کریم کے ایجاز اور اعجاز کی نمایاں شہادت ہے۔

سورۃ الفاتحۃ کے شروع میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے الفاظ سامنے آتے ہیں۔ اگر انہیں خدا کی طرف منسوب کیا جائے یعنی اس میں متکلم خود خدائے تعالیٰ سمجھا جائے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ ''اس کتاب کو اس لیے نازل کیا گیا ہے کہ نوعِ انسان کی نشو و نما کی جو ذمے داری خدا نے اپنے اوپر لے رکھی تھی، وہ پوری ہو جائے (6:12;6:54)۔ یہ نشو و نما وحی کی راہنمائی کے بغیر ممکن نہیں۔ (10:57;58;17;82)''۔ اور اگر اسے انسانوں کی طرف منسوب کیا جائے یعنی یہ سمجھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو یہ تعلیم دی ہے اور کہا ہے کہ تم ایسا کرو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ''ہر عبدِ مومن اس کا اعتراف اور اعلان کرتا ہے کہ میں جس پروگرام کو ہاتھ میں لے رہا ہوں، اس سے مقصد یہ ہے کہ خدا کی صفتِ رحمانیت اور رحیمیت کی نمود عام ہو جائے''۔

اس کے بعد سورۃ الفاتحۃ ہمارے سامنے آتی ہے۔ میں اس کے ملخص کے لیے مناسب الفاظ اور بیان کی فکر میں تھا کہ میں نے دیکھا کہ اس کا جو مطلب میں نے ''مفہوم القرآن'' میں بیان کر دیا ہے وہ اس کا موزوں ترین خلاصہ ہے۔ اس لیے میں اسی کو یہاں پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں اور وہ یہ ہے:

آیات 1 اور 2

''جب انسان اس کارگہِ کائنات کے نظم و نسق پر غور کرتا ہے تو اس کے سامنے یہ حقیقت بے نقاب ہو کر آ جاتی ہے کہ اس میں، ہر شے کو وہ سامانِ نشو و نما کس طرح بلا مزد و معاوضہ ملتا چلا جاتا ہے، جس سے وہ اپنے نکتۂ آغاز سے مقامِ تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔ عام حالات میں تدریجاً اور عندالضرورت ہنگامی عملِ ارتقا Emergent Evolution (فجائی ارتقا) کے ذریعے۔ اس حیرت انگیز نظامِ ربوبیت کو دیکھ کر، ہر صاحبِ بصیرت کی زبان پر بے اختیار کلماتِ تحسین و آفرین آ جاتے ہیں، اور وہ بلا ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ: اے ہمارے نشو و نما

دینے والے! تو نے اس کائنات کی کسی شے کو نہ بے کار پیدا کیا اور نہ ہی تخریبی نتائج کے لیے (3:189-190)۔ یہی وہ اربابِ علم وایقان ہیں جو صحیح معنوں میں خدا کی حمد کرنے والے ہیں (9:112;35:27-28)''۔

یہ ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (1:1) الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (1:2)۔ اور آگے یہ ہے کہ ''خدا کے اس پروگرام کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ جو مستبد قوتیں دوسروں کی نشوونما کی راہ میں حائل ہوں' انہیں راستے سے ہٹا دیا جائے۔ یہ حمدیت کا قدم اول ہے (6:45)۔

آیت 3

''ان مستبد قوتوں کو راستے سے ہٹانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک ایسا نظام قائم ہو جائے گا جس میں نہ کوئی انسان' دوسرے انسان کا محتاج ہوگا نہ محکوم۔ اس میں تمام امور کے فیصلے خدا کے قوانین کے مطابق ہوں گے (7:11:43:84:82:18:19)۔ یہی وہ نظام ہے جسے آخرالامر' انسانوں کے تمام خودساختہ نظام ہائے حیات پر غالب آ کر رہنا ہے۔ (9:33)۔

آیت 4

''یہ نظام ان افراد کے ہاتھوں متشکل ہوگا جو اس حقیقتِ کبریٰ کا اعلان اور عملاً اس اعلان کی تصدیق کریں گے کہ ہم خدا کے سوا کسی کی اطاعت اور محکومیت اختیار نہیں کرتے اور نہ ہی کسی غیر خدائی نظام سے خواست گارِ معاونت ہوتے ہیں (3:78;12:40)۔ اس کا عملی طریق اس کتابِ عظیم (قرآن مجید) کے احکام واصول کی اطاعت ہے (15:44-48) اور یہی خدا کی عبدیت اور عبادت ہے۔

آیت 5

''یہ افراد (جماعت مومنین) جب سفرِ حیات کے لیے قدم اٹھاتے ہیں' تو یہ حسین تمنائیں اور مقدس آرزوئیں دعا بن کر ان کے لبوں تک آ جاتی ہیں کہ: بارِالٰہا! زندگی کا وہ سیدھا اور ہموار ومتوازن راستہ اُبھر اور نکھر کر ہمارے سامنے آ جائے جو ہمیں' بلاخوف وخطر ہماری منزلِ مقصود تک لے جائے۔

آیت 6

''یعنی وہ راستہ جس پر چل کر' سعادت مند امم سابقہ' زندگی کی خوشگواریوں اور سرفرازیوں سے بہرہ یاب ہوئیں۔ اس سے انہوں نے' کائنات کی قوتوں کو مسخر کر کے' اپنی ہم عصر اقوام میں امتیازی حیثیت حاصل کر لی (2:47;81:20)۔

آیت 7

''جب تک یہ قومیں، تیرے متعین کردہ راستے پر چلتی رہیں، زندگی کی شادابیوں سے بہرہ یاب رہیں، جب ان کے نظریہ حیات میں تبدیلی آ گئی تو یہ نعمتیں ان سے چھن گئیں اور دنیا میں ذلیل وخوار ہوگئیں (2:61;7:152)۔ ان کی سعی وعمل کی کھیتیاں جھلس کر راکھ کا ڈھیر بن گئیں۔ اور چونکہ صحیح راستہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا، اس لیے ان کا کاروانِ حیات اپنی قیاس آرائیوں کے پیچ وخم میں کھو کر رہ گیا۔ وہ کبھی آنکھیں بند کر کے، اپنے آباؤ اجداد کی فرسودہ راہوں پر چلتے رہے (37:69:71) اور کبھی انہوں نے خود اپنے جذبات ہی کو اپنا راہنما بنالیا (45:23)۔ جب اس سفر بے منزل کی بھول بھلیوں میں کھوکر مایوس ہوگئے تو یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیا کہ خدا کو منظور ہی نہ تھا کہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا تا (6:149)۔'' بارِالٰہا! ہم تجھ سے تیرے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کی توفیق طلب کرتے ہیں تا کہ ہمارا حشر بھی ان سوختہ سامانوں کا سا نہ ہو جائے، کہ ہم جانتے ہیں کہ جو قوم تیری راہنمائی سے منہ موڑ لے، اسے کوئی صحیح راستہ نہیں دکھا سکتا (61:5)۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ راستہ انہی کے سامنے آ سکتا ہے جو اس کی تلاش کے لیے جدوجہد کریں (29:69)۔ ہم تجھ سے اس جدوجہد کی بھی توفیق طلب کرتے ہیں۔''

یہ ہے برادرانِ عزیز! ''مفہوم القرآن'' میں دیئے ہوئے سورۃ الفاتحۃ کا خلاصہ تھا جو میں نے آپ کے سامنے پیش کیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ آج اٹھائیس اکتوبر 1979 کو میں سورۃ الفاتحۃ کے ان متعارفی دروس کے 9 درسوں سے بحمدہٖ تعالیٰ فارغ ہوا ہوں اور انہیں ٹیپس میں محفوظ کر دیا ہے تا کہ آپ سامعین کے لیے بھی یہ فائدے کا موجب ہو اور اس کے بعد آنے والی نسلیں بھی اس محفوظ سرمایہ سے استفادہ کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ میری اس سعی کو مشکور فرمائے اور آپ کی قرآن کے ساتھ وابستگی کے جذبے میں برکت عطا فرمائے۔ والسلام علیکم

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

